زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ


# ثالث


جلد-۲ شمارہ -۸



**مدیر اعزازی**
اقبال حسن آزاد

**مدیر**
ثالث آفاق صالح

**نائب مدیران:** طیب رضا، اعجاز رحمانی



**رابطہ:** : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر-۸۱۱۲۰۱
Mob.+91 9430667003
email.eqbalhasan35@yahoo.com
www.salismagazine.in



● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔



● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔




| | | |
|---|---|---|
| قیمت۔فی شمارہ | : | ............۱۲۵روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۵۰/روپے) |
| سالانہ | : | ............۵۰۰روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۶۰۰/روپے) |
| خصوصی تعاون | : | ............پندرہ ہزار روپے یا ۳۰۰/امریکی ڈالر |

## 'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کررہے ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| امریکہ | : | ساٹھ (۶۰) امریکی ڈالر |
| کناڈا | : | ستر (۷۰) کناڈا ڈالر |
| آسٹریلیا | : | چالیس (۴۰) امریکی ڈالر |
| برطانیہ | : | چالیس (۴۰) برطانوی پاؤنڈ |
| یو۔اے۔ای | : | ایک سو پچاس (۱۵۰) یو۔اے۔ای درہم |
| عمان | : | پندرہ (۱۵) عمانی ریال |
| سعودی عرب | : | ایک سو (۱۰۰) ریال |
| قطر: | : | ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال |
| کویت | : | پچیس (۲۵) کویتی دینار |
| پاکستان | : | دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے |

جن ممالک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتے پر رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتہ پر بھیجی جاسکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبرشپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

**Eqbal Hasan Azad**
Union Bank of India
Munger Branch
A/c No. 389002010003800
IFSC Code-UBIN0538906

# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| | اداریہ | ادارہ | ۵ |
| | مہمان اداریہ | ڈاکٹر منظر اعجاز | ۸ |
| | حمد و نعت | محمد شفیع الرحمٰن شفیع | ۱۵ |
| غزلیں | سلطان اختر، رحمان حفیظ، افتخار حیدر، اشرف یوسفی، عظیم فاطمی، انجم عثمانی، صدف اقبال، طارق متین، ذوالفقار نقوی، منصور خوشتر، مسلم نواز، اصغر شمیم، دیا جیم | | ۱۷-۲۷ |
| نظمیں | شہناز شازی | | ۲۸ |
| مضامین | سہیل اعظیم آبادی پر پریم چند کے اثرات | ڈاکٹر اسلم جمشید پوری | ۳۰ |
| | سرسید کی تعلیمی سرگرمیاں | فرحان دیوان علیگ | ۴۲ |
| | تحقیق اور اس کے مسائل | نوشاد کامران | ۴۷ |
| | شبلی کی تنقید پر حالی کے اثرات | ممتحنہ اختر | ۵۱ |
| اعتراف | طارق متین: احساس سے اسلوب تک | راشد طراز | ۶۲ |
| اعتراف | اسرار گاندھی کے افسانوی فکر و فن میں تخلیقیت افروزی | اجے مالوی | ۶۵ |
| گوشہ انتظار حسین | | | |
| | کوائف | ادارہ | ۷۶ |
| | انتظار حسین سے ایک گفتگو | بشکریہ ''شب خون'' | ۷۸ |
| | انتظار حسین کا افسانوی چلن | عمر فرحت | ۹۲ |
| | انتظاریات: مضمرات و ممکنات | رافد اویس بھٹ | ۱۰۴ |
| | سماج ادب کا آئینہ ہوتا ہے | سید عمران بلخی | ۱۰۹ |
| خاکہ | اے۔حمید: افسانہ نگار جو پہلوان بنتے بنتے رہ گیا | انتظار حسین | ۱۱۱ |
| افسانہ | پسماندگان | انتظار حسین | ۱۱۳ |


ثالث


| | | | |
|---|---|---|---|
| افسانے | تحفہ | عتیق رحمٰن | ۱۲۷ |
| | کچھ حقیقت کچھ فسانہ | عطاء الرحمٰن خاکی | ۱۳۷ |
| | غریب آباد | سید کامی شاہ | ۱۴۹ |
| | سسکیاں | سلمٰی جیلانی | ۱۶۳ |
| | نسل | نسترن احسن فتیحی | ۱۶۶ |
| | خلیج | نوشابہ خاتون | ۱۷۱ |
| | گرہن گاتھا | فارحہ ارشد | ۱۷۵ |
| امکانات | سچا | ہما فلک | ۱۷۸ |
| | سگنل | احمد عرفان | ۱۸۳ |
| | الو کا پٹھا | فرحانہ صادق | ۱۸۷ |
| فلیس فکشن | ایلن | ڈاکٹر سہیل | ۱۸۹ |
| ناول کا ایک باب | راج سنگھ لاہوریا | اقبال حسن خان | ۱۹۰ |
| تبصرے | چمن در چمن/ڈاکٹر سکندر اعظیم | ڈاکٹر منظر اعجاز | ۲۰۰ |
| | آواز/حسین مجروح | نعیم بیگ | ۲۰۳ |
| | مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار/ارشاد آفاقی | ڈاکٹر ریاض توحیدی | ۲۰۷ |
| ثالث پر تبصرے | نعیم بیگ، سلمٰی جیلانی، عین تابش | | ۲۱۰ |
| مکتوبات | ولی عالم شاہین، راشد جمال فاروقی، ذکی طارق، اسرار گاندھی، نوشابہ خاتون، عشرت ناز، شاہین کاظمی، نگار عظیم، ڈاکٹر سید سرفراز الہدیٰ قیصر | | ۲۱۶ |



ثالث ملنے کے پتے

☆ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) 9304888739 91+

☆ آزاد کتاب گھر، ساکچی، جمشید پور (جھارکھنڈ) 6576999980 91+

# اداریہ

دلچسپی افسانے کا بنیادی عنصر ہے۔

بجا ارشاد، لیکن ہر قاری کی دلچسپی الگ الگ چیزوں میں ہوتی ہے۔ کسی کو رومانی افسانے پسند ہیں تو کسی کو حزن و ملال سے پُر افسانے اپنی جانب راغب کرتے ہیں۔ کوئی ماضی کی داستانیں سننا پسند کرتا ہے۔ کسی کو حالات حاضرہ کے واقعات سے دلچسپی ہوتی ہے تو پھر وہ کون سی خوبی ہے جو ہر قسم کے قاری کو پسند آتی ہے اور کئی افسانہ نگار مقبول خاص ہو جاتے ہیں۔ وہ ہے اس کا بیانیہ، اس کا ٹریٹمنٹ، اس کا لفظیاتی نظام یا ڈکشن۔ افسانے میں کون سا لفظ کہاں پر کون سا معنی پیدا کرے گا اس کا ادراک افسانہ نگار کو ہونا چاہیے۔ الفاظ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ طاقت اسے کہتے ہیں جو کسی شے کو متحرک کر دے۔ اسے اپنی جگہ سے ہٹا دے۔ مثلاً اگر ہوا زور سے چلنے لگتی ہے تو پتے جھومنے لگتے ہیں، گرد اُڑنے لگتی ہے اور اگر بہت زیادہ زور سے چلنے لگے تو آندھی آجاتی ہے اور درخت جڑ سے اُکھڑ جاتے ہیں۔ یہ ہوا کی طاقت ہے۔ اسی طرح پانی کی بھی طاقت ہوتی ہے اور آنسوؤں کی بھی۔ کہتے ہیں کہ عورت کے آنسوؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ بہر کیف! میں کہہ رہا تھا کہ الفاظ میں بھی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ کسی قاری کو ہنسا سکتے ہیں، رُلا بھی سکتے ہیں، ان کے جذبات کو برانگیختہ بھی کر سکتے ہیں اور ان کے ذہن کو غلط راستے پر موڑ کر قاری کی اخلاقیات کو تباہ بھی کر سکتے ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح آندھی اور سیلاب بستیوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ لہٰذا افسانہ نگار کو اپنے الفاظ پر بار بار غور کرنا چاہیے۔ آپ کسی موضوع پر لکھیں اس کے ڈکشن پر دھیان دیں اور دیکھیں کہ دلچسپی کہاں کہاں اور کیسے پیدا کی جا سکتی ہے۔

بات دلچسپی کی آئی تو تجریدی اور علامتی افسانے بھی ذہن میں آئے۔ تجریدی یا علامتی افسانے لکھنا معیوب نہیں ہے لیکن اس قسم کے افسانوں کے تعلق سے اکثر یہ بات سننے میں آتی ہے کہ افسانہ سمجھ میں نہیں آیا۔ تو بھئی جب افسانہ سمجھ ہی میں نہیں آیا تو پھر دلچسپی کہاں سے پیدا ہوگی۔ ایسے افسانوں کو میرا مشورہ ہے کہ ایسی علامتیں استعمال کریں جو روشن ہوں اور افسانے حسن کو بڑھانے میں معاون و مددگار ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ان پر ایسی گہری دھند چھا جائے کہ کچھ دکھائی ہی نہ دے۔ میں نے اکثر افسانہ نگاروں کو اپنے افسانے کی وضاحت و صراحت کرتے دیکھا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنا مافی الضمیر قارئین تک پہنچانے میں



بری طرح ناکام رہا ہے۔ ایسا افسانہ نگار اس گونگے کی طرح ہے جو اپنی بات سامنے والے کو نہیں سمجھا سکتا۔

☆☆☆

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کے علاوہ ہندی، انگریزی اور ترکی کے الفاظ بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ کہ اس کی گرامر سر تا سر ہندی ہے۔ 'ہے'، 'تھا' اور 'گا' جیسے الفاظ جن کے بغیر ہم کوئی جملہ نہیں لکھ سکتے، ہندی الاصل ہیں جبکہ لفظ 'ہندی' بذات خود عربی ہے۔ ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے اور وہ یہ کہ ہر وہ حرف جو 'ھ' کے ساتھ مرکب ہوتا ہے وہ ہندی ہے مثلاً، بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، کھ، گھ وغیرہ اور ان حروف سے جو بھی لفظ بنے گا وہ ہندی ہی ہوگا۔ جیسے، بھیا، بھابھی، بھات، بھالو، بھانت، بھلا، بھورا، پھل، پھول، پھاہا، پھوپھی، پھوپا، پھوڑا، پھوار، پھیلانا، پھیلنا، پھسلن، پھسلنا، پھر، تھام، تھم، تھا، تھے، تھوڑا، تھوڈی (تھوڑی)، تھالی، ٹھہر، ٹھہرنا، ٹھن، ٹھنکا، ٹھائیں، جھانکنا، جھام، جھمکا، جھاڑو، جھاڑ، جھنکار، جھیل، جھولا، جھولا، جھانپڑ، جھم، چھم چھم، چھیلنا، چھورا، چھوری، چھاپ، گدھا، گدھ، راکھ، کھانا، کھلنا، کھیل، کھلونا، گھر، گھرونده، گھرانہ، گھیرنا، گھاٹ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بے شمار الفاظ ہیں جو اردو میں رائج ہیں۔ اسی طرح انگریزی کے انگنت الفاظ یا تو اپنی اصل شکل میں یا تلفظ کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اردو میں مستعمل ہیں مثلاً الماری (المیرا) لالٹین (لینٹرن)، ہسپتال (ہاسپٹل) وغیرہ۔ ریل، اسٹیشن، کار، بس، ٹرک، ٹکٹ، موبائل، سم، چارج، ریچارج، ٹی وی، ریڈیو، فلم جیسے انگریزی کے سینکڑوں لفظ جوں کا توں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ہمارے بعض قارئین اور ناقدین اردو افسانے میں دوسری زبانوں کے الفاظ کے استعمال کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اور بعض اوقات افسانہ نگار کو یہ مشورہ بھی دیتے نظر آتے ہیں کہ فلاں لفظ کی بجائے فلاں لفظ کا استعمال کرنا چاہیے تھا۔ اب یہاں پر دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہندی اور انگریزی کے بغیر ہم زیادہ دور تک نہیں چل سکتے اور دوسری بات یہ کہ تنقیدی مضامین میں تو زیادہ سے زیادہ عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن افسانے میں یہ ممکن نہیں۔ ایک پختہ افسانہ نگار خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ کہاں پر کون سا لفظ لانا۔ ہر لفظ کا ایک صوتی آہنگ ہوتا ہے۔ غیر مناسب لفظ لانے سے وہ آہنگ بگڑ جاتا ہے اور افسانے کا وحدت تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ افسانے کی زبان جس قدر عام بول چال کے قریب ہوگی اسی قدر وہ افسانہ کامیاب ہوگا۔ زبردستی کے ٹھونسے ہوئے الفاظ خواہ وہ کتنے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں افسانے کے حسن کو بگاڑ دیتے ہیں۔ افسانے میں مقامی زبان کے الفاظ اور مکالمے اسے مزید دلکشی عطا کرتے ہیں، مثلاً کوئی پنجابی افسانہ نگار پنجابی الفاظ کا استعمال کرے یا کشمیری قلمکار کشمیری

زبان کی لطافت سے قاری کو روشناس کرائے یا کوئی بہاری سادگی اور معصومیت کا جادو جگائے۔ یا پھر انگریزی ماحول میں پرورش پانے والے اپنے افسانوں میں اس کی ہمہ گیری کا مظاہرہ کریں۔

☆☆☆

پچھلے شمارے سے ہم نے ''اعتراف'' کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جسے قارئین نے بے حد پسند فرمایا۔ اس شمارے سے ایک اور نیا عنوان ''امکانات'' قائم کیا جا رہا ہے۔ امید کہ اسے بھی پسند کیا جائے گا۔

☆☆☆

گذشتہ دنوں آسمان ادب کے کئی درخشندہ ستارے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گئے۔ عابد سہیل، انتظار حسین، ندا فاضلی، زبیر رضوی اور انور سدید۔ ادارہ ان کے غم میں سوگوار ہے۔ انتظار حسین اردو کے قد آور فکشن نگار تھے۔ انہوں نے اردو افسانہ نگاری کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ان کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ اب کبھی نہ بھر سکے گی۔ اس شمارے میں مرحوم پر ایک گوشہ بھی شامل ہے جس میں ان کے ایک بہترین افسانے ''پسماندگان'' کے علاوہ عمر فرحت، رافد اویس بھٹ اور سید عمران بلخی کے مضامین شامل ہیں۔ اور اس کی ترتیب و تہذیب میں محترم چودھری ابن النصیر (الہ آباد)، محترم اسرار گاندھی (الہ آباد)، محترمہ انجم قدوائی (علی گڈھ)، عزیزی رضی شہاب (نئی دہلی) محترمہ ھما فلک (جرمنی) کی مدد شامل حال ہے۔ ادارہ ان محترم خواتین و حضرات کا شکر گزار ہے۔

☆☆☆

''ثالث'' نے ایک قلیل عرصہ میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور اس نے پوری اردو دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ اس کے لیے ہم اپنے باذوق قارئین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس رسالے کی ویب سائٹ کو تا دم تحریر پینتیس ہزار چھ سو (۳۵۶۰۰) سے زیادہ بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔ آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر اس کے گذشتہ شمارے بالکل مفت پڑھ سکتے ہیں:

www.salismagazine.in

www.facebook.com/salismag

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

◀◀ ● ▶▶



## ● مہمان اداریہ

## ● ڈاکٹر منظر اعجاز

# متن سے مکالمہ

تنقید اصطلاحی معنوں میں کسی ادب پارے یا فن پارے کی جانچ پرکھ کا نام ہے جس میں تفہیم، تشریح اور تعبیر بھی شامل ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا کسی ادب پارے، فن پارے یا تخلیق میں اس عمل کی کارفرمائی نہیں ہوتی؟ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ کچھ برسوں میں کئی بار ادب نگار یا تخلیق کار کی تنقید نگار کی صف میں مشمولیت پر اصرار کیا گیا ہے، اور ہر بار میں نے محسوس کیا ہے کہ مصر قلم کار یا سوالیہ کی نظر میں تنقید یا تنقید نگار کے مقابلے میں تخلیق کی حیثیت اور تخلیق کار کا مرتبہ کمتر ہے۔ اگر ایسا ہے تو سمجھا جا سکتا ہے کہ سوالیہ یا سوالئے احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تخلیق کار کو اگر تنقید نگار تسلیم کر لیا جائے تو اس کی ترقی یا پروموشن ہو جائے گا۔ بالفرض محال اگر ایسا نہیں ہو پاتا تو یہ کوشش کی جا سکتی ہے کہ نقاد کا ڈیموشن کر دیا جائے۔ یا پھر جو جہاں ہے اور جس حالت میں ہے، اسے وہیں اور ویسی ہی حالت میں رہنے دیا جائے۔ ویسے بھی موجودہ دور میں تخلیق کار ہو یا تنقید نگار، اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے یا پھر حیثیت تبدیل ہو گئی ہے۔ تخلیق کار یا ادب نگار، متن کا ترتیب کار اور نقاد قاری بن گیا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ستر پوشی کے لیے لباس کا تصور اس زمانے میں بھی تھا جب انسانی تہذیب کے انکھوئے جنگلوں اور پہاڑی گپھاؤں میں نکل رہے تھے اور زمانۂ موجودہ میں بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لباس کے ڈیزائن اور ڈریس میٹریل میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ تہذیب و تمدن کی موجودہ صورت حال نے دور وحشت کی عریانی کی یاد تازہ کر دی ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ دور وحشت کی کہانی مختلف صورتوں میں اور انسانی معاشرے کی مختلف سطحوں پر بکھری ہوئی ہے، اور اس کی جھلک ادبیات میں بھی ابھرتی رہتی ہے اور ادبیات کی دید و باز دید یعنی قرأتوں میں بھی، اور آج انتقادیات میں یہ مانا جاتا ہے کہ قرأت کا عمل مجہول نہیں ہوتا۔ کیوں کہ قرأت ہی متن کو بے معنی یا بامعنی بناتی ہے۔ اسی لیے بعض اساتذۂ علم الادب یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ متن کو کیسے پڑھیں اور کیسے نہ پڑھیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایسے پڑھیں، ویسے نہ پڑھیں۔ لیکن پڑھنے والے تو اپنے ہی طور پر پڑھتے ہیں اور ان میں

بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو لاف وگزاف کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ یہ بھی گویا میلان طبع پر منحصر ہے۔لیکن ایسے ہی میں خلیفہ ہارون رشید کا ایک درباری بری طرح پھنس گیا جب اس نے دربار میں پیش کیے جانے والے کم سن گدھے کے بارے میں یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ اسے پڑھایا جا سکتا ہے اور خلیفہ نے اس کو پڑھانے کی ذمہ داری اسی درباری کو سونپ دی تھی۔اسی وقت سے اسے اپنا عبرت ناک انجام دکھائی دینے لگا تھا لیکن خوش قسمتی سے بہلول دانا مل گیا جس نے گدھے کو پڑھانے کی ترکیب بتا دی، وہ کامیاب ہوا۔کہاں تو جان کے لالے پڑے تھے۔آنکھوں میں پھانسی کا پھندا گھومنے لگا تھا اور کہاں یہ انجام کہ خلیفہ اور اس کے درباریوں میں سرخروئی حاصل ہوئی۔ بہلول دانا کی دانائی نے گویا نوشتۂ تقدیر بدل دیا۔

ع نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ادب کی تخلیق ہو یا تنقید بہر صورت دانش و بینش کا مطالبہ کرتی ہے۔اسی دانش و بینش یا وجدانی بصیرت سے قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل دکھائی دیتا ہے۔مصور پتھر کے بد ہیئت تودے میں ہیلن کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرتا ہے اور بے معنی طومار کو الگ کر کے اس کے حسن کو نکھار دیتا ہے۔یہی حسن کاری فنکاری ہے ۔حُسن جسے معنی کہیں یا قدر (Value) کا نام دیں، کائنات فطرت میں موجود ہے لیکن فطرت کے بے معنی طومار میں گم یا معدوم اور مشاہدۂ عام سے محروم ہے۔اسے منصۂ شہود پر موجود کرنا اور قابل مشاہدہ بنانا ادیبوں اور فنکاروں کا کام ہے کیوں کہ بے دست و پا فطرت یہ کام خود نہیں کر سکتی۔فطرت پر فرد کو اسی لیے فوقیت حاصل ہے کہ وہ اسے بروئے کار لا سکتا ہے اور بظاہر بے معنی کو با معنی بنا سکتا ہے۔لیکن یہ فرد عام معاشرتی افراد سے اپنی بصیرت اور فنی مہارت کی بنا پر مختلف ہوتا ہے۔زمانہ ایسے افراد کو فنکار کے نام سے پکارتا آیا ہے۔آج کے محاورے میں ہم اسے متن نگار یا متن ساز بھی کہیں تو اس سے معنی کا جہان بدل نہیں جاتا۔لیکن اس جہان معنی کی نوعیت و کیفیت اور قدر و تاثیر کیا ہے اس کا تعین ایک دیدہ ور نقاد ہی کر سکتا ہے۔صارفیت اور بازاریت کے اس دور میں تخلیق کہی جانے والی شے مصنوع (Product) کہلانے لگی ہے اور قدر و قیمت کا تعین کرنے والا Buyer یا خریدار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔بازار میں ایسے نمونوں کی بھرمار ہے۔خریدار بھی بے شمار ہیں جو ہر چیز کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتے اور دام لگاتے ہیں۔دام لگاتے وقت خوبیوں اور خامیوں پر تبصرے بھی کرتے جاتے ہیں۔متن نگار یا متن ساز بھی اپنے طور پر خوبیوں کی وضاحت کرتا ہے اور قدت و قیمت بیان کرتا ہے لیکن بہر حال اس کا مال بازار کے رجحان پر منحصر ہے۔اس کا اسے احساس و ادراک ہے چنانچہ کہتا ہے:

لے آیا تو ہوں بزم میں میں اپنی نگاہیں ‎ ‎ ‎ ‎ اب تبصرۂ اہل نظر دیکھئے کیا ہو

(قیصر صدیقی)



اور اہل نظر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ شرحیں اور تاویلیں اپنے اپنے طور پر کرتے رہتے ہیں۔ان کے مابین اختلافات کا بھی امکان رہتا ہے لیکن بازاریت کے رجحان کی وجہ سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اشتہار بازی بھی خوب خوب ہوتی ہے اور اس کے ذریعے رجحان سازی کی جاتی ہے۔ایک طرف تو مصنوعات کی فروخت کے لیے ایسے ہتھکنڈے اختیار کیے جاتے ہیں، دوسری طرف Buyers کا مزاج بھی بن جاتا ہے کہ غالب رجحان کی تنقید کو معیار زندگی کی علامت (Status Symbol) بنا لیتے ہیں۔مثلاً ترقی پسند تحریک یا جدیدیت پسند رجحان کے دور میں تحریک و رجحان کا ساتھ نہ دینے والے ٹاٹ باہر ہوئے اور انہیں غیر اہم قرار دینے کے لیے اندر والے اپنے اپنے طور پر تاویلیں اور تشریحیں کرتے رہے۔ان کے خون جگر کو پانی کے مول بھی سمجھنے میں تامل ہوا۔غالباً کسی ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے یہ شعر کہا تھا:

اہل مدرسہ بیٹھے ہیں شرح آگہی لکھنے ‎ ‎ ‎ ‎ ہم سے پوچھتا کوئی درد ہم نے جھیلے ہیں

(مرتضیٰ اظہر رضوی)

زندہ ادیبوں اور شاعروں سے تو استفسار کیا جا سکتا ہے، پوچھا جا سکتا ہے کہ کس مرحلۂ درد و غم یا کس کیفیت نشاط و کیف سے گزر کر متن سازی کی اور ان کیفیات کی مقدار و اقدار کیا ہیں۔معنی کیا ہے، مفہوم کیا ہے اور اس کے اظہار یا بیان سے مراد کیا ہے، مقصد کیا ہے لیکن مُردوں سے کیسے پوچھا جا سکتا ہے۔ضروری نہیں کہ جو زندہ ہیں، وہ پوچھنے پر بتا دیں۔اس اشکال کو ہمارے عہد کے بعض اہم دانشور اور معتبر نقاد بھی سمجھتے ہیں یا سمجھاتے ہیں۔درج ذیل اقتباس سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

''ہم کہتے ہیں کہ انتظار حسین یہاں موجود بیٹھے ہیں۔ان سے جب پوچھو کہ صاحب آپ نے افسانے میں کیا لکھا ہے تو کہتے ہیں، ہم نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ یہ آدمی تو کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔اور مان لیں کہ ہم بتا بھی دیں...... ہم اتنے بڑے بے حیا نہیں ہیں...... کہ ہم نے یہ لکھا ہے تو میر سے تم کہاں پوچھو گے؟ میر تو مر چکے ہیں۔اقبال مر چکے ہیں، فیض مر چکے۔فیض سے تم کیسے پوچھو گے کہ میاں اس نظم میں تم نے کیا لکھا ہے؟ تمہیں وہ نظر لانی پڑے گی کہ تم اپنے مرے ہوئے بزرگوں کو اپنا معاصر مان سکو، ان کی آنکھ سے دیکھو، ان کے کان سے سنو۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، اردو چینل۔۲۴، ص۱۹)

اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے غالبؔ بھی ایسے ہی مسئلے سے دو چار ہوئے تھے اور بالآخر شارحین عرفیؔ کو ایزدی سروش ماننے سے انکار کر دیا تھا۔چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں اور ان کا کلام وحی ہے۔ اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ یہ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے......عرفی کو کہاں سے لاؤں جو اس سے پوچھوں کہ بھائی تو نے اس شعر کے کیا معنی رکھے ہیں۔" (مشمولہ عود ہندی، پہلا خط)

شعر و ادب کی تفہیم و تشریح اور تعبیر کا یہ مسئلہ فارسی اور اردو ہی میں نہیں ہے، دوسری زبانوں میں بھی اس کے آیات و آثار ملتے ہیں۔ جدید فرانسیسی میں شاعری کا نمایاں ترین نام اسٹیفا نے میلارے ہے۔ اس کے جدت پسند میلان طبع نے وہ ابہام پیدا کیا کہ "بوجھو تو جانیں" جیسا سوال اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے انگریزی مترجم راجر فرائی نے ترجمہ کے دوران بعض نکات کی وضاحتیں بھی کیں پھر بھی تفہیم و تعبیر کا مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا۔ اس مسئلے کو چارلس موروں نے اس طرح حل کیا کہ اپنے قیاسات کی بنیاد پر افسانہ طرازی کرنی شروع کر دی۔ اور اس کا یہ طریق کار پسند بھی کیا گیا۔ یہی نہیں اس کے اثرات دور تک پھیلے۔ یہاں تک کہ میرا جی بھی متاثر ہوئے اور ہم عصر شعرائے اردو کی تنقید میں یہی طریق کار اختیار کیا۔ "ادبی دنیا" کا کالم "دنیائے ادب" اسی منہاج پر آراستہ ہونے لگا۔

ادبی دنیا کی ادارت سے وابستگی کے زمانے میں دو ڈھائی سال کے دوران میرا جی نے ۲۳ شاعروں کی ۵۰ نظموں کے تجزیے کیے۔ انہوں نے ہر ماہ کی مطبوعہ نظموں میں سے یہ نظمیں منتخب کی تھیں۔ اور اس بات کا بطور خاص خیال رکھا تھا کہ شاعر کے نام کو نہیں، کام کو دیکھا جائے۔ انہوں نے جن نظموں کے تجزیے کیے وہ سب کے سب ان کے اپنے مزاج و میلان سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ لیکن بعض محرکات کی وجہ سے وہ ان کی طرف مائل ہوئے اور اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے دیکھا اور پھر اپنے مخصوص انتقادی طریق کار کو بروئے کار لائے۔ لیکن یہ طریق کار چارلس موروں سے ماخوذ یا متاثر تھا جس کی وضاحت انہوں نے خود ہی "اس نظم میں" میں کی ہے۔ ان کی یہ تحریریں کئی لحاظ سے دلچسپ اور توجہ طلب ہیں۔ ممکن نہیں کہ ان تمام نظموں کے حوالے سے یہاں گفتگو کی جائے۔

"اس نظم میں" کی پہلی نظم ن۔م۔راشد کی ہے جس کا عنوان ہے "اجنبی عورت" یہ آزاد نظم ہے۔ ایک دوسری نظم "ادھوری کہانی" ہے جو پابند ہے۔ میرا جی چونکہ ہیئت، ساختمانی عنصر یا فارم کو اہمیت نہیں دیتے، اس لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نظم آزاد ہے یا پابند؟ ان کی نظر میں اہمیت خیال کی ہے:

"خیال ہی میرے نظر میں بنیادی شئے ہے۔ اس میں اگر کوئی نئی بات



نہیں۔ اس میں اگر کسی کو وہ قدم آگے بڑھانے کی صلاحیت نہیں تو اظہار کی کوشش بے مصرف اور بے کار ہے۔"

لیکن یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ وہ تشریح کس طرح کرتے ہیں۔ شرح آگہی لکھنے میں کون سا طریق کار بروئے کار لاتے ہیں؟ یہ دیکھنے کے لیے مثال کے طور پر ن۔م۔راشد کی نظم "اجنبی عورت" کا پیش نظر ہونا بے محل نہ ہوگا:

"ایشیا کے دور افتادہ شبستانوں میں بھی / میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں
کاش اک دیوارِ ظلم / میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ عمارات قدیم / یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار
چاندنی میں نوحہ خواں / اجنبی کے دست غارت گر سے ہیں
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی / میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں
کاش اک دیوار رنگ / میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو
یہ سیہ پیکر، برہنہ راہرو / یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہر خند
یہ گزرگاہوں پہ دیو آسا جواں / جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل، بے باک مزدوروں کا سیلاب عظیم / ارضِ مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب / دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے
ان کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں"

اس نظم کو اسی صورت میں نقل کرنے کے بعد میرا جی تشریح و تعبیر اور تجزیہ کے مرحلے سے گزرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس نظم کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن اس کے الفاظ کو بھول جاتا ہے۔ سب سے پہلے میں دل سے شاعر کے براہِ راست مفہوم کو نکال دیتا ہوں۔ میرا تخیل ایک دم مغرب کے موجودہ ہنگامہ زار میں جا پہنچتا ہے جہاں انگلستان کے وہ باشندے موجود ہیں جو امن پسندی اور جمہوریت کے علم بردار بنتے تھے۔ لیکن آج جن کی تہذیب و تمدن کے گہوارے تباہ کاری کے خرابے بن گئے ہیں۔ اور جنہیں اپنے آدرش کی حفاظت کے لیے مغرب کے میدانوں میں دشمنوں کا سامنا ہے۔ یہاں تک سوچ لینے کے بعد میں پھر ایشیا میں آ پہنچتا ہوں۔ اب میرا ذہن اس نظم کے شاعر کے ذہن سے ہم آہنگ ہے۔ مغرب کی سمت کا یہ ذہنی سفر میں نے اس

نفسیاتی پیچ کی بنیاد پر کیا ہے جو شاعر نے نظم کے آخر میں رکھا ہے۔''

متن سے مکالمہ یا متن کی قرأت کے اولین مرحلے میں ہی قاری کے تخیل کی پرواز اور اس کی سمت و رفتار نفسیاتی پیچ کے تعاقب میں سرگرم کار دکھائی دیتی ہے۔ قاری کو سردست اس سے سروکار نہیں کہ شاعر کے دل میں کون سا خیال پیدا ہوا، یا وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ قاری اپنے طور پر نظم کا مفہوم مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر ایک افسانہ گڑھ کر رکھ دیتا ہے۔ گویا اس نے یہ فرض کرلیا ہے کہ شاعر نے اس نظم میں یہی مفہوم رکھا ہے۔ اسے اپنا دیکھا بھالا، اپنا سوچا سمجھا، اچھا لگتا ہے۔ کوئی اس سے اختلاف کرتا ہے تو کیا کرے جیسا کہ پروفیسر محمد حسن نے اس طریق کار سے اختلاف کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ:

آنکھوں کو آئینہ اچھا لگتا ہے　　　سب کو اپنا چہرہ اچھا لگتا ہے

(قیصر صدیقی)

میرے خیال میں یہ وہی نفسیاتی پیچ ہے جس کا میراجی نے ذکر کیا ہے۔ اسی نفسیاتی پیچ کے سبب کوئی خود بیں آئینے کو الٹا کر کے بھی دیکھ سکتا ہے اور اس سے اختلاف کی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے:

آپ کو کیسے یہ آئینہ بھلا دیکھے گا　　　آپ آئینے کو دیکھیں گے جو الٹا کر کے

(منظر اعجاز)

فنکار یا متن نگار اپنے رنگا رنگ، متنوع اور بوقلموں تجربات کے پھیلے ہوئے آفاق کو سمیٹ کر جس طرح پیش کرتا ہے، وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے یا آسمان کو آنکھ کے تل میں سمونے کا ہنر ہے لیکن کسی قاری کے لیے یہ بوتل میں بند کیا ہوا جن بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں مشاہدے اور مطالعے کی کیفیت و تاثرات میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ اگر قاری پہاڑ کھود کر چوہیا نکالتا ہے تو بھی یہ اس کا بنیادی حق ہے۔ جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس کی یہ آزادی متن سے معنی کا چراغاں کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ کسی نقاد نے متن کو بارود کی ٹکیہ قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق قاری اس ٹکیہ میں پتیلہ لگاتا ہے جس سے پھلجھڑا اس سی چھوٹنے لگتی ہیں اور رنگ برنگ کی چنگاریاں سی چھوٹنے لگتی ہیں۔ لیکن بارود کی ٹکیہ جل بجھ کر اپنا وجود کھو دیتی ہے، جب کہ کوئی ادبی متن وجود نہیں کھوتا اور یہ امکان باقی رہتا ہے کہ:

شرحیں آیات کی کچھ اور لکھی جائیں گی　　　اور بھی آئیں گے کچھ لوگ بتانے معنی

(علی احمد منظر)

یعنی متن سے معنی کا جہان پیدا ہوتا رہے گا اور متن کے حوالے سے متن نگار کا وجود زندہ و پائندہ رہے گا۔ متن کی جان یا روح جہاں معنی کے سوا اور کچھ نہیں لیکن فطرت کے محرکات اور موسم کے اثرات کی وجہ



سے جس طرح کائنات رنگ و بو میں تبدیلی آتی رہتی ہے، اسی طرح سے کہنہ روایات اور پارینہ خیالات کی جدید تشکیل و تزئین بھی ارتقاپذیر زمانہ اور معاشرتی لسانی محاورات کے ذریعے ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے میراجی کی ''نئے خیال'' کی جستجو کار عبث معلوم ہوتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پرانا خیال لذت گیر نہیں ہوسکتا؟

ای گل چوں آمدی ز زمیں گو چگو نہ اند　　　آں روئے ہا کہ در تہہ گرد فنا شدند

(اے پھول تو زمیں سے نکلا ہے تو بتا وہ چہرے کیسے ہیں جو فنا کی گرد ہو گئے۔)

کیا یہی مفہوم درج ذیل اشعار سے مترشح نہیں؟

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں　　　اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

(ناسخ)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

(غالب)

متن نگاری ہو یا متن سازی یا متن کی تشریح و تعبیر، انسان کے بے شمار تجربات و مشاہدات اور قلب و نظر کی بے انتہا واردات سے مرتب ہونے والی ذہنی صلاحیت کے مکاشفات کا پتا دیتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی متن کی تشریح و تعبیر میں اس کے بظاہر متضاد و متخالف پہلوؤں میں ربط و تنظیم کی تلاش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مبہم، مہمل اور بے معنی وغیرہ قرار دے کر متن سے مکالمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی کسی مخصوص رجحان کے ترجمان کو فیشن زدگی کے زعم میں کمتر اور حقیر مانا جا سکتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

P.G.Head,Deptt. of Urdu & Persian
A. N. College
Patna 800013
Mob: +91 9431840245

''ثالث'' کا مشترکہ شمارہ......۹-۱۰

فکشن نمبر ہوگا جس میں اردو کی کسی ایک داستان سے اقتباس، ناول کا ایک باب، ایک مکمل ناولٹ، چنندہ اور غیر مطبوعہ تازہ افسانے، متعدد غیر مطبوعہ افسانچے، فلیش فکشن اور مائکرو فکشن کی مثالیں پیش کی جائیں گی اور داستان، ناول، افسانہ، افسانچہ، فلیش فکشن اور مائکرو فکشن پر تنقیدی مضامین شامل ہوں گے۔

صفحات......۴۴۸　　　قیمت......۳۰۰/(ہندوستانی روپے)

● محمد شفیع الرحمٰن شفیع

# حمد باری تعالیٰ

بیاں ہو حمدِ خالق ، ہے نہ کوئی ابتدا اس کی
ازل سے تا ابد ہوگی نہ ہر گز انتہا اس کی
زمیں اس کی ، فلک اس کا ، قمر اس کا، ضیا اس کی
خلا اس کا ، اسی کی کہکشاں ، روشن فضا اس کی
حیات اس کی، ممات اس کی ، اجل اس کا ، قضا اس کی
اسی کی رات ، دن اس کا ، ہر اک صبح و مسا اس کی
نفس پر زندگی قائم، مسلسل آئے پھر جائے
جہاں بھی جایئے موجود ہے تازہ ہوا اس کی
ضرورت جسم کو پانی کی وقفوں سے ہوا کرتی
میسر جا بجا سب کو یہ نعمت بے بہا اس کی
مثالِ آب پیہم وقت پر کھانا ہمیں پڑتا
فواکہ اور کل اجناس میں وافر عطا اس کی
لباس انسان کی خاطر ثقافت کی نشانی ہے
قبا اس کی ، عبا اس کی ، کلہ اس کی ، ردا اس کی
حفاظت جسم اور اسباب کی ہوتی مکانوں میں
ہے چوب و خشت ، فولاد اور ہر جنسِ بنا اس کی
سمندر سے وہی پانی کو اونچائی پہ لے جائے
برس کر زندگی و تازگی دیتی گھٹا اس کی

◀◀ ● ▶▶



● محمد شفیع الرحمٰن شفیع

# نعت

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں رسول اللہ کل آفاق کی رحمت
بشر کے واسطے منعم کی ہیں سب سے بڑی نعمت
انھیں اللہ نے بخشے ہیں کوثر ، عزت و رفعت
طفیل ان کے نظامِ کائنات و ارض کی وسعت
محبت رب کرے مومن سے جو ہر آن دنیا میں
اطاعت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دل سے کرتا ہو بہر صورت
امام الانبیا ، کل امتوں کے واسطے شافع
مکارم کے متمم ، شارع و ہادیِ کل خلقت
حروفِ بے نقط اللہ کے جیسے ، محمد کے
اذاں میں تا قیامت دونوں ناموں کی ہوئی شرکت
ہمارا کلمۂ طیب شہادت اس کی دیتا ہے
حروفِ بے نقط میں ہوتی ہے پاکیزہ ہر قوت
خدا کا ذکر واجب ہے ، سلام آقا پہ بھی لازم
اسی عظمت کی نسبت سے ہر اک مومن کی بھی عظمت
شفاعت ، رحمت و برکت ، لطافت ، نزہت و راحت
درودِ پاک ان پر بھیجئے ، مل جائے کل دولت
خدا کا حکم ہے صلوا علیہ سلموا مطلق
شفیعا بس یہی ہے دو جہاں میں ضامنِ عزت

◀◀ ● ▶▶

Chand Manzil Nawab Bahadur Road
Patna City 800008 Mob. +91 9304856774

## سلطان اختر

فسانہ ختم تھا روشن رہی تحریر مدت تک
ہمارے روبرو تھی خوش نما تصویر مدت تک
میری خانہ خرابی چین سے جینے نہیں دے گی
مجھے ڈستی رہے گی حسرتِ تعمیر مدت تک
میں اب تدبیر کی انگلی پکڑ کر چلنے والا ہوں
بہت روئے گی میری شومئ تقدیر مدت تک
حصارِ دل میں آجائے تو پھر رخصت نہیں ہوتی
ضرورت کی ہوس رہتی ہے دامن گیر مدت تک
میں کنجِ عافیت میں اب سکوں کی سانس لیتا ہوں
مرے پیچھے پڑی تھی ساعتِ دلگیر مدت تک
سرِ راہِ تمنا تھک کے اکثر بیٹھ جاتی ہے
میاں ہوتی نہیں ہے کارگر تدبیر مدت تک
میں اپنے آپ میں لوٹا تو سینہ پیٹ کر روئی
مری دیوانگی مجھ سے تھی دامن گیر مدت تک
قفس سے چھوٹ کر الجھا رہا میں سست گامی میں
میرے قدموں سے لپٹی تھی کوئی زنجیر مدت تک
فقط اب زینتِ دیوار بن کر رہ گئی اخترؔ
لہو پیتی رہی اجداد کی شمشیر مدت تک

◀◀ ● ▶▶

خانہ برباد ہوئے بے در و دیوار رہے
پھر بھی ہم ان کی اطاعت میں گرفتار رہے
ٹھوکریں کھا کے بھی شائستہ مزاجی نہ گئی
فاقہ مستی میں بھی ہم صاحبِ دستار رہے
مست مولا رہے درویش و قلندر کی طرح
ہم جہاں بھی رہے ہر حال میں سرشار رہے
اپنی صورت سے ہراساں ہے ہر اک شخص یہاں
کون اس شہر میں اب آئینہ بردار رہے
آتے جاتے ہوئے موسم کو دعا دیتے رہو
کم سے کم شاخِ تمنا تو ثمردار رہے
دستکیں ہوں گی درِ دل پہ کوئی آئے گا
رات بھر ہم اسی امید میں بیدار رہے
در بدر پھرتے رہے خانہ بدوشوں کی طرح
زندگی ہم تری تحویل میں بیکار رہے
خوابِ خوش رنگ سے آنکھیں ہیں منور اب تک
دیکھیں کتنے دنوں تعبیر ضیابار رہے
خاک کیوں اڑنے لگی راہِ جنوں میں اخترؔ
رسن و دار کا کوئی تو طلب گار رہے

◀◀ ● ▶▶

Near F C I Godown
Phulwari Shareef.Patna



## رحمان حفیظ

سب کا پیرایہ اظہار بدل جاتا ہے
منہ میں لقمہ ہو تو پندار بدل جاتا ہے
گام دو گام پہ ہوتی ہے جب اپنی نصرت
تو ہمارا سپہ سالار بدل جاتا ہے
جب کبھی ہم کسی معیار پہ پورے اترے
ایسا ہوتا ہے وہ معیار بدل جاتا ہے
اتنے یکساں ہیں مری قوم کے سب معمولات
صرف تاریخ سے اخبار بدل جاتا ہے
میں سمجھتا ہوں شفایاب ہوا ہوں لیکن
چارہ گر بس مِرا آزار بدل جاتا ہے
مرے دشمن کی ذہانت ہے کہ رحمان حفیظؔ
وہ مِری سوچ کے معیار بدل جاتا ہے

◀◀ ● ▶▶

قفس ہے جو برنگِ سائباں رکھا ہوا ہے
ہمارے سر پہ جو یہ آسماں رکھا ہوا ہے
تری آنکھوں میں کیوں جھلکا نہیں رنگِ تمنا؟
ترے سینے میں دِل کیا رائیگاں رکھا ہوا ہے
یہ کوئی روشنی سی ہے مرے آفاقِ فن پر
کہ آنکھوں نے مجھے کچھ خوش گماں رکھا ہوا ہے
وہی دِکھلا رہا ہے ہم کو دو آنکھوں سے دنیا
اسی نے ہم کو ہم سے بھی نہاں رکھا ہوا ہے
کمر کوزہ ہوئی جس غم میں نیلے آسماں کی
اسی غم نے زمیں کو نوجواں رکھا ہوا ہے
جلا کر راکھ کر سکتا ہے یہ انسانیت کو
زباں کی تہہ میں جو آتش فشاں رکھا ہوا ہے
یہی تو ہے دلیل اس کی اماں بخشی کی رحماںؔ
کہ اس نے ہم کو اب تک بے اماں رکھا ہوا ہے

◀◀ ● ▶▶

c/o Masood Hashmi
Pakistan Academy of Letters
Sector H-8/1;; Islamabad, Pakistan
ph: 0092-51-9250582

## افتخار حیدر

گزشتہ شب جو اتنی روشنی تھی
تمھاری یاد کی جادو گری تھی

فضا میں گنگناہٹ تھی عجب سی
ہوا پتوں سے باتیں کر رہی تھی

غزل جیسا سراپا تھا کسی کا
کوئی صورت مکمل شاعری تھی

ترے الفاظ نشتر بن گئے تھے
محبت انتہا پر آگئی تھی

سنا ہے بعد میرے کچھ دنوں تک
وہ مٹی پر لکیریں کھینچتی تھی

وہ گاہے اب پلٹ کر دیکھتی ہے
کوئی اک بات کہنا رہ گئی تھی

وہی ہم ہیں ،وہی تیرہ شبی ہے
محبت چار دن کی چاندنی تھی

لبوں پر قہقہے ہی قہقہے تھے
کوئی لڑکی تھی یا وہ پھلجھڑی تھی

کوئی دل میں اچانک آبسا تھا
محبت کی نہیں تھی ، ہو گئی تھی

◆ ● ◆

قیمت لگا نہ پائے ہماری امیر لوگ
ہم فاقہ مست لوگ ہیں ، ہم ہیں فقیر لوگ

حلقہ بگوش حاکمِ دوراں نہ بن سکے
کچھ لوگ تھے ازل سے انا کے اسیر لوگ

زندہ دلوں کی ، پاک ضمیروں کی خیر ہو
نکلے ہیں ڈھونڈنے کو ہماری نظیر لوگ

دل کا لہو پلاتے ہیں لفظوں کو حرف حرف
مانیں گے اک نہ ایک دن ہم کو اخیر لوگ

ہم اہلِ فن تو روزِ ازل سے ہیں افتخار
چاہت کے اور مہر و وفا کے سفیر لوگ

◆ ● ◆

A-157 Abbas Town,Abul Hasan
Asfahani Road,,Gulshan e Iqbal,
Karachi, Pakistan



## اشرف یوسفی

رخ شب کو سحر آثار کرتے جا رہے ہیں
ستارے تیرگی مسمار کرتے جا رہے ہیں
کہیں زیر زمیں بھونچال کی گونج آ رہی ہے
پرندے شہر کو بیدار کرتے جا رہے ہیں
یہ کیسی موج ہے کھینچے لیے جاتی ہے ہم کو
یہ کیا دریا ہے جس کو پار کرتے جا رہے ہیں
یہی آنگن ہیں ہم جن آنگنوں میں کھیلتے تھے
یہیں دیوار پر دیوار کرتے جارہے ہیں
تجھے معلوم ہے ، تیرے لب و رخسار چھو کر
ہم اپنے خواب خوشبودار کرتے جا رہے ہیں
ہمارے روز و شب ہیں کب ہماری دسترس میں
ہم اپنی آرزو بیکار کرتے جا رہے ہیں
انہیں کچھ گرمیٔ بازار سے لینا نہ دینا
مگر یہ لوگ ہیں تکرار کرتے جا رہے ہیں
یہ کیا شب ہے پرندوں کی اذاں سے پیشتر ہی
سب اپنے عشق سے انکار کرتے جا رہے ہیں
یہ شہر آیا ہے کیسے تاجروں کے ہاتھ اشرف
جو گلیاں تھیں انہیں بازار کرتے جا رہے ہیں

◆ ● ◆

Flat No: B-301Al Amna Avenue 7D/1
North Karachi (Pakistan)

## عظیم فاطمی

خلش، تمنّا، ہوس، طلب سے خمیر اُٹھا ہے آدمی کا
فساد،فتنہ،فسوں،عداوت میں وقت کٹتا ہے ہر کسی کا
شجر، حجر، برگ، شاخ، کانٹے، ثمر، گلوں، خوشبوؤں کا عالم
کہیں وفاؤں کا تذکرہ ہے کہیں گِلہ ان کی بے رُخی کا
وہ چشم و ابرُو،وہ خال و خد، وہ دراز زُلفیں،وہ احمریں لب
یہی نگاہوں کی جستجو ہے یہ کیسا عالم ہے سادگی کا
سکون،راحت،قرار،قربت،وصال،چاہت کا خواب ٹوٹا
کھلی جو آنکھیں تو وحشتیں تھیں مٹا ہر احساس دلکشی کا
رفیق، دلبر، عدو، ستمگر، خلوص، چاہت، جنون، وحشت
ہوا ہوں عُزلت پسند جب سے رہا نہ احساس بد دلی کا
یہ چاند،سورج،شفق،ستارے،یہ کہکشائیں،یہ شمع،جگنو
نئے دنوں کی اُمید ہیں یہ، ہے سلسلہ رنگ و روشنی کا
فریب، دھوکا، دغا، بغاوت، غُلو، ریا، جھوٹ ہو کہ غیبت
یہ روز مرّہ کا کام ٹھہرا چلن یہی بندہ پروری کا
بجھے بجھے سے،اُڑے اُڑے سے،ڈرے ڈرے سے ہیں ماہ و انجم
چراغ آنکھوں کے جل بجھے ہیں عجب عالم ہے بے بسی کا
سفر ،حذر، رہگزر، مسافت، قیام، گھر،بے گھری، سکونت
یہی مراحل ہیں زندگی کے یہی فسانہ ہے زندگی کا
شِکوہ، شہرہ، شعور، شہرت، کفن، جنازہ، نماز، تُربت
مقام عبرت کے سب جہاں میں تو ناز کیسا تونگری کا
عطا،ودیعت،کرم،عنایت،عظیم خالق کی شان و شوکت
میں ناتواں اس کے "کن" کا صدقہ جہاں میں مہمان دو گھڑی کا

D-20 Sunni Avanue, FL-13 Sector 14-B Shadman Town
Karanchi - 75850



## انجم عثمان

طرزِ تپاکِ شوقِ نظارہ تمام شد
کھولی جو ہم نے آنکھ، اُجالا تمام شد

آوارگانِ شوق کی آوارگی نہ پوچھ
پیش از طواف، وسعتِ صحرا تمام شد

ارزاں ہے التفات ابھی سے جو یار کا
نو واردانِ عشق! تماشا تمام شد

ہم تشنگاں سراب سے بہلے رہیں تو خوب
دریا تک آئے ہی تھے کہ دریا تمام شد

آخر کو خاک اوڑھ کے سونا ہے ایک دن
سوچا کبھی تو خواہشِ دنیا تمام شد

ہم پیش لفظ پارۂ الفت ہی پڑھ سکے
آگے بڑھے ہی تھے کہ شمارہ تمام شد

انجم کڑی ہے دھوپ سفر میں حیات کے
ابرِ رواں کا تھا جو اشارہ تمام شد

Apartment number 303, Prime
Beach View Apartments.
Clifton Block 4. Karachi.
Neelofer60@gmail.com.

## صدف اقبال

کچھ نہیں جانتی،جیتی ہوں کہ ہاری ہوئی ہوں
میں بہت سوچ سمجھ کر ہی تمہاری ہوئی ہوں

چل ، تجھے چاند نگر آج گھما کر لاؤں
تیری خاطر مہ و انجم کی سواری ہوئی ہوں

اس کو دیکھا نہیں، محسوس کیا ہے میں نے
جس پہ دل وارا ہے،جس بُت کی پجاری ہوئی ہوں

اُس کو چاہا بھی بہت اُس سے گریزاں بھی رہی
کیا پتا کون سے احساس کی ماری ہوئی ہوں

اچھا لگتا ہے اسی سحر میں کھوئے رہنا
وقت جو تیرے تصور میں گزاری ہوئی ہوں

مجھ میں جو رنگ تھے مستور نمایاں ہوئے ہیں
جان!میں جب سے تجھے جان سے پیاری ہوئی ہوں

دھوپ بن کر ابھی آ جاؤ، سُکھا دو مجھ کو
گیلے کپڑے کی طرح چھت پہ پساری ہوئی ہوں

کھل کے اقرارِ محبت نہیں کر سکتی صدفؔ !
کیوں سمجھتے نہیں ،تہذیب کی ماری ہوئی ہوں

c/o Iqbal Khan P.O:Bhadeya
Vill:Sondiha Via: Dobhi
Dist: Gaya-824220 (Bihar)

## طارق متین

یہی موقع ہے چلو حد سے گذر جانے کا
راستہ کوئی نہیں لوٹ کے گھر جانے کا

کتنی ارزاں ہوئی جاتی ہے یہاں قیمتِ جاں
شہر افسوس بھی کرتا نہیں مر جانے کا

کوئی موتی نہ ملے کاوشِ پیہم سے بھی جب
فائدہ کیا ہے سمندر میں اتر جانے کا

اک دھڑکا سا لگا رہتا ہے ہر دم مجھ کو
ٹوٹ جانے کا کسی روز بکھر جانے کا

دل میں طوفان لیے پھرتے ہو طارقؔ صاحب
کچھ بتاؤ بھی ارادہ ہے کدھر جانے کا

◄◄ ● ►►

تصنع کی عملداری بہت ہے
جدھر دیکھو اداکاری بہت ہے

کسی درویش کے حجرے میں بیٹھو
کہ تم کو دل کی بیماری بہت ہے

کہیں دنیا کی چاہت ہے فزوں تر
کہیں دنیا سے بیزاری بہت ہے

کہاں جائیں، کسے اپنا بنائیں
بڑے دھوکے ہیں، غداری بہت ہے

یہ کیسا روگ سب کو لگ گیا ہے
کہ طارقؔ شوقِ سرداری بہت ہے

◄◄ ● ►►

Lakhminya, Begusarai Bihar
Mob: +91 7549807809



## ذوالفقار نقوی

غرقِ طوفاں ہے کنارہ صبر کا
ڈوبنے والا ہے تارا صبر کا

دیکھ چہرے پر ملا ہے خونِ دل
بر محل ہے استعارہ صبر کا

دھوپ بھی تھی محوِ حیرت دشت میں
ریت نے یوں رُخ نکھارا صبر کا

حرف جس کے سائباں ہوں دشت میں
آ رہا ہے اک شمارا صبر کا

دیکھنا اے شرق، نکلے گا ضرور
غرب سے کوئی ستارہ صبر کا

◄◄ ● ►►

جنابِ خالد کرار کے نام

شعور و فکر سے آگے نکل بھی سکتا ہے
مرا جنون ہواؤں پہ چل بھی سکتا ہے
مرے گماں پہ اُٹھاؤ نہ اُنگلیاں صاحب
گماں یقیں میں یقیناً بدل بھی سکتا ہے
پہاڑ اپنی قدامت پہ یوں نہ اِترائیں
اُبھر گیا کوئی ذرّہ ، نگل بھی سکتا ہے
مرے لبوں پہ جمی برف سوچ کر چھونا
تمہارے جسم کا آہن پگھل بھی سکتا ہے
کوئی عصا بھی نہیں اور تو اکیلا ہے
امیر شہر کا اژدر نگل بھی سکتا ہے
ہمارے ساتھ جو چلنا ہے زادِ رہ لے لو
کٹھن سے موڑ ہیں پاؤں پھسل بھی سکتا ہے
کرو نہ ضد کہ کسی شہر کی طرف جاؤں
مرے عزیز یہ دل ہے مچل بھی سکتا ہے
کر اپنے سائے سے راز و نیاز کی باتیں
بہت اُداس ہے لیکن بہل بھی سکتا ہے
بس اک نظر جو کرم کی وہ اِس طرف پھیرے
قدم بہک جو گیا ہے سنبھل بھی سکتا ہے

◄◄ ● ►►

C/o Ayyub Shah
Police Transport Workshop
Channi Himmat
Jammu-180015(J&K)

## منصور خوشتر

کوچۂ یار کے اب جور و ستم یاد نہیں
شوقِ دل ،راہ گذر، شہرِ صنم یاد نہیں

ایسی بے لطف عبادت کا نہیں کچھ حاصل
لذت سجدہ و تقدیسِ حرم یاد نہیں

ہائے وہ تیری محبت ، ترا اظہار وفا
التجا کر تے ،ترے دیدۂ نم یاد نہیں

آرزو وں سے بہت دوراب اپنا دل ہے
اپنا دامن کہ ترا دستِ کرم یاد نہیں

دولتِ شوق کو بھی وقت نے کچھ لوٹ لیا
داستاں دل پہ کوئی تھی بھی رقم، یاد نہیں

اک غزل پر مری انعامِ وفا کی صورت
پیش بھی تونے کیا کوئی قلم یاد نہیں

میں نے ماضی کی ہراک بات بھلادی خوشترؔ
ہوخوشی اپنی ،کسی اور کا غم ،یاد نہیں

◀◀ ● ▶▶

جہاں سے اب گزرناچاہتے ہیں
کہ ہم جنت میں رہنا چاہتے ہیں

توجہ آپ فرمائیں اگر تو
کچھ ہم بھی عرض کرنا چاہتے ہیں

ذرا تیغِ نگہ کو تیز کیجے
کہ ہم بھی کچھ تڑپنا چاہتے ہیں

چھپا رکھی جو ہے وہ جام دیدے
وہی پی کر بہکنا چاہتے ہیں

مزہ عاشق کو اس میں بھی ہے ملتا
جفا ئیں تیری سہنا چاہتے ہیں

ہوئے ہیں تنگ اس دنیا سے ایسے
بلا تا خیر مرنا چاہتے ہیں

ورق خوشترؔ کتابِ زندگی کا
کوئی تازہ الٹنا چاہتے ہیں

◀◀ ● ▶▶

Editor Quarterly Darbhanga Times
Purani Munsafi Darbhanga Bihar
Mob: +91 923477276



## مسلم نواز

سفینہ غرق ہوا کیوں یہ ناخدا جانے
یہی تھا اس کا مقدر تو پھر خدا جانے

تمام عمر رہا میں دعاؤں میں مصروف
قبول ہو کہ نہ ہو یہ مری دعا جانے

وہ ایک خط میرے محبوب کا جو آیا تھا
اُڑا کے لے گئی اس کو کہاں ہوا جانے

تمام رات ہواؤں کا قہر جاری تھا
اُسی کے بیچ جلا کیسے یہ دِیا جانے

اُسی کے ساتھ تُو رسم وفا نبھا مسلمؔ
جو تیری بات سُنے تیرا مدعا جانے

◀◀ ● ▶▶

12/3/H/I Patwar Bagan Lane
Kolkata 700009

## اصغر شمیم

زرد پتّہ ہرا ہوا ہے کبھی
ایسا منظر کہیں دکھا ہے کبھی

عیش کوشی میں زندگی گزری
موت آئی تو پھر بچا ہے کبھی

کون سا درد تجھ کو بانٹوں میں
درد کا سلسلہ رکا ہے کبھی

کس کا افسوس اب مناؤں میں
میرا اپنا مرا ہوا ہے کبھی

ذکر اس کا میں کیا کروں اصغرؔ
کھل کے اک بار بھی ملا ہے کبھی

◀◀ ● ▶▶

C/O Baitul Qasim
12/3/H/1-Patwar Bagan Lane
Kolkata-700009
Mob: 09836224948

## دیا جیم

زخمِ شب دیکھ کیسے رفو ہو گیا
چاند تیری طرح ہو بہو ہو گیا

یہ عجب معجزہ ہے تیری یاد کا
میں نے جس کو بھی سوچا وہ تو ہو گیا

آنکھ رونے کی عادی نہ تھی رو پڑی
تیری نسبت سے کارِ نمو ہو گیا

دل کے صحراؤں پہ بارشیں کیا ہوئیں
آنکھ کا دشت بھی آب جو ہو گیا

ہاں تیری مرضیاں سب کی سب مان لیں
ہاں میری خواہشوں کالہو ہو گیا

میں نے چہرے پہ پیلاہٹیں اوڑھ لیں
ہاں مگر عشق تو سرخرو ہو گیا

میں نے خود کو دیا جب کہا تو دیا
شہر کا شہر میرا عدو ہو گیا

◀◀ ● ▶▶

اس کی محبت حسن ہے میرا اُس کا پیار ہی زیور ہے
اب ہر سونا مٹی جیسا اب ہر گوہر پتھر ہے

اُس کو چھو کر میری پوریں جگمگ کرنے لگتی ہیں
جیسے چاند کا ہالہ ہے وہ روشنیوں کا محور ہے

جیسے وہ اک خواب نہیں ہے خواب میں اک آئینہ
جیسے ایک خیال ہے وہ اور ایک خیال کے اندر ہے

جتنا اُس کو سوچ چکی ہوں اتنا دیکھ نہیں پائی
جتنا عکس ہے دل پر اُس کا کب اتنا آنکھوں پر ہے

اپنے پیار کے پھول ستارے سارے اُس پر کاڑھ چکی
وہ جو میرے آنچل جیسا وہ جو میری چادر ہے

اُس کی لَو نے دیا بنایا ورنہ موم کا پیکر میں
میں ہر شکل میں ادنیٰ اُس سے وہ ہر حال میں برتر ہے

◀◀ ● ▶▶

PO Box 2699
Labasa
Fiji
Pacific Islands



## ● شہناز شازی

### اسم

بہت اچھا ہوا تھا ماں نے مری سکھلا دیئے تھے
اسم سارے مجھ کو بچپن میں
تمام آیاتِ قرآنی، وظیفے اور مناجاتیں
کہ جن کے ورد سے ساری بلائیں دور رہتی ہیں
حصار ان کا ہر آفت اور مصیبت سے بچاتا ہے
انہی کے حفظ سے ہوتی رہی مشکل کشائی اور مسیحائی
مگر جب وجود اس کا مجسم اجنبی بن کر
گریزاں ہو گیا مجھ سے عذابِ جانکنی بن کر
خیال آیا کہ شاید یہی اک اسم ماں مجھے سکھلا نہیں پائی
جسے پڑھنے سے اس کی سرد مہری سرد پڑ جائے
جو اس کے دل کا زنگی قفل کھولے اور وہ مجھ کو
فقط اک بار اذنِ باریابی دے
عذابِ نارسائی ختم کر دے
اور نویدِ شادمانی دے

◀◀ ● ▶▶

## ● شہناز شازی

# اس طرح بھی ہوتا ہے

زندگی کی راہوں میں/اس طرح بھی ہوتا ہے/ چلتے چلتے چھاؤں میں
دھوپ بڑھنے لگتی ہے/راہ کی مسافت سے/ پاؤں تھکنے لگتے ہیں
دور تک کہیں کوئی/سائباں نہیں ہوتا/حدت تمازت سے
تن جھلسنے لگتا ہے/دل فگار ہوتا ہے/زخم رسنے لگتے ہیں
درد بڑھنے لگتا ہے/زندگی کی راہوں میں/اس طرح بھی ہوتا ہے
دفعتاً کہیں سے اک/مہربان آتا ہے/شدت تمازت میں
ابر بن کے چھاتا ہے/دھوپ سے بچاتا ہے/راستے کی مشکل کو
سہل تر بناتا ہے/اسکی غمگساری سے/زخم بھرنے لگتے ہیں
زندگی کے صحرا میں/پھول کھلنے لگتے ہیں/زندگی کی راہوں میں
اس طرح بھی ہوتا ہے/مہرباں جو آیا تھا/ ہاتھ وہ چھڑاتا ہے
لا کے اک دوراہے پر/وہ بھی چھوڑ جاتا ہے/وقت خوں رلاتا ہے
تب سمجھ میں آتا ہے/ساتھ چند لمحوں کا/کس قدر رلاتا ہے
دکھ کسی کو کھونے کا/عمر بھر ستاتا ہے/زندگی کی راہوں میں
اس طرح بھی ہوتا ہے/جب اکیلے آئے ہیں/اور اکیلے جانا ہے
اک سکون کی خاطر/کیوں کسی کا احساں لیں/ہر کوئی بیگانہ ہے
عارضی سہاروں سے/دوستی نہیں اچھی/دھوپ چھاؤں کی شازی
دلبری نہیں اچھی!

◀◀ ● ▶▶

132/4, kambekar street.
Fine Mansion.
Mumbai. 400 003(M.S)



## ● ڈاکٹر اسلم جمشیدپوری

# سہیل عظیم آبادی پر پریم چند کے اثرات

سہیل عظیم آبادی کا شمار پریم چند اسکول اور یلدرم اسکول کے افسانہ نگاروں کے بعد کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے 1931ء میں افسانہ نگاری میں قدم رکھا۔ بہت جلد اپنی انفرادیت قائم کی۔ ان کے افسانے اپنے عہد کا آئینہ ہیں۔ انہوں نے پریم چند کی طرح شہر اور دیہات دونوں کی زندگی کو بخوبی پیش کیا ہے۔ ان کے کردار ہمارے آس پاس کے زندہ افراد ہیں، جو ایماندار بھی ہیں، ہمت و حوصلہ بھی رکھتے ہیں، پیار بھی کرتے ہیں۔ زمین داروں کے خلاف کھڑے بھی ہو جاتے ہیں اور ان کے احکامات پر حاضر بھی رہتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں کرداروں کی تحلیل نفسی بھی ملتی ہے۔ وہ کردار کی نفسیات اور اس کے مطابق سرزد ہونے والے افعال و اعمال کا تجزیہ عمدگی سے کرتے ہیں۔ معروف فکشن نقاد وقار عظیم، سہیل عظیم آبادی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ”سہیل کے فن میں ایک ایسی بات ہے جو اردو کے اور کسی افسانہ نگار کے یہاں نہیں۔ وہ کہانی کی سمت بدل کر سنجیدہ سے سنجیدہ فضا کو ایسا بنا دیتے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سہیل کے افسانوں میں دیہاتی اور شہری زندگی کی جن بھیانک حقیقتوں کا تذکرہ ہے وہ جیسی ہیں ویسی ہی ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ افسانہ نگار ان پر جذبہ کی شدت، قوی حس، عام انسانی ہمدردی اور زبان و بیان کے جوش کا رنگ چڑھا کر ہمارے سامنے نہیں لاتا۔ اسی لیے سہیل کے افسانوں میں ایک مخلص اور بے لوث انسان کی سیدھی سادی باتوں کی تاثیر ہے اور یہی سیدھی سادی تاثیر ان کے فن کا جوہر ہے۔ اسی سادگی نے انہیں اور ان کے افسانے کو نئے افسانوی ادب میں ایک نمایاں جگہ دی ہے۔“ [نیا افسانہ، وقار عظیم، ص 182، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1982]

وقار عظیم نے سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کا عمدہ تجزیہ کیا ہے اور ان کی سادگی کو ان کا بڑا وصف قرار دیا

ہے۔لیکن وقار عظیم جب یہ لکھتے ہیں ''جو اردو کے اور کسی افسانہ نگار کے یہاں نہیں'' تو بات قابل قبول نہیں ہوتی۔ وہ ''اردو کے اور کسی افسانہ نگار'' کی جگہ ''جوان کے ہم عصر کسی افسانہ نگار'' لکھتے تو بہتر ہوتا۔ بہر حال سہیل عظیم آبادی کئی اعتبار سے اچھے افسانہ نگار کہلانے کے مستحق ہیں۔انہوں نے افسانے خاصی تعداد میں تحریر کیے۔ دیہات پر لکھے گئے ان کے افسانے، پریم چند کے بعد کے دیہات پر لکھنے والے دیگر افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف ہیں۔ایسے ہی ایک افسانے ''الاؤ'' سے انہیں بے پناہ مقبولیت ملی۔اس افسانے اور مجموعے نے ادبی حلقوں میں خاصی ہلچل مچائی۔ سہیل عظیم آبادی کو پریم چند کی روایت کا امین، پریم چند کا افسانوی وارث اور پریم چند کے رنگ کا افسانہ نگار کہا جانے لگا۔ یہ بات سہیل عظیم آبادی کے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوئی۔لیکن اس پر بحث بعد میں۔ پہلے سہیل عظیم آبادی کے افسانوی ابعاد کا جائزہ لے لیں۔ سہیل عظیم آبادی نے گاؤں دیہات پر جو افسانے لکھے وہ زندگی کے نئے منظر نامے تھے۔'الاؤ' ہو یا 'جینے کے لیے'، 'چوکیدار' ہو یا 'کھنڈر' سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں زمین داروں، انگریزی ملازمین، جاگیرداروں کے ظلم وستم اور عیش ومسرت کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے والے، کسانوں، مزدوروں اور دبے کچلے لوگوں کی بے بسی اور اسے اپنا مقدر سمجھ لینے والے افراد ہیں، تو وہیں بعض ایسے کردار بھی ہیں جو ظلم وستم کے خلاف کمربستہ ہو رہے ہیں۔احتجاج کو ہوا دے رہے ہیں۔ان افسانوں کی کوکھ سے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری بار بار سلگتی اور دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔'الاؤ' دراصل علامت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔الاؤ یعنی لکڑیوں اور گھاس پوس کی وہ آگ جس کے گرد گاؤں کے لوگ بیٹھ کر سردی سے خود کو بچاتے ہیں۔کئی بار الاؤ کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور گھاس پھوس ڈال کر اسے پھر گرم کیا جاتا ہے۔کئی بار گرم راکھ میں پھونک مارنے پر چنگاریاں یکبارگی الاؤ کو گرم کر دیتی ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے بڑی فن کاری سے الاؤ کا استعمال کیا ہے۔ زمین دار کے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند ہونے لگی ہے۔ سانول، بھاگو، دلو کے کاندھوں پر بغاوت کا علم ہے، زمین دار، حکومت کے کارندے، پٹواری، سب اپنی ذہانت سے بغاوت کو دبا دیتے ہیں۔ کچھ لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں۔کھلیان پر اب پولس والے الاؤ تاپ رہے ہیں'الاؤ' کبھی شعلے اگل رہا تھا اور اب آخر میں ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے صورتِ حال کا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔اصلاحی نقطۂ نظر کا استعمال کر کے کوئی نصیحت نہیں کی ہے۔یہی کیفیت ان کے کئی افسانوں میں سامنے آتی ہے۔وہ زبردستی اپنی رائے یا نصیحت کر کے افسانے کو بوجھل نہیں بناتے۔اپنی افسانہ نگاری کے تعلق سے خود لکھتے ہیں:

> ''کہانی اس طرح لکھی جائے کہ اس میں بناوٹ ذرا بھی نہ آئے اور پڑھنے والوں کو کہانی پڑھنے سے زیادہ سننے کا مزہ آئے۔ کردار کی متحرک تصویر نظر کے سامنے آجائے اور واقعات کے تسلسل سے زندگی کا مسئلہ سمجھ میں آجائے۔ میں کسی ازم یا اصول کی تبلیغ افسانہ نگار کا کام نہیں سمجھتا۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو اِ



> زم اور اصول کی تبلیغ کا ذمہ لیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کہانی لکھنے والے کی ذمہ داری یہ ہے کہ زندگی کے حقائق کو دلکش انداز میں پیش کرے، اسے الجھائے نہیں کہ پڑھنے والے کا دماغ الجھ کر رہ جائے....بعض ناقدوں نے میری کہانیوں کو سپاٹ اور بے پلاٹ کہا ہے۔ مجھے خود اس کا اقرار ہے اور میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں کہانی کو خواہ مخواہ زیادہ دلچسپ بنانے اور اس میں Suspence پیدا کرنے یا ہیجان پیدا کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر کہانی زندگی کی تصویر ہے تو اس انداز سے آگے بڑھنا چاہیے جس طرح زندگی۔'' [زبان وادب، پٹنہ سہیل عظیم آبادی نمبر، جنوری تا اپریل 1981ء، ص 97]

سہیل عظیم آبادی کی یہ وضاحت ان کے افسانوں میں جا بجا ملتی ہے۔ان کے اکثر افسانوں میں واقعات کا فطری بہاؤ ملتا ہے۔ کردار بھی اپنے ماحول، تعلیم، لیاقت اور نفسیات کے مطابق عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ مصنف جبراً کسی کردار سے کوئی عمل کرواتا ہو۔ کہانیوں کا انجام بھی فطری ہے۔ یہاں بھی سہیل عظیم آبادی اپنی فکر، اصلاحی نقطۂ نظر، کوئی ازم یا نظریہ قاری پر تھوپتے نہیں ہیں۔ ''جینے کے لیے' ان کا ایک اور قابل ذکر افسانہ ہے۔ یہ بھی دیہات کے پس منظر میں تحریر ہوا ہے۔ مضبوط و مستحکم طور پر مجموعی تاثر دیتا ہے کہ 'جینے کے لیے' مرنا آنا چاہیے۔'الاؤ' اور 'جینے کے لیے' ان کے ایسے افسانے ہیں جو پریم چند کے مقلدین میں سے کئی کے افسانوں پر بھاری ہیں۔ سدرشن ہو یا علی عباس حسینی......سہیل عظیم آبادی کی جیسی حقیقت نگاری ان کے یہاں کم ہی نظر آتی ہے۔ دونوں افسانے مظلوم ہندوستانیوں کے دلوں کے اندر ظالم کے خلاف سلگنے والی چنگاری کے عکاس ہیں:

> ''بولو اب کیا ارداہ ہے، اب عزت چاہتے ہو یا ذلت؟''
> ذلت کون چاہتا ہے؟ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے۔لیکن دلّو نے سب کو سمجھایا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ اب صرف کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔'' (الاؤ)

> ''جیسے ہی کھیت میں ہل چلتا نظر آیا ایک شور ہوا اور زمین دار کے تین آدمی اسے روکنے آگئے لیکن گوبردھن نے ہل کو کھیت سے باہر لے جانے سے انکار کر دیا۔''
> (جینے کے لیے)

سہیل عظیم آبادی نے دیہات کے سیدھے سادے لوگوں کے کردار بھی پیش کیے ہیں۔ان کے

پاس چھل کپٹ نہیں ہے۔ یہ زمین دار، مالک اور سرکاری آفیسر کو ہمیشہ اپنے سے برتر ہی سمجھتے ہیں اور ان کے حکم کو اپنے لیے فرض۔ ان کے لیے جان تک دینے کو تیار رہتے ہیں۔ یہ دیہات کے لوگوں کی سچائی، سادگی اور بھولپن ہی تو ہے۔ 'چوکیدار' کا رام لال ایمانداری سے چوکیداری کرتا ہے۔ رات بھر گاؤں میں آواز لگاتا ہوا پہرہ دیتا ہے۔ اپنے ہی مالک کا بیٹا ڈپٹی بن جاتا ہے، تو رام لال اسے دیکھنے اور سلام کرنے کو بے تاب رہتا ہے لیکن ڈپٹی کی سرد مہری اس کے جذبات کا خون کر دیتی ہے۔ الٹے رات کو آواز لگانے سے ڈپٹی کی نیند میں خلل ہونے کے سبب اسے ڈانٹ ملتی ہے اور جب ایک رات ڈپٹی کے گھر چوری ہو جاتی ہے تو بے چارے رام لال کو پھنسا دیا جاتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے فن کاری سے ایک انسان کی عیاری اور دوسرے کی بے بسی کو افسانہ کیا ہے:

''جب ان کے رشتہ دار چلے گئے تو ڈپٹی صاحب اٹھے اور باہر آئے۔ رام لال نے پھر جھک کر سلام کیا۔ اب ڈپٹی صاحب کھڑے ہو گئے اور رام لال ان کے ہونٹ کو دیکھنے لگا کہ اب ہلیں، اب ہلیں۔

ڈپٹی صاحب نے بڑے سوکھے طور سے کہا، کیا مانگتا ہے؟ رام لال کا دل بڑھ گیا اور خوش ہو کر بولا۔ حضور حاضری دینے آئے تھے۔ ڈپٹی صاحب بولے۔ دیکھ لیا تم زندہ ہے۔ جاؤ اب۔ رام لال سلام کر کے سر جھکائے واپس چلا آیا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے دل میں چھری بھونک دی۔'' (چوکیدار)

گاؤں دیہات کی عکاسی جہاں ان کو حقیقت نگار افسانہ نگاروں میں ممتاز کرتی ہے وہیں ان کے بعض رومانی افسانے انہیں بطور رومان پسند بھی استحکام بخشتے ہیں۔ 'دل کا کانٹا'، 'عجائب خاں'، 'گرم راکھ'، 'جوار بھاٹا' وغیرہ کہانیاں انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ سہیل عظیم آبادی کے رومانی افسانے قاری کو باندھے رکھتے ہیں۔ واقعات در واقعات۔ قصہ در قصہ، ان کے افسانے ایک طلسم قائم کرتے جاتے ہیں اور قاری متحیر سا ان میں گم ہوتا جاتا ہے۔ عجائب خان کی شروعات کچھ ایسی ہے گویا کوئی قتل وخون یا جرائم پر مبنی (Crime Based) افسانہ ہو۔ لیکن جیسے جیسے عجائب خاں کا کردار آگے بڑھتا ہے کہانی میں رومان آتا جاتا ہے۔ جزئیات نگاری کا جواب نہیں۔ پہلے عجائب خاں کے باپ نامدار خاں کا کردار، اس کا اور عجائب خاں کی ماں کا زبردست عشق، پھر دائمی ہجر اور پھر عجائب خاں اور مرتھا کا عشق۔ دونوں کا عشق کچھ اس طور سبک خرامی سے آگے بڑھتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔ مرتھا کی عجائب خاں کے تعلق سے دیوانگی قابل دید ہے۔ یہی نہیں دل کا کانٹا، کی رومانی فضا ہمیں لطف وانبساط کی الگ دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ یہاں امل اور سجنی کا پیار آپ کو اپنے ساتھ خوش اور غمگین کر دیتا ہے۔ آپ کبھی امل کی تنہائی، بے بسی اور بے چارگی پر دکھی ہو جاتے ہیں تو کبھی سجنی کی



زندگی آپ کو اپنے غم میں شریک کر لیتی ہے اور دونوں کی قربت، ہنسی مذاق اور وصال آپ کو رومان کی نئی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ ان کہانیوں میں صرف رومان ہی رومان ہو بلکہ مقصد ہے، سماج کی اعلا قدریں ہیں۔ مثبت اقدار کا استحکام ہے۔ برائیوں پر کاری ضرب ہے۔ برائیوں کا برا انجام ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ سہیل عظیم آبادی کی زبردست رومانی کہانیاں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''سجنی بولی...... میں کبھی تمہیں نہ بھولوں گی، روز یاد کروں گی۔''

اس کی آواز بیٹھ گئی۔ اس سے آگے ایک لفظ نہ بول سکی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی، مگر لڑکھڑا کر گرنے لگی۔ امل کے بدن میں نہ جانے اچانک اتنی پھرتی کہاں سے آ گئی۔ اچھل کر اس نے سجنی کو گرنے سے بچا لیا۔ سجنی امل کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس کا سر امل کے سینے میں تھا۔ کمزور آواز میں بولی ''مجھے گرنے دو بابو، مجھے جانے دو۔''

امل نے سجنی کو اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا اور بولا۔ ''ہوش کرو سجنی''

سجنی نے آنکھیں کھول دیں۔ امل کو دیکھ کر بولی۔ ''مجھے بچایا کیوں بابو، میں کون ہوں تمہاری؟'' امل ایک لفظ نہ بول سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور گلا رندھ کر رہ گیا۔

''تم کیوں روتے ہو بابو!''

امل کچھ بھی نہ بول سکا، سجنی کو غور سے تکتا رہا...... یکایک اس پر جھک پڑا اور اس کے سینے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔''

(دل کا کانٹا، ص ۱۵۱)

''شام کے وقت عجائب خاں مرتھا کو سمجھانے گیا تو اسے دیکھتے ہی مرتھا اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ اسٹورٹ نے اسے بتایا تھا کہ عجائب خاں کس لیے آ رہا ہے اور جس وقت اس نے سنا تھا اسی وقت سے پریشان تھی اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ مرتھا روتی ہوئی بولی ''میں تم کو نہیں چھوڑوں گی۔ تم سے دور نہیں جاؤں گی۔ تمہارے پاس رہوں گی۔ اگر تم میری شادی کرنا چاہتے ہو تو خود کر لو۔ تمہارے سوا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ شادی نہیں کر سکتی اور یہ کہتے کہتے مرتھا زور زور سے روتی ہوئی سر پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ مرتھا کے چھوڑتے ہی عجائب خاں بے جان مردے کی طرح دھب سے ایک کرسی پر گر پڑا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے

لگا۔ یہ کیا ہوا۔ یہ بات تو بھولے سے بھی کبھی اس کے دماغ میں نہیں آئی تھی۔ اس نے چاہا کہ مرتھا کو سمجھائے، لیکن نہ اس کی آنکھیں کھلیں اور نہ زبان ہی ہلی۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ زمین پر ہے یا آسمان پر یا ہوا میں اڑ رہا تھا۔ مرتھا کی ہچکیوں اور سسکیوں کی آواز البتہ اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔''

(عجائب خاں، ص106)

سہیل عظیم آبادی کی کئی رومانی کہانیاں جنسی موضوعات کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا منٹو، عصمت کی جنسی موضوعات پر کہانیوں سے قبل سہیل عظیم آبادی کے یہاں خام مواد موجود ہے جو عصمت اور منٹو کے یہاں زیادہ شدت اور سلیقے سے استعمال ہوا ہے۔ سہیل عظیم آبادی ایسے مقامات پر ثابت قدم رہے ہیں۔ ان کے کردار بھی کہیں فحاشی کے شکار نہیں ہوتے۔ 'گرم راکھ' سہیل عظیم آبادی کا بہت ہی عمدہ افسانہ ہے۔ یوں تو یہ رومانی طرز کا مرقع ہے لیکن اس میں کئی مقام ایسے آتے ہیں جب جنسیت افسانے پر حاوی ہو جاتی ہے۔ قاری منظر میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اسے 'لحاف' کی یاد آ جاتی ہے:

''وہ کبھی کبھی اپنے سارے بدن کا بوجھ ردھیا پر ڈال دیتی اور نیند میں اس سے لپٹ جاتی۔ اس کی سانس تیز ہو جاتی تھی۔ ردھیا جانتی تھی، یہی جوانی ہے۔ وہ بڑے پیار سے پارو کو الگ کر دیتی۔ لیکن کبھی کبھی پارو کے بدن کا بوجھ اسے خود بھی اچھا لگنے لگتا اور وہ بہت سی باتیں سوچنے لگتی۔ کچھ پارو کے بارے میں اور کچھ اپنے بارے میں اور اپنے دل کی ان چنگاریوں کو سلگتی محسوس کرتی جن کو اس نے خود جلا کر اور راکھ بنا کر چھپا رکھا تھا۔ پارو جب سونے میں انگڑائی لیتی اور بدن کو کھینچتی تو اسے معلوم ہوتا کہ خود اس کا بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ ہڈی ہڈی اینٹھ رہی ہے اور اس کی سانس تیز تیز چلنے لگتی تھی۔ ایسے میں جب پارو اپنے بدن کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیتی اور اس کی گرم گرم سانس ردھیا کے چہرے پر پھیلتی، پارو کے بھرے ہوئے سینے کا دباؤ اس کے سینے پر پڑتا تو اس کے سارے بدن میں سنسنی پھیل جاتی اور وہ پارو کو اسی طرح سینے سے لگائے پڑی رہتی۔ بہت سی باتیں اس کے دماغ میں رہتیں اور اس رات اس کی نیند حرام ہو جاتی۔'' (گرم راکھ، ص164)

یہی نہیں کہانی کی مرکزی کردار ردھیا کو سہیل عظیم آبادی نے بہت فن کاری سے گڑھا ہے۔ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جو پیار کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے بے چین رہتی ہے اور اس سلسلے میں شادی سے



قبل وہ طرح طرح کی باتیں سوچتی ہے۔ اپنے بہنوئی کے لیے بھی اس کے دل میں محبت امڈنے لگتی ہے لیکن شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ بھرپور زندگی گزارتی ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد ایک لمبا عرصہ وہ اپنے دل کے جذبات کو راکھ بنا کر رکھتی ہے۔ اس کی نند کے انتقال کے بعد اس کا بہنوئی اس سے شادی کی پیش کش کرتا ہے تو وہ اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ لیکن بیٹی کے گونے پر بہنوئی کی آمد نے اس کے وجود کو پھر متزلزل کر دیا ہے:

''سناٹے اور اکیلا پن کے احساس سے وہ تڑپ سی گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا بہنوئی سائبان میں سویا ہوا تھا۔ چاند کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ ردھیا کا جی چاہا کہ اسے اٹھائے اور باتیں کرے۔ یہی وقت اس سے اطمینان کے ساتھ باتیں کرنے کا تھا۔ وہ دیر تک اسے دیکھتی اور سوچتی رہی، مگر اس کے پاؤں جیسے جم کر رہ گئے۔ اس نے کئی بار ہمت کی کہ آگے بڑھے، اسے اٹھائے اور اسے ساری باتیں سمجھا دے کہ اب اس گھر میں اس کا کوئی بھی نہیں رہا اور وہ اب اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کہیں بھی، چاہے یہ گھر ہو یا کوئی اور، اب وہ اس سے دور نہیں رہنا چاہتی۔'' (گرم راکھ، ص172)

سہیل عظیم آبادی نے کہانی کے آخر میں اپنے کردار کو غلط راستے پر چلنے سے بچا لیا ہے اور یہ سب فطری طور پر ہوا ہے۔

سہیل عظیم آبادی نے اردو افسانے کو کئی یادگار کردار بھی عطا کیے ہیں۔ ان کے کئی افسانے Character based افسانے ہیں۔ ان میں مرکزی کردار کی حیثیت کُل کی ہے اور کہانی کے واقعات، دیگر کردار، مکالمے اور مناظر اس کُل کے گرد گھومتے ہیں۔ عجائب خاں (عجائب خاں)، بھابھی جان (بھابھی جان)، ردھیا (گرم راکھ) ایسے کردار ہیں جو اردو افسانے کے یادگار کرداروں میں سے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے انہیں بڑی محنت اور فن کاری سے انسانی قالب میں ڈھالا ہے۔ عجائب خاں ایسا کردار ہے جو انسانی ہمدردی سے لبریز ہے جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے لیکن وہ سب کے لیے ہے، جسے کبھی عورت کی محبت نہیں ملی۔ لیکن وہ بدکردار نہیں۔ وہ غریبوں کا مسیحا ہے۔ قول و فعل کا پکا ہے۔ احسان کا بدلہ احسان اور شکر سے ادا کرتا ہے۔ رانچی آنے کے بعد جن لوگوں نے اسے سہارا دیا، جب ان کا برا وقت آیا تو عجائب خاں ہر طرح کی مدد کے لیے تیار رہتا۔ لوگوں کے بہکاوے، دباؤ اور بیوی کی ضد کے باوجود وہ اپنے پیسوں کی خاطر بی رائے پر کیس نہیں کرتا ہے اور جب اسے پتا لگتا ہے کہ اس کی بیوی نے اس کی مرضی کے بغیر بی رائے پر کیس کر دیا ہے تو عجائب خاں نے خودکشی کر لی۔ یعنی جان دے دی لیکن غیرت کی بات

برداشت نہیں کی۔ ایسا ہی لازوال کردار 'بھابھی جان' کا بھی ہے جو ایسے شخص سے بیاہی گئی جو سیاسی ہونے کے سبب اکثر جیلوں کی سیر کرتا تھا۔ ایسے میں خود کو، بچوں کو پالنا اور شوہر کی عزت نفس پر داغ بھی نہ آئے۔ بھابھی جان کی شکل میں سہیل عظیم آبادی نے دکھایا ہے کہ عورت سخت سے سخت حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی اپنی راہ خود نکال سکتی ہے اور 'ردھیا' کی شکل میں سہیل عظیم آبادی نے ایک نوجوان عورت کا ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو ہمیشہ ہمارے ذہنوں پر حاوی رہے گا۔

سہیل عظیم آبادی نے معاشرتی افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔ طوائف کے موضوع پر ان کا افسانہ 'سادھو اور بیسوا' اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے اور بہت سے سفید پوش حضرات کے اندرون کی تصویر پیش کرتا ہے۔ 'اسٹیشن پر' آپ کا ایک اچھوتا افسانہ ہے۔ یہاں مرکزی کردار اسٹیشن کا ہے۔ غلام عباس کے افسانے 'آنندی' میں جب پورا شہر مرکزی کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے تو افسانے کی دنیا حیرت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ جبکہ یہ کارنامہ سہیل عظیم آبادی اس سے قبل یہ کر چکے تھے۔

جہاں تک سہیل عظیم آبادی کے اسلوب کا تعلق ہے تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ وہ نہ تو کرشن چندر کی طرح رومانوی اسلوب کے مالک ہیں، نہ عصمت کی طرح بیگماتی زبان استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی منٹو اور بیدی کی طرح زبان لکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اپنا اسلوب رکھتے ہیں جس میں سادگی ہے، سلاست ہے اور روانی ہے۔ ان کے جملوں میں زبردستی کی آرائش نہیں ہے۔ ان کے اسلوب کے تعلق سے کرشن چندر کا بیان ملاحظہ ہو۔ یہ 'الاؤ' کے دیباچے کا اقتباس ہے :

> ''سہیل عظیم آبادی کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے، مصنوعی اور غیر فطری مکالمے نہیں ہیں۔ بہاری گاؤں اور اس کے افراد کی تصویر اس فنی صناعی اور چابکدستی سے کھینچتے ہیں کہ افسانے کی دلکشی دو بالا ہو جاتی ہے۔ غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے بہت پرہیز کرتے ہیں۔ اپنی تحریر میں کم گو لیکن پُر گو ہیں، بہت کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اسے ان کے انداز تحریر کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔''
>
> (الاؤ کا دیباچہ)

سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کی عظمت کو سبھی نے قبول کیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ابھی تک ان پر جتنا لکھا جانا چاہیے تھا، نہیں لکھا گیا۔ اس سلسلے میں وہاب اشرفی کی تعریف کرنی ہوگی کہ انہوں نے سہیل عظیم آبادی کا صحیح تجزیہ کیا اور ان پر اکثر مضامین میں قلم اٹھایا۔ ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے پروفیسر وہاب اشرفی کی رائے ملاحظہ کریں :



> ''سہیل عظیم آبادی کے موضوعات انتہائی متنوع رہے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے مختلف رخوں کو اپنے افسانوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اس لیے ان کے افسانے کی دنیا وسیع و عریض معلوم ہوتی ہے۔ ان کے افسانے عوام و خواص میں اس لیے بھی پسند کیے گئے کہ انہوں نے اس فن کے بنیادی لوازمات پر نگاہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔''
>
> [سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے، مرتب وہاب اشرفی، ص-40 41، بہار اردو اکادمی، 1982ء]

ساہتیہ اکادمی کے لیے مونو گراف ''سہیل عظیم آبادی'' تحریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کی تخلیقات کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سہیل عظیم آبادی نے سچی زندگی کو سادہ اور موثر پس منظر بنا کر انہیں مختلف طرح کے جذبات، خیالات اور انسانی عمل کے محرکات کی بے لوث تصویریں اپنے افسانوں میں دکھائی ہیں۔ امیر، امیری کو اپنا حق سمجھ کر اور غریب اپنی غریبی پر شاکر رہ کر، دونوں اپنے اپنے سوچنے کے طریقوں کو صحیح اور حق بجانب سمجھنے لگتے ہیں۔ غریب کی موت امیر کے لیے ایک بے معنی سی چیز بن کر رہ جاتی ہے اور امیر کی ہنسی میں بھی غریب کو دولت کا نشہ محسوس ہوتا ہے۔''
>
> [سہیل عظیم آبادی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ص51-50]

درج بالا معروضات کے بعد یہ تو واضح ہوجاتا ہے کہ سہیل عظیم آبادی اردو کے معتبر افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے حقیقت پسندر جحان اور رومان پسندی کا امتزاج رکھتے ہیں جہاں وہ دیہات کے موضوعات کو اپنے قلم سے زندگی بخشتے ہیں، وہیں وہ شہری مسائل کو بھی عمدگی سے کہانی کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ ان کا قلم حقیقت نگاری میں انفرادیت رکھتا ہے تو اس سے رومانویت کے جوہر بھی نکلتے ہیں۔ وہ ذہن میں یاد رہ جانے والے کرداروں کے بھی خالق ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر قاری ان میں گم ہوجاتا ہے۔ اسے ان کہانیوں میں اپنی زندگی دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہانیوں کے خوشی و غم کے واقعات کے ساتھ ساتھ کبھی لطف وانبساط حاصل کرتا ہے تو کبھی رنجیدہ ہوجاتا ہے۔ کیا کسی افسانہ نگار کی عظمت ثابت کرنے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں؟ کیا ضروری ہے کہ ہم اس کا موازنہ کسی بہت بڑے افسانہ نگار سے کریں۔ پریم چند اور سہیل عظیم آبادی میں تقابل کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ سہیل عظیم آبادی نے گاؤں دیہات کے موضوعات پر چند اچھے افسانے تخلیق کیے ہیں؟ یا صرف اس لیے کہ سہیل عظیم آبادی بھی حقیقت نگار ہیں۔ جب کبھی ہم ایسا کرتے ہیں تو دو میں سے کسی ایک کو کمتر اور دوسرے کو برتر ثابت کرتے ہیں۔ شبلی نے ''موازنہ

انیس و دبیر‘‘ میں یہی کیا۔ وہ لاکھ توازن رکھنے کی کوشش کے باوجود انیس کی طرف خود کے واضح میلان کو کم نہیں کر پائے۔ سہیل عظیم آبادی خود میں ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ بہار کی بات کی جائے تو انہیں بہار کا پہلا بڑا، مستند اور مقبول افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ ایسے افسانہ نگار کا جب ہم پریم چند جیسے لیجنڈ، عہد ساز اور محرک فکشن نگار سے تقابل یا موازنہ کرتے ہیں تو سہیل چھوٹے ہی نظر آتے ہیں۔ دراصل ہمارے بعض ناقدین نے سہیل عظیم آبادی کے دیہات پر مبنی افسانوں کے حوالے سے انہیں پریم چند کی روایت کا امین قرار دیا۔ بعض نے انہیں پریم چند کے افسانے کی توسیع قرار دیا۔ یہیں سے پریم چند اور سہیل عظیم آبادی کے مابین تقابل کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب کہ یہ درست نہیں۔ وہ بعض معاملات میں پریم چند پر بھی سبقت رکھتے ہیں اور اپنا بہت واضح رنگ رکھتے ہیں لیکن جب پریم چند سے موازنہ کیا جاتا ہے تو سہیل کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا۔ یوں بھی پیپل کے درخت اور گلاب کے پودے کا کیا تقابل۔ خواہ مخواہ گلاب کی تحقیر ہوتی ہے جب کہ گلاب اپنی خوبیوں کی بنا پر بے مثل اور بے نظیر ہے۔ یہی معاملہ پریم چند اور سہیل عظیم آبادی کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر وہاب اشرفی کی رائے ملاحظہ ہو:

’’سہیل عظیم آبادی کو پریم چند اسکول کا ایک افسانہ نگار کہنا اس حد تک مناسب نہیں ہے جس حد تک اس کی تشہیر کی جاتی رہی ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ پریم چند بنیادی طور پر ایک آدرش وادی فن کار تھے۔ لہٰذا ان کے افسانے زیادہ تر اخلاقیات پر گھومتے ہوتے ہیں۔ انہوں نے متعینہ قدروں کے خلاف اس حد تک انحراف کیا ہے کہ جہاں کہیں استحصال کی صورت نظر آئی، اس کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ ایسی صورت میں بالائی امنگیں یا جنسی جذبوں کی عکاسی ان کے یہاں گویا نہیں ملتی۔ سہیل عظیم آبادی پریم چند سے اثرات قبول کرنے کے باوجود کسی طرح بھی ان کی راہ پر گامزن نظر نہیں آتے۔‘‘ [سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے، مرتب وہاب اشرفی، ص39، بہار اردو اکادمی، 1982ء]

پروفیسر وہاب اشرفی نے درست فرمایا کہ پریم چند بڑے فن کار ہیں۔ ان کے افسانے اخلاقیات اور اصلاح معاشرہ کے بڑے مقاصد کا احاطہ کرتے ہیں۔ لیکن سہیل عظیم آبادی کے افسانے، خالص افسانے ہیں۔ وہ کسی ازم یا نظریے کی اشاعت نہیں کرتے۔ ہمارے بعض ناقدین نے سہیل عظیم آبادی کو پریم چند سے وابستہ کر کے ان کی انفرادیت کو مجروح کیا ہے۔ ایک فن کار اپنے سے قبل کے فن کار سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کی پسند کے فن کار بھی ہوتے ہیں اور یہ فن کار اس کے اپنے عہد اور بعد کی نسل کے بھی ہو سکتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے اپنے ایک مضمون ’’میں اور میرا فن‘‘ میں اپنے پسندیدہ افسانہ نگاروں اور ایسے افسانہ نگاروں کے نام لیے تھے، جن سے وہ متاثر تھے۔ ان کا یہ کہنا خود ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ لوگوں نے ان تمام سے آپ کا



تقابل شروع کر دیا۔ ان کے اثرات کی تلاش آپ کے افسانوں میں شروع کر دی اور یہ کہا جانے لگا کہ سہیل عظیم آبادی پر ان کا رنگ غالب ہے۔ یہی غلط فہمی مزید بڑھتی گئی اور یہاں تک پہنچی کہ پروفیسر وہاب اشرفی نے ایک ایک سے ان کا تقابل کیا اور انہیں، ان سے کم تر ثابت کیا۔ پہلے سہیل عظیم آبادی کے الفاظ ملاحظہ کریں:

’’میں جن افسانہ نگاروں سے متاثر ہوا ان میں سب سے پہلا نام منشی پریم چند کا ہے۔ ان کے بعد سدرشن اور روسی لکھنے والے غیر ملکی افسانہ نگاروں میں ٹالسٹائی، چیخوف، موپاساں اور بعض دوسرے لکھنے والے افسانہ نگاروں نے بھی متاثر کیا۔ لیکن میں سب سے زیادہ پریم چند اور ٹالسٹائی سے متاثر رہا ہوں۔ ان دونوں کے یہاں جو کرداروں میں سادگی اور خلوص ملتا ہے وہ کسی دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ آج بھی پریم چند اور ٹالسٹائی کی کوئی کتاب اٹھا لوں تو ختم کیے بغیر نہیں رہتا۔‘‘

[سہیل عظیم آبادی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ص-9-8]

سہیل عظیم آبادی نے اپنے اس مضمون میں گوگول اور ہمنگ وے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے اس بیان پر پروفیسر وہاب اشرفی کی تقابلی تنقید بھی ملاحظہ ہو:

’’سہیل عظیم آبادی پر ٹالسٹائی کے اثرات تلاش کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اس عظیم فن کار کو پڑھا ضرور ہو گا لیکن ان کے ذہن و دماغ پر یا کم از کم ان کے تخلیقی عمل پر اس کے اثرات کا دور دور تک پتہ نہیں لگتا۔

سہیل عظیم آبادی نے گوگول اور ہمنگ وے کے بھی نام لیے ہیں۔ ہمنگ وے کی کہانیوں کے مجموعے کا نام Dikamka Evinigs on a Farm near لیکن اس کی سب سے مشہور کہانی Over Coat ہے۔ دستو وسکی تک نے اس کہانی کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ہم سب ’اور کوٹ‘ ہی سے نکلے ہیں۔ اردو میں بھی اس افسانے کی بڑی دھوم رہی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا گرم کوٹ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے یہاں گوگول کا فن موجود نہیں۔ ہاں اس کے بعض موضوعات کی ایک سطحی مطابقت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ گوگول روس کے ابتدائی افسانہ نگاروں کا ایک اہم نام ہے۔ اس کے اثرات دور رس رہے ہیں۔ ایسے میں سہیل عظیم آبادی کا اس عظیم فن کار کا نام لینا ایک قدرتی امر ہے۔‘‘

[سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے، مرتب: وہاب اشرفی، ص11-10-9]

وہاب اشرفی نے جورائے دی ہے،وہ تجزیاتی ہے اور کسی حد تک ٹھیک بھی۔ یہ بے سبب موازنہ کا نتیجہ ہے۔ یوں وہاب اشرفی اپنی کتب ''سہیل عظیم آبادی اوران کے افسانے''، ''بہار میں اردو افسانہ'' اور'' کہانی کے روپ''میں سہیل عظیم آبادی کے افسانوں اوران کے مقام کا ایماندارانہ جائزہ پیش کر چکے ہیں۔

مقالے کے نتیجے کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سہیل عظیم آبادی نہ صرف بہار بلکہ اردو کے بڑے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے اپنے عہد کے ترجمان اورانسانی زندگی کے صحیفے ہیں۔ ان میں کردار نگاری ہے، کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ ہے اور وہ سب کچھ ہے جو ایک فن کار کو بڑا، اہم اور منفرد بناتا ہے۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے متعدد افسانوں میں گاؤں، دیہات اور شہروں کے مسائل کو اپنے طرز سے افسانے کے قالب میں کامیابی سے منتقل کیا ہے۔ یہ ان کی انفرادیت ہے، جو ان کو ایک معتبر اور مستند افسانہ نگار ثابت کرتی ہے۔ کسی افسانہ نگار کے اپنے اور بعد کے عہد میں بھی زندہ رہنے کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا سہیل عظیم آبادی کو سہیل عظیم آبادی کی تخلیقات کے آئینے ہی دیکھا جائے۔ وہ اردو افسانے کے حوالے سے بہار کی شان تھے اوران کے افسانے ہمیشہ انہیں ہمارے دلوں میں زندہ رکھیں گے۔

☆☆☆

کتابیات

داستان سے افسانے تک/وقار عظیم/نیا افسانہ/وقار عظیم/اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب/قمر رئیس/نمائندہ اردو افسانے/قمر رئیس/سہیل عظیم آبادی اوران کے افسانے/وہاب اشرفی/بہار میں اردو افسانہ نگاری/وہاب اشرفی/کہانی کے روپ/وہاب اشرفی/اردو کا افسانوی ادب/بہار اردو اکادمی/سہیل عظیم آبادی (مونو گراف)/ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی/بہار میں اردو افسانہ نگاری/ڈاکٹر قیام نیر/اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل/صغیر افراہیم/افسانہ نگار پریم چند...../عظیم الشان صدیقی/پریم چند قلم کا سپاہی/جعفر رضا/پریم چند نئے تناظر میں/علی احمد فاطمی/پریم چند حیات اور خدمات/مرتبہ : ڈاکٹر نعیم انیس/اردو افسانہ/شفیق انجم/اردو افسانے میں رومانی رجحانات/محمد عالم خاں/اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی/شکیل احمد/آج کل اور پریم چند/پبلی کیشن ڈویژن، دہلی/روشنائی، کراچی افسانہ صدی نمبر/مدیر: احمد زین الدین/نیا افسانہ/وقار عظیم

◀◀ ● ▶▶

HOD, Urdu, CCS University, Meerut
aslamjamshedpuri@gmail.com
09456259850



● فرحان دیوان علیگ

# سرسید کی تعلیمی سرگرمیاں

## گلوبلائزیشن کے اس دور میں ان کی اہمیت ومعنویت

تاریخِ ہندوستان اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں ہر دور میں کچھ ایسے رہنما پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے فکری نظریات اور کوششوں سے سماجی، سیاسی اور معاشرتی بندشوں کو توڑ کر قوم کے لیے روشن مستقبل کی بنیاد رکھی ۔ان کی جدوجہد سے نہ صرف ملک کی صورت بدلی بلکہ قوم وملت کے لیے ترقی کی ایک نئی زمین بھی تیار ہوئی۔ ان عظیم شخصیات کی فہرست میں سرسید احمد خاں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں میں نے سرسید احمد خاں کی تعلیمی سرگرمیوں اوران کے فکری نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے دورِ حاضر میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ متبحر شخصیت کے مالک سرسید احمد خاں نے انگریزی دورِ حکومت میں آنکھ کھولی ۔ ہوش سنبھالا تو ہندوستانیوں کو بے بس اور مجبور پایا۔ مایوس قوم کو تاریکی سے نکالنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا منصوبہ تیار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ آخر کار ایک راستہ نظر آیا۔ تعلیم! سرسید کے مطابق تعلیم ترقی کا ایسا کارآمد وسیلہ ہے جو ہندوستانیوں کو سرفرازی عطا کرسکتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے جدید تعلیم اور مغربی علوم وفنون کو ہندوستانیوں پر فرض قرار دے دیا۔ جس کی پورے ملک میں مخالفت ہوئی اور سرسید احمد خاں کو کافر، انگریزوں کا پٹھو تک کہا گیا۔ لیکن کچھ تعلیم یافتہ روشن خیال لوگوں نے انہیں امامِ زماں، زمانہ شناس اور مصلحِ قوم جیسے خطابوں سے بھی نوازا۔

سرسید احمد خاں اپنے عہد کے نبض شناس تھے۔ انہوں نے گہری نظر سے ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات کا جائزہ لیا۔ حب الوطنی کے جذبے کو دل میں چھپائے ہوئے معاشرے کا علاج ایک طبیب کی طرح کیا۔ اس وقت کے سیاسی حالات کے مدنظر سرسید کوئی بڑی سیاسی تحریک نہیں چلا سکتے تھے ۔لہٰذا انھوں نے اپنے حکیمانہ فکری نظریات سے کام لیتے ہوئے ہندوستانی قوم کو ناامیدی اور مایوسی کے سمندر سے نکالنے کی جدوجہد شروع کی۔ لیکن پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی نے انگریزوں کے حوصلے بلند کر دیے اوران کا غصہ ہندوستانیوں پر غضب بن کر ٹوٹ پڑا۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہب کی دیوار کھڑی کر کے ان کے اتحاد کو بھی کمزور کر دیا۔ سرسید یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ

رہے تھے اور انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ انگریز مذہب کے نام پر ہندوستانیوں کو تقسیم کر کے اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔اس وقت حالات اتنے مشکل تھے کہ حب الوطنی کے جذبے کو آسانی سے شعلہ نہیں بنایا جاسکتا تھا۔لہٰذا سر سید نے حالات کے مد نظر انگریزوں سے دوستی کرنا ہی مناسب سمجھا اور ہندوستانیوں کو ذہنی طور پر بیدار کرنے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی۔اس سلسلے میں سر سید خود لکھتے ہیں:

"غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، مال واسباب کے تلف ہونے کا کچھ رنج تھا، اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔چند روز میں اس خیال اور اس غم میں رہا۔آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا"

ملک وقوم کے خستہ حالات نے سر سید کو انگریزی حکومت کے قریب تر جانے پر مجبور کر دیا۔جس سے ان کے سیاسی تصورات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے تصور وطن اور حب الوطنی میں کوئی فرق پڑا ہو۔کیوں کہ انگریزوں سے دوستی کے باوجود ان کی قوم پرستی کم نہیں ہوئی بلکہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر انہوں نے ظاہر کر دیا کہ ان کے افکار ونظریات کیا ہیں۔سر سید نے ہندوستانیوں کی اصلاح کے لیے جو منصوبہ تیار کیا اور جو تحریکیں چلائیں ان میں تعلیم وتربیت کو بنیادی اہمیت دی۔کیوں کہ سر سید جانتے تھے کہ تعلیم سے انسان میں پوشیدہ صلاحیتیں نکھر کر باہر آتی ہیں۔لہٰذا انہوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا عملی طور پر آغاز ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی تعلیمی مدرسہ غازی پور سے کیا جو آج بھی "وکٹوریہ اسکول" کے نام سے جاری ہے۔سر سید نے اپنے تعلیمی کارواں کو صرف غازی پور تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے اہل علم حضرات سے ملاقات کی۔ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ الگ نہیں بلکہ ایک ہی ہیں کیوں کہ وہ جس فضا میں سانس لیتے ہیں، پانی پیتے ہیں اور جس زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔وہ ان کا اپنا ہے پھر دونوں کے درمیان یہ دوریاں کیوں؟ سر سید کے اس طرح کے سوالوں نے ہندوستان کے دانشور طبقے کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی جو انگریزوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کی کوشش میں لگ گئی۔لیکن کچھ تنگ نظر لوگوں نے سر سید پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ صرف مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی اور معاشرتی پسماندگی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ سر سید کی تقاریر اور مضامین اس حقیقت کو روشن کرتے ہیں کہ ان کی فکر کا محور صرف مسلمان نہیں بلکہ پوری ہندوستانی قوم تھی۔ان کی سانسوں میں ہندوستانی عوام کی دردناک چیخیں بسی ہوئی تھیں۔جس نے ان کی تحریروں اور تقریروں میں سوز وگداز بھر دیا تھا۔سر سید ملک وقوم کے نوجوانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:



"پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو اور میری قوم کے بچوں اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تا کہ آخر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعاء ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے"[1]

اس اقتباس میں سر سید صاف طور پر ہندوستانی نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ملک وقوم کی ترقی اور کامیابی کے لیے ان سے تعاون کی درخواست کر رہے ہیں۔لیکن کچھ کم فہم لوگ یہاں پر بھی اپنے تعصب اور محدود سوچ کی بنا پر سر سید جیسے رہنمائے قوم کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔وقت نے ان محدود ذہنیت کے لوگوں کو جواب دیا اور آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا بڑے سے بڑا دانشور اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ اگر سر سید اس وقت ملک میں تعلیمی وسماجی تحریک کا آغاز نہیں کرتے تو آج ہندوستان تعلیمی شعبہ میں سو سال اور پیچھے ہوتا۔سر سید نے ہندوستانیوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا اور نوجوانوں کو آگے آنے کی دعوت دی تا کہ ملک ترقی کر سکے۔ساتھ ساتھ سر سید نے لڑکیوں کی تعلیم پر بھی زور دیا۔وہ جانتے تھے کہ ایک ترقی یافتہ معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ لڑکیوں کی اصلاح کی جائے تا کہ ہماری آنے والی نسل کی تعلیم کا معیار بھی بلند ہو۔لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق سر سید کا قول ملاحظہ کریں:

"میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اسے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں۔بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لیے کرتا ہوں ،لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ہیں"[2]

سر سید نے اپنی تعلیمی تحریک کے سلسلے میں وائسرائے ہند کو ایک خط لکھا جس میں ہندوستانیوں کی تعلیم سے متعلق چند مشورے دیے جو درج ذیل ہیں:

(۱) مختلف علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم کا دیسی زبانوں میں خاطر خواہ اہتمام کیا جائے۔

(۲) امتحانات کا ذریعہ انگریزی کے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں میں بھی تسلیم کیا جائے۔

(۳) مختلف فیکلٹیوں میں جس طرح کامیاب طالب علموں کو اسناد دی جاتی ہیں اسی طرح اردو ذریعہ امتحانات میں شریک ہونے والے کامیاب طلبہ کو بھی دی جائیں۔

(۴) کلکتہ یونیورسٹی میں ایک اردو شعبہ کا انتظام کیا جائے۔

(۵) شمالی یا مغربی ہند کی کسی ایک یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی بنایا جائے۔[3]

سر سید کے مشورے میں حکومت برطانیہ کو اپنا مفاد بھی نظر آیا۔اس نے سازش کے تحت کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر کے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا تا کہ ہندوستانی صرف دینی اور مشرقی تعلیم ہی میں الجھ کر رہ

جائیں لیکن سرسید کی دوررس نظر نے انگریزوں کی یہ چال سمجھ لی اور یونیورسٹی کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ وہ ہر گز نہیں چاہتے تھے کہ کلکتہ یونیورسٹی ختم ہو۔ وہ تو ہندوستانیوں کو اردو اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم وفنون سے بھی روشناس کرانا چاہتے تھے۔لہٰذا انہوں نے جدوجہد کر کے حکومت کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید نے انگریزوں کی سازش کو کچھ اس طرح بے نقاب کیا ہے:

''ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکہ میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم اور تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں؟ اور کس مطلب سے؟ اس کا جواب کسی پیرایہ اور کیسے ہی میٹھے لفظوں میں دیا جائے اس کا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی میں رکھنے کے لیے'' ۔[۴]

سرسید کی جدوجہد سے ہندوستانیوں میں جدید تعلیم اور مغربی علوم وفنون کے لیے بیداری پیدا تو ہوئی۔لیکن سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا کیوں کہ مغربی تعلیم پوری طرح انگریزی زبان پر منحصر تھی ۔لہٰذا انگریزی زبان سیکھنا ہماری ضرورت کے ساتھ ساتھ مجبوری بھی تھی ۔جس کے سبب سرسید نے انگریزی تعلیم کی طرف داری کی اور علمائے وقت کے نشانے پر آ گئے ۔ان سب کی پروا کیے بغیر سرسید نے اپنے تعلیمی کارواں کو علی گڑھ سے ایک نئی سمت عطا کی ۔اپنے عزیز دوستوں اور رفقا کے ساتھ مل کر ''مدرستہ العلوم'' کی بنیاد رکھی ۔آگے چل کر یہ مدرستہ العلوم ''محمڈن انگلو اورینٹل کالج'' بنا جو آج ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' کے نام سے پوری دنیا میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا ڈنکا بجا رہا ہے۔

دور حاضر گلوبلائزیشن کا دور ہے سائنس کی جدید دریافتوں نے جہاں انسان کے افکار ونظریات کو پرکھا ہے ۔ وہیں یہ سوال بھی کھڑا کیا ہے کہ ۲۱/ویں صدی میں ہمارے سماجی، سیاسی، مذہبی اور تعلیمی دانشوروں کے افکار ونظریات کی کوئی اہمیت ہے بھی یا نہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ آج کے بدلتے ہوئے حالات میں ان کے افکار ونظریات بے معنی ہو چکے ہیں۔لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ آج بھی ہمارے رہنماؤں کے افکار ونظریات اتنے ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنے ان کے دور میں تھے۔ اگر ہم سرسید احمد خاں کی بات کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ انیسویں صدی کے ایسے تابناک ستارہ ہیں ۔جس کی تعلیمی روشنی میں علم وحکمت، بصیرت وبصارت، دوراندیشی اور دانشوری نے کسی خاص قوم یا علاقے کو متاثر نہیں کیا بلکہ ایک پورے عہد کا رخ بدل دیا۔ سرسید کی ہمہ جہت شخصیت نے ۲۱/ویں صدی کے انقلابی دور کو بھی چیلنج کیا۔ ان کی فکر صرف ۱۹/ویں صدی تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ انہوں نے ۲۱/ویں صدی کے سائنسی انقلاب کو بخوبی پہچان لیا تھا۔ اسی لیے وہ گلوبلائزیشن کے اس دور کے لیے اپنی قوم کے نوجوانوں اور اپنی بیٹیوں کو جدید تعلیم دیکر تیار کرنا چاہتے تھے تاکہ قوم کا مستقبل روشن ہو سکے۔ سرسید کی وہ تعلیم آج بھی جاری وساری ہے۔ سرسید کی وسیع نظر نے ۲۱/ویں صدی یعنی گلوبلائزیشن کے اس دور کا تصور اپنی تحریروں میں تقریباً ۱۵۰ سال پہلے ہی پیش کر دیا تھا:



''سمندر کے اندر ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے، غیر ملکوں سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملک میں آڑتھ اور کمپنیاں قائم کریں۔ جس سے اعلیٰ درجے کے تاجر ہوں، ملک کی پیداوار، قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔ اس طریقہ سے کہ اپنے ملک میں اپنے ہی بھائی کا روپیہ لے کر فائدہ اٹھاویں، ملک میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ روپئے کو کبھی اس تھیلی میں اور کبھی اس تھیلی میں ڈالنے سے روپیہ بڑھ نہیں جاتا۔ جب تک کہ باہر سے لا کر اس میں روپیہ نہ ڈالا جائے۔ جب تم ایسا کرو گے اس وقت بے شک جس طرح ہمارے ملک کا رپیہ دوسرے ملک میں جاتا ہے ہم بھی دوسرے ملک کا رپیہ اپنے ملک میں کھینچ لاویں گے''[۵]

سرسید نے اپنی تقریروں، تحریروں، اخبارات ورسائل کے ذریعہ قدم درقدم ہندوستانیوں کو جدید سائنسی دور سے آگاہ کیا۔ اپنے مضامین کے ذریعے مغرب کے افکار ونظریات سے ہمیں واقف کرایا۔ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کر کے سرسید نے ہندوستان میں صحافت کا ایک نیا باب جوڑا۔ اپنے رفقاء کو جدید تعلیم کے لیے تیار کیا اور ان سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھوائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مذہب، سیاست، تاریخ، فلسفہ، علم کلام اور مغربی علوم سے نونہالانِ قوم فیض یاب ہونے لگے۔ سرسید نے اپنے افکار ونظریات کی روشنی سے انسانی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جسے منور نہ کیا ہو۔ آج پوری دنیا میں سرسید کی فکر کا بہ غور مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب سرسید صرف ہندوستانی قوموں کے رہنما نہیں بلکہ پوری انسانیت کے خیر خواہ تسلیم کیے جا چکے ہیں ۔لہٰذا سرسید کے افکار ونظریات کو کسی خاص عہد تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ کیوں کہ ان کے ۱۵۰/سال پہلے کے خیالات آج بھی زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور آئندہ بھی ان کی تعلیم اور فکری سرمائے کی اہمیت ومعنویت برقرار رہے گی۔

## حواشی

۱۔ انتخاب مضامینِ سرسید، ص ۸۹۔۸۸/ ۲۔ سرسید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب۔ سید اقبال علی، ص:۱۴۴
۳۔ سرسید کے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی افکار، مرتبہ شان محمد، ص ۵۵.۴۵ (پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر)/ ۴۔ رسالہ تہذیب الاخلاق، (سرسید کے مذہبی، تعلیمی اور سیاسی افکار، مرتبہ شان محمد، ص ۶۳)/ ۵۔ مقالاتِ سرسید حصہ ہشتم۔ ص ۱۳۱

Research Scholar
Dept: Of Urdu
A.M.U. Aligarh-202002(U.P)

● نوشاد کامران

# تحقیق اوراس کے مسائل

''تحقیق کسی امر کواس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے'' ۔[1]

یا یوں کہیے کہ حقائق کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔کسی امر یا شے کے متعلق ہمیں تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوتی ہے اگر چہ یہ بھی طے نہ ہو کہ وہ بعینہٖ وہی امر یا شے ہے لیکن اس کی کوئی حقیقت یا اصلی روپ وہ جو کچھ بھی ہو بہر حال ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔اس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ محض کسی داستان سرا کے فرمودات ،مختاراتی بڑ، قیاس آرائی کی بنیاد پر تحقیق کے موضوع کا انتخاب نہ کرنا چاہیے اور نہ ہی تحقیق کو آگے بڑھانا چاہیے، ورنہ سارے شوق اور محنت کا حاصل غیر معتبر نتیجہ ہوگا اور بعض حالات میں یہ مضحکہ خیز بھی ہوسکتا ہے۔

جہاں تک ادبی تحقیق کا تعلق ہے یہاں کسی بھی امر یا واقعہ کا اپنے عبوری دور میں چھوٹا یا بڑا، مفید غیر مفید ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔کوئی واقعہ یا شے جو اپنے دور میں نسبتاً کم درجہ رکھتی ہو بہت ممکن ہے کہ اگلے دقتوں میں کسی دوسرے سیاق میں اس کی اہمیت میں اضافہ ہوجائے ۔مثلاً آبرو اور ناجی اپنے دور کے بے شک بڑے اور عمدہ شاعروں میں گردانے جاتے تھے اور اس دور کے دیگر شعرا کی نسبت ان لوگوں کے کلام کی خاطر خواہ پذیرائی آج بھی ہوتی ہے ۔لیکن دیگر شعرا کا کلام بھی آج لسانی اعتبار سے آبرو، شاکر ،ناجی وغیرہ سے کم اہمیت نہیں رکھتے ۔لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادبی تحقیق کسی بھی ادبی واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کمتر کیوں نہ ہو، نظر انداز نہیں کرتی ۔ یہ ضرور ہے وہ اس واقعہ کی نوعیت یعنی حقیقی اور قیاسی کو دھیان میں رکھ کر قدم آگے بڑھاتی ہے۔ تحقیق کو اس بات سے انکار نہیں کہ جس واقعہ یا شے کے تعلق سے ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئی وہ موجود ہی نہیں یا وقوع پذیر ہی نہیں ہوئی ۔لیکن ادبی تحقیق میں جس واقعہ یا شے کی معلومات نہیں ہے اس کا وجود نہیں مانا جاتا۔اس میں اشیا کے بارے میں خواہ بہت چھوٹی معلومات ہو لیکن کچھ نہ کچھ معلوم ہونا ضروری ہے تبھی تحقیق کا کام آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

اگر تحقیق کے ضرورت کی بات کی جائے تو اس سلسلے میں عرض کر دینا ضروری ہے کہ وقت کے ساتھ بہت ساری چیزیں اپنی وقعت وحیثیت کھودیتی ہیں یا ان میں کمی آجاتی ہے۔اس کے لیے نہ صرف وقت ہی ذمہ دار ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات حالات بھی کسی شے کی قدر و قیمت کے تعین میں غیر معمولی کردار ادا کرتے



ہیں۔لہٰذا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ حالات یا وقت کے بدلنے کے ساتھ اشیا کی از سر نو تحقیق کر کے ترتیب دی جائے تا کہ اس کی اصلی شکل واضح ہوسکے ۔ جو وقت اور حالات کے ہاتھوں خلط ملط کر دی گئی تھی ۔اس تعلق سے شواہد و دلائل کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ دھیان رکھنا ہوتا ہے کہ جو شہادتیں پیش کی جارہی ہیں اور جو معلومات حاصل کی جارہی ہیں وہ بنائے استدلال کی تاب لاسکتی ہیں یا نہیں ، یا جن شواہد سے کام لیا جارہا ہے ان میں تاحال معلومات کے مطابق کسی شک ، شبہے کی گنجائش تو نہیں ہے ۔اگر دلائل وشواہد اور ماخذ قابل اعتماد ہیں تو اس تحقیق سے ادب میں اضافہ ہوگا ورنہ ایک اور تحقیق کا موضوع اگلے دقتوں کے لیے پیدا ہو جائے گا۔
رشید حسن خان نے اپنی کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' میں ایک مثال سے اس بات کی وضاحت کی ہے:

> ''یہ بات سچ ہے کہ امیر خسرو نے ہندوی میں بھی شعر کہے ہیں، اس سلسلے میں ان کا اپنا بیان موجود ہے۔لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ شعری سرمایہ کہاں ہے۔خسرو کی جو مستند تصانیف ہمارے پاس ہیں ان میں یہ ہندوی کلام موجود نہیں ۔معاصر تصانیف بھی ایسے کلام سے خالی ہیں ۔اب صورت حال یہ ہے کہ بہت سا کلام ان سے منسوب کیا جاتا ہے ( دوہے، پہیلیاں ، کہہ مکرنیاں وغیرہ ) مگر آج تک کسی شخص نے کوئی ایسی سند پیش نہیں کی ہے جس کی بنا پر اس کلام کا انتساب صحیح مانا جائے۔'' [2]

اس صورت حال میں خسرو کا ہندوی کلام مشکوک ہوجاتا ہے ۔اگر چہ یہ بات مسلم ہے کہ انھوں نے ہندوی میں شعر کہے تھے۔مگر وہ شعری سرمایا آج تک دستیاب نہیں ہوسکا نہ اس کے بارے میں کوئی شخص معتبر حوالے یا سند پیش کر سکا۔مثلاً ایک دوہے کے سلسلے میں مشہور دکنی کتاب ''سب رس'' کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔لیکن ''سب رس'' اور امیر خسرو میں ایک بڑا زمانی وقفہ ہے اور ملا وجہی نے بھی دوہے کے بارے میں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔جس سے اس کی صحت مشکوک ہوجاتی ہے ۔یہی حال میر کے تذکرے ''نکات الشعرا'' اور مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' کا ہے۔ان لوگوں نے بھی خسرو کے ہندوی کلام نقل کیے ہیں لیکن اس بات کا کوئی اشارہ نہیں کیا کہ انھوں نے امیر خسرو کا یہ کلام کہاں سے حاصل کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غیر معتبر حوالوں اور سند کی بنیاد پر حاصل کیا ہوا نتیجہ مشکوک اور نا قابل اعتنا رہتا ہے۔تاوقتیکہ تحقیق کے ذریعہ اس کی حقیقت سامنے نہ آجائے۔ایک بات اور واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ تحقیق میں کوئی چیز حرف آخر کا حکم نہیں رکھتی۔ تحقیق ایک سلسلہ وار عمل ہے۔چونکہ وقت کے ساتھ ہمیں معلومات کے نئے وسائل میسر آتے جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ ہماری معلومات کا ذخیرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اس لیے ہماری تحقیقی بصیرت بھی مرتقی ہوتی جاتی ہے اور ہم تحقیق کرتے ہوئے کسی شے کی اصلیت کے اور قریب ہوتے جاتے ہیں۔میں نے ابھی عرض کیا کہ تحقیق میں کوئی چیز حرف آخر کا دعویٰ نہیں رکھتی اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ

پردہ در پردہ چیزیں دریافت ہوتی جاتی ہیں۔موجودہ وقت تک جو دریافت ہو چکی ہوتی ہے اسے عام طور پر مستند مانا جاتا ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ اس موضوع پر تحقیق کے راستے مسدود یا بند ہو گئے۔نئی تحقیق کے ذریعہ معلوم شدہ حقیقت کی تکذیب بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ محض روایات اور قیاس آرائی کو بنیاد بنا کر تحقیق کو آگے بڑھایا جائے۔قیاس کی بنیاد پر تحقیق اسی وقت آگے بڑھ سکتی ہے جب قیاس کو منطق کی تائید حاصل ہو۔ورنہ قیاس کو بنیاد بنا کر تحقیق نہیں کی جا سکتی۔البتہ روایت کا معاملہ ذرا دوسرا ہے۔اس میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ راوی کون ہے اور صحت روایت کیسی ہے۔اگر تحقیق کسی شخص کے بارے میں ہو رہی ہے اور اس روایت کو بنیاد بنایا گیا ہے جس میں مذکورہ شخص کی تعریف و توصیف کے پہلو نکلتے ہیں اور راوی خود مذکورہ شخص ہے تو گمراہی کے امکان زیادہ ہو جاتے ہیں۔غالب کے معاملے میں زیادہ تر غلط فہمیاں اسی بنا پر سامنے آئی ہیں۔نئی تحقیق نفی میں بھی ہو سکتی ہے اور معلوم شدہ حقائق کی سالمیت میں معاون بھی ہو سکتی ہے۔غرض یہ کہ تحقیق کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے اور پرانے مسلمات کی تکذیب و تصدیق جاری رہتی ہے۔

تحقیق کو غالباً تمام ہی محققین نے وادیِ پر خار کہا ہے۔اس کا پر پیچ راستہ دشواریوں سے بھرا ہوا ہے۔اے۔سی۔کے کمروں میں آرام کی کرسی پر بیٹھ کر خیالوں کے ایوان تو سجائے جا سکتے ہیں مگر تحقیق کے میدان میں مثبت اضافے کے لیے شوق فرہاد اور صبر ایوب درکار ہے۔ہمارا قدیم ادبی سرمایہ فارسی میں ہے۔جس میں تذکرے روزنامچے، بیاضیں اور مکاتیب و فرامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔اگر تحقیقی کام کرنے والا زمانۂ قدیم کے کسی موضوع پر تحقیق کر رہا ہے (اور اصل تحقیق زمانۂ قدیم کے موضوعات پر ہی ہوتی ہے ) تو اسے تذکروں، روزنامچوں، مکاتیب اور فرامین کے راستے سے لامحالہ گذرنا پڑے گا۔اب یہ تحقیق کار پر منحصر ہے کہ وہ فارسی زبان سے کس قدر واقف ہے۔عام طور پر حالت یہ ہے کہ آج کے دور میں زیادہ تر لوگ فارسی زبان سمجھنے سے قاصر ہیں۔چونکہ تحقیق کار کو تذکروں بیاضوں ،مکتوبات اور روزنامچوں سے کسی صورت مفر نہیں ہے اس لیے چارو ناچار تراجم کی طرف رجوع کرتا ہے۔اور اسے بنیادی ماخذ کی جگہ پر استعمال کرتا ہے۔بات بظاہر آسان معلوم ہوتی ہے۔مگر ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ترجمہ اصلی متن کی جگہ لے سکتا ہے۔ایمانداری سے کئے ہوئے ترجمے اور اصل متن کی مثال یوں دی جاتی ہے کہ ایک گلاس میں بھرے پانی کو کتنی ہی صفائی سے دوسرے گلاس میں پلٹا جائے لیکن تھوڑا پانی گلاس میں رہ ہی جاتا ہے۔خواہ وہ قطرے کا عشر عشیر ہی کیوں نہ ہو۔انصاف کے ساتھ کئے گئے ترجمے کا یہ عالم ہے تو کاروباری اداروں کے ذریعہ کئے ہوئے ترجموں پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔رشید حسن خاں فرماتے ہیں:

''......جواب بہت صاف اور واضح ہے اور وہ یہ کہ ترجمے کو اصل ماخذ کی حیثیت سے نہ پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ قبول کیا جا سکتا ہے۔تصنیف اور ترجمہ دو مختلف



چیزیں ہیں۔اصل تصنیف کو اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔مگر اس کے ترجمے کی حیثیت ثانوی ماخذ کی ہوگی۔اور اس صورت میں یہ معلوم ہے کہ اصل ماخذ کے مقابلے ثانوی ماخذ کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔'' ۳

اگر یہ بالفرض محال مان بھی لیا جائے کہ ترجمے یعنی ثانوی ماخذ کے انحصار پر ہی کام کو آگے بڑھایا جائے تو بھی بات بنتی نظر نہیں آتی۔کیونکہ تحقیقی نظر ترجمے کی صحت اور صاحب ترجمہ سے بحث کرنا شروع کر دیتی ہے۔کیونکہ تحقیق مترجم کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔وہ یہ دیکھتی ہے کہ ترجمہ کسی معروف و معتبر شخص نے کیا ہے یا کسی چلتے پھرتے عالم حضرت نے یا کسی تجارتی ادارے نے۔ان سب سے صحت ترجمہ الگ الگ طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ایک تجارتی ادارے ''نفیس اکیڈمی'' پاکستان، نے شیفتہ کے تذکرے ''گلشن بے خار'' کا ترجمہ شائع کیا جس میں بے انتہا غلطیاں ہیں۔رشید حسن خاں نے متعدد غلطیاں اس ترجمے کے سلسلے میں گنوائی ہیں یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔یہی صورت دیگر کاروباری حلقوں کا ہے۔اب اگر کوئی محقق اصل متن سمجھے بغیر تراجم پر انحصار کرتا ہے تو تحقیق حقیقت میں مشکوک ہی رہے گی۔جامعات میں تحقیق کرنے والے طلبا کی دلچسپی جلد از جلد مقالہ پورا کر کے نوکری حاصل کرنے میں ہوتی ہے۔ان کا رجحان ادب میں اضافے کی طرف بہت کم ہی ہوتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ جامعات میں تحقیق کا معیار متاثر ہو رہا ہے۔تحقیق مواد تک رسائی اور فراہمی جیسے خارجی مسائل کے علاوہ ایک بڑا داخلی مسئلہ نیت اور شوق کا ہے۔تحقیق صرف اور صرف حق کی تلاش اور جستجو کے لیے کی جائی چاہیے نہ کہ کسی مالی منفعت، روزگار کے لالچ یا کسی عہدے پر فائز ہونے کی غرض سے جن حضرات کو دولت اور شہرت عزیز ہے انھیں اس جانکاہی کے چکر میں نہ پڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے۔تحقیق کو عجلت پسندی، ریاکاری، آسان پسندی اور بولہوسی سے سخت بیر ہے۔یہاں صبر و قناعت، سخت کوشی اور نفس کشی کی ضرورت ہے۔تحقیق میں آدمی بس تحقیق کا ہو رہتا ہے۔ہر گھڑی ایک دھن اور ایک ہی آرزو ہونی چاہیے۔اس کے بغیر تحقیق میں اعتدال کی صورت ممکن نہیں۔

**حواشی**: ۱ قاضی عبدالودود بحوالہ ''تحقیق کا فن''، گیان چند جین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، بہ اشتراک اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص۔۱۹/ ۲ ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' رشید حسن خاں، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ص۔۱۲۔۱۳/ ۳ ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' رشید حسن خاں، اتر پردیش اردو کادمی لکھنؤ، دوسرا ایڈیشن، ص۔۲۱

Dept. of Urdu
Allahabad University, Allahabad UP 211002

● **ممتحنہ اختر**

# شبلی کی تنقید پر حالی کے اثرات

حالی کے دور میں جو نقاد ان کے تنقیدی تصورات سے متاثر ہوئے اور اسی نہج پر اپنے شعری نظریات کا اظہار کیا ان میں مولانا شبلی نعمانی اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔شبلی، حالی کے ہم عصر بھی تھے اور ان ہی کی طرح سرسید تحریک کے عظیم رفقاء میں سے بھی تھے۔اس لیے سرسید اور اس وقت کے ادب اور زندگی کے عام رجحانات کے اثرات ان پر بھی نمایاں ہیں۔انہوں نے تاریخ، مذہب اور ادب تینوں کی طرف توجہ کی۔تنقید میں بھی ان کا ایک خاص مرتبہ ہے۔انہوں نے حالی کی طرح نظری اور عملی دونوں قسم کی تنقیدوں کی طرف توجہ کی۔شبلی کے تحقیقی اور تنقیدی کارناموں میں ''بیان خسرو''، ''سوانح عمری مولانا روم''، ''موازنہ انیس و دبیر'' اور ''شعرالعجم'' کی پانچ جلدیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ان کے تنقیدی خیالات ان تمام تصانیف میں بکھرے پڑے ہیں۔لیکن باضابطہ اور منظم طریقے سے ان کے تنقیدی تصورات ''شعرالعجم'' کی چوتھی جلد کے پہلے حصے میں نظر آتے ہیں جو ان کے تنقیدی مسلک پر خاص طور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

شبلی نے اپنے شعری نظریات میں سب سے پہلے شعر کی ماہیت یا حقیقت سے تفصیلی بحث کی ہے۔ان کے خیال میں شعر ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے اس لیے اس کی جامع اور مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔شاعری کی حقیقت یا اس کی تعریف پیش کرنے میں انہوں نے مختلف بیانات سے کام لیا ہے۔لیکن ان بیانات میں وہ کئی جگہوں پر تضاد کا شکار ہو گئے ہیں جس وجہ سے ان کے یہاں شعر کی کوئی جامع تعریف نظر نہیں آتی ہے۔

وہ احساس کو شاعری کا دوسرا نام دیتے ہیں'' [1] پھر لکھتے ہیں کہ ''یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے'' [2] آگے چل کر انسان اور حیوان کے احساس کا ذکر کرتے ہوئے شعر کی تعریف ان لفظوں میں بھی کرتے ہیں کہ ''انسان کے پاس جانوروں سے بڑھ کر ایک قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی۔اس لیے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے'' [3] منطقی پیرایہ میں بھی وہ شعر کی تعریف دو طریقے سے کرتے ہیں لکھتے



ہیں ''جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں'' [4] چونکہ یہ الفاظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں اسی لیے آخر میں وہ اس تعریف پر پہنچتے ہیں ''جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے'' ایک یورپین محقق کا قول نقل کرتے ہوئے وہ شعر کی یہ تعریف بھی کرتے ہیں:

''ہر چیز جو دل پر استعجاب یا حیرت یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے''

شعر کی تعریف وہ ان الفاظ میں بھی کرتے ہیں ''یہ شخص (جس نے جنگل میں اچانک شیر کو دیکھا) کسی کے سامنے شیر کا حلیہ، شکل وصورت جن مؤثر لفظوں میں بیان کرے گا وہ شعر ہے'' [5] لیکن اس کے بعد شاعری اور واقعہ نگاری یا خطابت اور شاعری کے فرق میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''اصلی شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو..... شاعری تنہا نشینی اور مطالعہ نفس کا نتیجہ ہے''

شبلی نے شعر کی حقیقت یا اس کی تعریف میں جو بیانات پیش کئے ہیں ان سے یہ بات تو سامنے آتی ہے کہ جذبات واحساسات کو مؤثر الفاظ میں پیش کرنے کا نام شاعری ہے۔لیکن یہ بات سامنے نہیں آتی کہ ان جذبات واحساسات کو پیش کرنے والا ''کوئی بھی'' ہوتا ہے یا ''کوئی خاص'' یعنی ''شاعر'' بلکہ شبلی کے بیانات سے یہ خیال سامنے آتا ہے کہ ہر وہ انسان شاعر ہے جو کسی بھی متاثر شدہ واقعہ کو مؤثر الفاظ میں پیش کرے۔جب کہ شاعر کے جذبات اور عام انسان کے جذبات میں بہت فرق ہوتا ہے۔شاعری ایک فن ہے اور شاعر فنکار اس میں کسی بھی واقعہ سے متاثر ہو کر اسے مؤثر الفاظ میں پیش کرنے اور سامعین کے جذبات کو مشتعل کرنے یا برانگیختہ کرنے کی ایک قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔شاعری اس کے احساسات اور جذبات کی ترجمان ہوتی ہے۔وہ احساسات اور جذبات کو مؤثر اور موزوں الفاظ میں پیش کرنے کا ماہر ہوتا ہے۔اس کا فن اسی بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ متاثر شدہ واقعات کو مؤثر اور متنوع الفاظ میں پیش کرے۔گو شعر کی حقیقت یا شعر کی پہچان یا اس کی تعریف شاعر کی پہچان اس کی حقیقت، اس کی تعریف میں پوشیدہ ہے۔جب کہ شبلی کے یہاں شعر کی تعریف میں شعر کا سرچشمہ یعنی شاعر ہی غائب ہے اور مختلف جگہوں پر متضاد خیالات سامنے آتے ہیں۔

حالی نے بھی شاعری کے لیے جذبات اور اس کی تاثیر کو بنیادی اہمیت دی ہے لیکن ان کے یہاں شاعری کا منبع یعنی شاعر مجروح نہیں ہوتا بلکہ انہوں نے شعر کی حقیقت پیش کرنے کے لیے شاعر کو ہمیشہ پیش پیش رکھا ہے۔

شبلی کے خیال میں شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب فنون سے زیادہ وسیع ہے یہ باقی فنون کے مقابلے میں تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

''جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں' بہت سی ہیں' موسیقی' مصوری' صنعت گری وغیرہ' لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے ..... شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے باصرہ' ذائقہ' شامہ' لامسہ سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں''

شبلی کا یہ خیال بالکل صحیح ہے شاعری میں بے شک یہ تاثیر ہوتی ہے کہ یہ انسان کے سبھی حواس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ حالی نے بھی شعر کی ماہیت میں لارڈ مکالے کی تعریف سے استفادہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ ''شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی' مصوری اور ناٹک یہ تینوں فن اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے''

شبلی شاعری کا نمایاں وصف جذبات انسانی کے برانگیختہ کرنے اور انہیں تحریک میں لانے کو مانتے ہیں اور اس خصوصیت کی وجہ سے وہ اسے تمام سائنس اور علوم وفنون سے ممتاز مانتے ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ شاعری چونکہ جذبات انسانی سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس کی حد اندرونی جذبات اور احساسات تک ہوتی ہے۔ شبلی اس سلسلے میں تاریخ اور خطابت کو بھی شاعری سے الگ چیز قرار دیتے ہیں۔ تاریخ ان کے نزدیک علمی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس میں تاثیر نہیں ہوتی اور خطابت میں خطیب شاعری کی طرح جذبات کو برانگیختہ تو کرتا ہے۔ لیکن اس کا فعل وعمل شاعر کے مقابلے میں شعوری ہوتا ہے۔ جبکہ شاعر کے جذبات بے اختیار' بے ساختہ اور لاشعوری ہوتے ہیں۔

حالی نے بھی شعر کی ماہیت میں لارڈ مکالے کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ خیالات پیش کئے ہیں کہ ''شاعری نفس انسانی کی باریک اور گہری اور بوقلموں کیفیات پیش کرتی ہے'' [2] لیکن حالی شبلی کے مقابلے میں اندرونی دنیا کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا کو بھی شعر کی حد میں لاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ ''شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی اور ذہنی کا نقشہ اُتار سکتی ہے'' [1] اس کے علاوہ حالی جذبات کے برانگیختہ کرنے کو قومی وملی اصلاح تک لے جاتے ہیں اور شاعری کے اس مقصد پر بحث کرتے ہیں جبکہ شبلی اس طرف جاتے ہوئے نہیں معلوم ہوتے کیونکہ انہوں نے شعر العجم میں شاعری کی قومی وملی حیثیت سے کہیں تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی ہے' لیکن وہ اس معاملے میں حالی کی ہم خیال ہیں کہ شاعری صرف تفریح یا تفنن طبع کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ شعر ایک قوت ہے جس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے



ہیں بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور کیا جائے۔

شبلی کے نزدیک شاعری کے اصلی عناصر محاکات اور تخیل ہیں اس کے ساتھ ہی وہ شاعری میں وزن' شیریں اور سادہ الفاظ' تشبیہ واستعارات خیال بندی اور طرز ادا کی جدت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں لیکن محاکات اور تخیل کو وہ بنیادی جُز تسلیم کرتے ہیں۔ محاکات ان کے نزدیک یہ ہے کہ ''کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے'' لیکن یہ تصویر ان کے خیال میں تخئیل کی مدد ہی سے دلکش ہوتی ہے اور اس کا حسن پورا نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی' نہ اصل سے زیادہ دور ہوسکتا ہے' ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی اس موقع پر اس کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے'' [1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ محاکات اور تخئیل دونوں شعر کے عنصر ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخیل کا نام ہے۔ محاکات میں جو جان آتی ہے تخیل ہی سے آتی ہے' ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں۔ قوت محاکات کا یہ کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے اس کو الفاظ کے ذریعے سے بعینہ ادا کردے' لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا' تناسب اور توافق کو کام میں لانا ان پر آب ورنگ چڑھانا قوت تخیل کا کام ہے''

تخئیل پر شبلی نے خاصی تفصیل سے بحث کی ہے اور مختلف طریقوں سے اس کی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے لیکن یہاں بھی وہ شعر کی تعریف کی طرح تخئیل کی کوئی جامع تعریف پیش نہیں کر پائے ہیں چنانچہ انہوں نے شروع میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ''اس قسم کی چیزوں کی منطقی جامع اور مانع تعریف ہو بھی نہیں سکتی'' [3] تاہم انہوں نے تخئیل کے بارے میں کافی اہم نکتے پیش کئے ہیں جن سے ان کی طبع سلیم اور بلند سوچ کا پتہ چلتا ہے اور شاعری کے ساتھ ساتھ مختلف علوم میں اس کی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

شبلی تخئیل کو قوت اختراع کا نام دینے میں اور ہنری لوئیس کے اس قول سے اتفاق نہیں کرتے کہ قوت تخئیل اس قوت کا نام ہے جو غیر مرئی اشیاء کو ہماری نظر کے سامنے کردے۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک طرف سائنس اور فلسفہ میں ایجاد وانکشاف مسائل کا کام دیتی ہے اور دوسری طرف

شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔لیکن سائنس اور فلسفہ کے مقابلے میں شاعر کو اس سے استعمال میں لانے کا طریقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔شبلی شاعری میں تخیّل کی اہمیت اور اس کے استعمال پر مختلف طریقے سے اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ۱۔''شاعر کے سامنے قوت تخیّل کی بدولت تمام بے حس اشیاء جاندار چیزیں بن جاتی ہیں اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آئندہ صدائیں آتی ہیں۔زمین' آسمان' ستارے بلکہ ذرّہ ذرّہ اس سے باتیں کرتا ہے''
>
> ۲۔''قوت تخیّل کے ذریعہ سے اکثر شاعر ایک نیا دعویٰ کرتا ہے اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے' ممکن ہے کہ ایک منطق اس کی دلیل نہ تسلیم کرے' لیکن جن لوگوں کو وہ قوت تخیّل کے ذریعہ سے معمول کر لیتا ہے وہ اس سے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں کرتے''
>
> ۳۔''تخیّل مسلم اور طے شدہ باتوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ دوبارہ ان پر تنقید کی نظر ڈالتی ہے اور بات میں بات پیدا کرتی ہے''
>
> ۴۔''قوت تخیّل ایک چیز کو سوسو دفعہ دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اس کو اس میں ایک نیا کرشمہ نظر آتا ہے''
>
> ۵۔''شاعر قوت تخیّل سے تمام اشیاء کو نہایت دقیق نظر سے دیکھتا ہے وہ ہر چیز کی ایک ایک خاصیت' ایک ایک مشترک اوصاف کو ڈھونڈ کر ان سب کو ایک سلسلہ میں مربوط کرتا ہے۔کبھی اس کے برخلاف جو چیزیں یکساں اور متحد خیال کی جاتی ہیں' ان کو زیادہ نکتہ سنجی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں فرق اور امتیاز پیدا کرتا ہے۔''

محاکات اور تخیّل کے بارے میں شبلی کے یہ تمام خیالات بہت اہم ہیں۔ان سے شاعری کے مختلف دقیق و آسان اوصاف کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔شعر انہیں سے مرکب ہوتا ہے۔البتہ اس میں فنی پہلو پیدا کرنے کے لیے بندش شیریں' سادہ اور مترنم الفاظ وغیرہ کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

تخیّل پر شبلی کے خیالات کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے حالؔی کے تصورات سے کافی اثرات قبول کئے ہیں۔تخیّل پر دونوں نے بحث کی ہے۔مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کو دونوں نے تخیّل کے لیے لازمی قرار دیا ہے' دونوں نے تخیّل کی بے اعتدالی پر اصلاح سے کام لیا ہے۔فرق



صرف اتنا ہے کہ جہاں حالؔی نے تخیّل کی اصلاح قوت ممیّزہ کے تابع رکھنے سے کی ہے۔وہیں شبلی نے تخیّل کی بے اعتدالی کے تحت اس میں اصلاح پر زور دیا ہے۔مختصراً دونوں کا موقف ایک ہے لیکن دونوں کے استدلال کا طریقہ مختلف ہے۔

شبلی نے تشبیہہ و استعارات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے''ان کے نزدیک تشبیہہ و استعارہ شاعری بلکہ عام زبان آوری کے خط و خال ہیں جن کے بغیر انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا'' [۱] ان کا ماننا ہے کہ اکثر موقعوں پر کلام میں جو وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے وہ تشبیہہ و استعارہ کی بدولت ہوتا ہے۔ ''شاعر تشبیہہ و استعارہ کی بدولت بعض موقعوں پر کلام میں کوئی غیر معمولی دعویٰ کرتا ہے تو اس کے ممکن الوقوع ثابت کرنے کے لیے تشبیہہ و استعارہ سے کام لیتا ہے'' [۲] اس کے علاوہ جب کسی نازک اور لطیف چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو تشبیہہ و استعارہ سے بڑھ کر کوئی عام الفاظ ان خیالات کو پیش نہیں کر سکتا۔چنانچہ انہوں نے بہت ہی لطیف انداز سے ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''جب کسی نازک اور لطیف چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو الفاظ اور عبارت کام نہیں دیتی اور یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نے اگر ان کو چھوا تو ان کو صدمہ پہنچ جائے گا جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے ایسے موقعوں پر شاعر کو تشبیہہ سے کام لینا پڑتا ہے وہ اسی قسم کی لطیف اور نازک صورت کو ڈھونڈ کر پیدا کرتا ہے اور پیش نظر کر دیتا ہے''

تشبیہہ و استعارہ کے استعمال اور تاثیر کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی مشورہ دیتے ہیں کہ شاعر کو ہمیشہ نادر اور جدید تشبیہات پیش کرنی چاہیں تا کہ شاعری میں ان سے حسن' تازگی' ندرت و جدت پیدا ہو۔

شبلی جدت و لطیف ادا کو شاعری کا دوسرا نام دیتے ہیں ان کے نزدیک'' شاعری' انشا پردازی' بلاغت ان تمام چیزوں کی جادوگری اسی جدت ادا پر موقوف ہے'' [۲] ان کا ماننا ہے کہ جدت سے خیال میں ایک نیا اثر پیدا ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ تشبیہہ میں ندرت کو بنیادی وصف قرار دیتے ہیں۔انہوں نے مختلف مثالوں سے شعر میں جدت تشبیہہ و الفاظ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔شعر میں لفظ زیادہ اہم ہے یا معانی اس کی بحث مشرقی شعر و ادب میں قدیم سے چلی آ رہی ہے۔اس سلسلے میں عرب علماء دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔ایک لفظ کو اہمیت دیتے ہیں اور دوسرے معنی کو اردو میں سب سے پہلے حالؔی نے اپنی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔حالؔی لفظ اور معنی دونوں کی اہمیت کے قائل ہیں مگر ان کا جھکاؤ معنی کی طرف زیادہ ہے۔حالؔی کے بعد شبلی نے لفظ و معنی پر بحث کی ہے۔مگر ان کا جھکاؤ معنی

سے زیادہ لفظ کی طرف زیادہ ہے۔ اگرچہ انہوں نے ابن رشید کی کتاب ''العمدہ'' میں ''باب فی اللفظ و المعنی'' کے لحاظ سے لفظ اور معنی دونوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے شعر میں لفظ ہی کی اہمیت کو بڑا جان کر یہ خیال قائم کیا ہے کہ ''زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعر کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے اور بندش کیسی ہے'' ۱؎ اور پھر آگے یہ موقف اختیار کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے۔ گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے۔ ان ہی مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا''

معنی کی اہمیت وہ صرف ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

''اس تقریر کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کو صرف الفاظ سے غرض رکھنی چاہیے اور معانی سے بالکل بے پرواہ ہو جانا چاہیے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ مضمون کتنا ہی بلند اور نازک ہو لیکن اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر نہ پیدا ہو سکے گی۔''

اس بیان سے اگر یہ مان لیا جائے کہ شبلی، حالی کی طرح لفظ و معنی دونوں کی اہمیت کے قائل ہیں مگر شبلی نے حالی کی طرح معنی کی اہمیت پر اس کے بعد کہیں بھی واضح انداز سے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ بلکہ انہوں نے الفاظ ہی کے انواع و اقسام کو زیر بحث رکھا ہے بلکہ انہوں نے الفاظ کی اہمیت پیش کرنے کے لیے مضمون بھی ''حسن الفاظ'' کے نام سے ہی قائم کیا ہے جس سے معنی کی اہمیت پس پشت رہ گئی ہے۔

اس ضمن میں شبلی نے سادگی ادا پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں بھی شبلی نے معنوی پہلو سے زیادہ صوری پہلو کو اہمیت دی ہے چنانچہ اس لحاظ میں وہ حالی کے ہم خیال بھی نظر آتے ہیں۔ حالی کی طرح شبلی نے بھی شعر میں الفاظ کے روزمرہ اور عام بول چال کے مطابق ہونے کی تلقین کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''سادگی ادا میں اس بات کا دخل ہے کہ روزمرہ اور بول چال کا زیادہ لحاظ رکھا جائے''

ایک اور جگہ حالی ہی کی طرح سادگی کے معیار کے خیال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''سادگی یہی ہے کہ عام و خاص دونوں بے تکلف سمجھ سکیں فرق جو ہوگا



یہ ہوگا کہ عام آدمی شعر کا ظاہری اور سرسری مطلب سمجھ لیں گے لیکن خواص کی نظر اس کے نکات لطائف اور دقائق تک پہنچے گی اور ان پر شعر کا اثر عوام سے زیادہ ہوگا۔''

شبلی کے ان تمام خیالات کا جو انہوں نے محاکات، تشبیہہ واستعارہ حسن الفاظ، سادگی ادا وغیرہ میں پیش کیے ہیں اگر مجموعی تاثر لیا جائے گا تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ شعر کے معنوی پہلو سے زیادہ اس کے صوری پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں یا اس کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ شبلی کا یہ طرز فکر ان کے مشرقی ذہن و مشرقی فکر پر دلالت کرتا ہے۔ بقول عبادت بریلوی:

''شاعری کی اس صوری پہلو کو زیادہ اہم سمجھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ شبلی نے جدت ادا تشبیہہ واستعارہ، سادگی ادا وغیرہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ کی جائے، اس طرح کی بحثوں سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کا مزاج مشرقی تھا اس وجہ سے وہ ان مشرقی اصطلاحات تنقید پر بہت زور دیتے ہیں''

شعر کی خوبی میں حالی نے اصلیت پر جو بیانات پیش کئے ہیں، شبلی نے بھی واقعیت کے تحت ان کا تتبع کیا ہے۔ شبلی بھی واقعیت سے معنیٰ شعر میں اصلیت اور سچائی کے لیتے ہیں۔ لیکن حالی کے مقابلے میں انہوں نے واقعیت یا اصلیت اور جھوٹ یا مبالغہ دونوں کی خوبی پر تفصیل سے بحث کی ہے اور شعر میں دونوں کے استعمال اور اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

شبلی شعر میں اصلیت اور مبالغہ دونوں کے قائل ہیں۔ وہ شعر میں مبالغہ کو تخیل کی کارفرمائی کہتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ مبالغہ میں اگر کوئی حسن پیدا ہوتا ہے تو تخیل کی بنا پر ہوتا ہے نہ اس لیے کہ وہ جھوٹ اور مبالغہ ہے۔ اس لیے وہ شعر میں مبالغہ یا جھوٹ کی خوبصورتی کو بھی اہم مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے شعر کی دو قسموں سے بھی بحث کی ہے تخئیلی اور غیر تخئیلی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''شعر کی دو قسمیں ہیں تخئیلی اور غیر تخئیلی۔ تخئیل میں واقعہ سے غرض نہیں ہوتی بلکہ زیادہ تر یہ مطمع نظر ہوتا ہے کہ قوت تخئیل کس قدر پرزور اور وسیع ہے۔ اس بنا پر اس قسم کی شاعری میں مبالغہ سے کام لیا جائے تو بدنما نہیں، لیکن وہاں بھی سامعین کی طبیعت پر استعجاب کا جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ مبالغہ کی وجہ سے نہیں، بلکہ قوت تخئیل کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن اور اقسام شاعری مثلاً فلسفیانہ، اخلاقی، تاریخی، عشقیہ، نیچرل، ان میں مبالغہ بالکل لغو چیز ہے۔ اس لیے اگر شعر میں مبالغہ جائز بھی ہو تو صرف شعر کی ایک

خاص نوع (تخئیل) میں ہوگا۔اس سے عام خوبی نہیں ثابت ہوسکتی''

اور پھر آگے یہ مواقف اختیار کرتے ہیں:

''شاعری سے اگر صرف تفریح خاطر مقصود ہوتو مبالغہ کام آسکتا ہے' لیکن وہ شاعری جوایک طاقت ہے' جوقوموں کوزیروزبر کرسکتی ہے' جوملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے' جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے۔جس سے نوحہ کے وقت درودیوار سے آنسونکل پڑتے تھے' وہ واقعیت اوراصلیت سے خالی ہوتو کچھ کام نہیں کرسکتی''

شبلی کی یہی خوبی اسے حالی کے بخلاف ایک جمالیاتی نقاد کے طور پر لا کھڑا کرتی ہے وہ بھی شعر کے اخلاقی' افادی یا اصلاحی پہلو کے قائل ہیں لیکن وہ شعر سے دلی مسرت اور تفریح خاطر بھی مقصود لیتے ہیں۔ان کے یہاں شاعری ایک آزادانہ حیثیت سے سامنے آتی ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں وہ شاعری کوایک شفاف Transparence صورت میں سامنے لاتے ہیں جو اپنے آپ کو ہر رنگ میں قبول کرتی ہے لیکن اس کی ذات یا اصلیت ہر رنگ سے آزاد ہے۔

شعر کی تاثیر میں بھی حالی اور شبلی دونوں کے خیالات ایک جیسے ہیں۔دونوں اسے جذبات و احساسات سے اظہاراوراوروں کے جذبات واحساسات کے برانگیختہ کرنے کا ذریعہ مانتے ہیں۔دونوں کے یہاں اس کی تاثیر پر ایک جیسے بیانات ملتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ حالی نے ان تمام بیانات کو شعر کی عظمت کے تحت ایک یورپین محقق کے بیانات کے طور پر پیش کیا اور شبلی نے خاصی تفصیل سے کام لے کر ان پر علیحدہ خودروشنی ڈالی ہے۔لیکن دونوں کے یہاں جوفرق نمایاں نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ حالی کے خیالات ان کے اصلاحی اوراخلاقی مشن کے تحت دب جاتے ہیں جب کہ شبلی کے خیالات آزادی اختیار کر لیتے ہیں۔

''شعرالعجم'' کے علاوہ شبلی کی ایک اور شاہکار تصنیف ''موازنہ انیس ودبیر'' میں بھی ان کے کچھ تنقیدی خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔اس کتاب میں انہوں نے اردو کے دومشہور مرثیہ گوشاعر مرزا انیس اور مرزا دبیر کے کلام کا آپس میں مقابلہ کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے اپنے بتائے ہوئے اصولوں سے کام لیا ہے اور انہی کی روشنی میں ان دونوں کی شاعری پر بحث کی ہے۔عملی تنقید کے لحاظ سے یہ ان کی بہترین تصنیف ہے اور بقول کلیم الدین احمد:

''اس میں وہ حالی سے ایک قدم آگے بڑھے اور ''موازنہ انیس ودبیر'' کا اثر بھی ''شعرالعجم'' سے زیادہ ہوا اور جوسانچہ شبلی نے پیش کیا اسے آج بھی اردو نقاد استعمال کرتے ہیں۔''



''موازنہ انیس ودبیر'' میں بھی شبلی ان ہی خیالات کو زیادہ تر پیش نظر رکھتے ہیں جو انہوں نے '' شعرالعجم'' میں پیش کئے ہیں۔یہاں بھی انہوں نے شاعری کے معنوی پہلو سے زیادہ اس کے صوری پہلو کو اہمیت دی ہے۔انہوں نے پہلے مشرقی تنقید کی قدیم اصطلاحوں مثلاً فصاحت' بلاغت' استعارات' تشبیہات' بیان وبدیع وغیرہ کی تشریحات پیش کی ہیں اور پھر ان ہی کے پیش نظر' انیس ودبیر کے کلام پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ روزمرہ اور محاورہ منظر کشی' واقعہ نگاری' سادگی ادا' واقعیت ان تمام شعری خوبیوں کے پیش نظر ان کے کلام پر اپنے تجزیات پیش کئے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو شبلی کی تنقید میں مشرقی انداز تنقید کا رنگ گہرا ہے وہ زیادہ تر مشرقی نقد ونظر کے تحت اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔تاہم اس کے باوجود ان کا تنقیدی شعور منفرد ہے۔وہ جو بھی رائے قائم کرتے ہیں نہایت ہی زوردار دلائل کے ساتھ قائم کرتے ہیں جس میں منطقی اور جمالیاتی دونوں پہلوؤں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

شبلی کے تنقیدی تصورات کو عام طور پر حالی کے تنقیدی نظریات کے ردعمل کے طور پر قبول کیا جاتا رہا ہے۔لیکن اس بات کو قطعی طور پر قبول کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔یہ صحیح ہے کہ شبلی نے بعض امور میں حالی کے نظریات سے اختلاف کیا ہے لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ان کے خیالات حالی کے خیالات کا ردعمل ہے۔بلکہ شبلی کے زیادہ تر تصورات حالی کے تصورات سے زائیدہ نظر آتے ہیں۔لیکن جو بنیادی خصوصیت ان کے تنقیدی تصورات کو حالی کے تنقیدی تصورات سے ممتاز بنا دیتی ہے اور ان کی تنقید کو نئی جہت عطا کرتی ہے۔وہ ان کا ذوقی اور جمالیاتی طریقہ استدلال ہے۔یعنی اپنے پیش کئے گئے مواقف میں وہ حالی سے زیادہ دور جاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں لیکن ان موقفات کے حق میں جو استدلال یا تاویلات وہ پیش کرتے ہیں وہ ان کو حالی کے بخلاف ایک الگ مقام پر فائز کرتے ہیں۔جہاں اُفقی دنیا کے بجائے عمودی دنیا بول اُٹھتی ہے۔جہاں وہ حالی کے سماجی' اصلاحی اور اخلاقی نقاد ہونے کے بجائے ادبی' جمالیاتی اور تاثراتی نقاد کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

شبلی کا یہی طرز بیان ان کے رچے ہوئے ادبی ومشرقی طرز فکر کی نشان دہی کرتا ہے۔وہ مغربی مفکروں کے اقوال تو پیش کرتے ہیں لیکن ان سے حالی کی طرح مرعوب نظر نہیں آتے۔شعر وشاعری کے بارے میں ان کے خیالات حالی کی بہ نسبت زیادہ پختہ اور آزادانہ نظر آتے ہیں۔وہ وقتی تقاضے کے تحت اصلاحی اور اخلاقی پہلو کو ضروری تو مانتے ہیں لیکن ان سے مرعوب اور مغلوب نظر نہیں آتے ''شبلی کے اسی جمالیاتی اور ذوقی مذاق نے انہیں عوام کے اندر شعر کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں بہت مدد کی اور شعر کہنے والوں

میں شعر کا صحیح شعور پیدا کیا جس سے اردو تنقید مالا مال ہوئی'' اور بقول خلیل الرحمان اعظمی:

''شبلی ذوقی اور تحسینی نقاد ہیں۔ شعر سے لطف اندوزی ان کے یہاں ایک تحقیقی عمل بن گئی ہے۔ وہ شاعر کے تجربات کی اس طور پر بازآفرینی کرتے ہیں کہ وہ شعر پر شخص کی اپنی واردات معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان کا جمالیاتی ذوق رچا ہوا ہے اور ان کے احساسات بے حد لطیف و نازک ہیں۔ شبلی کی تنقیدی نگارشات نے کئی نسلوں کے مذاق سخن کی تربیت کی ہے۔ وہ موجودہ دور میں بھی کافی دور تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں''

☆☆☆

حواشی:

شعرالعجم، جلد چہارم مولانا شبلی نعمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

مقدمہ شعروشاعری، الطاف حسین حالی

اردو تنقید کا ارتقاء، عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڈھ

اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد

فن تنقید اور اردو تنقید نگاری نورالحسن نقویؔ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڈھ

◄●►

D /O . Peer Gulam mohammad shah
R/o .ka ka sathoo,Jamalatta ,Srinagar
P/o.M.R Gunj
pin code. 190002
phone no .9906439542

نام کتاب: تشکیلات
مصنف: کلیم اختر
سن اشاعت: ۲۰۱۵ء
قیمت ۲۵۰/روپے
ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی

نام کتاب: حیات ولی (مولانا محمد ولی رحمانی کی علمی اور تحریکی زندگی کا تاریخی مطالعہ)
مصنف: شاہ عمران حسن
قیمت: ۲۰۰/روپے
ملنے کا پتہ: دارالاشاعت خانقاہ رحمانی، مونگیر



- **اعتراف ۱**
- **راشد طراز**

# طارق متینؔ۔احساس سے اسلوب تک

طارق متینؔ ہمارے ہم عصر ہیں۔ کہتے ہیں علوم وادبیات میں ایک معاصر پر کچھ لکھنا یا کہنا سب سے نازک ترین عمل ہے۔ جہاں کچھ نہ کچھ تحفظات کا درآنا تقریباً ناگزیر ہوتا ہے، مگر ناچیز (راقم الحروف) اس حصار سے پوری طرح نکلتے ہوئے یہ کہنے پر خود کو مجبور پا رہا ہے کہ طارق متینؔ معاصر حسیت کے نمائندہ شاعر قرار دیئے جا سکتے ہیں جنہیں اظہار و بیان کی سطح پر صاحبِ اسلوب کا درجہ بھی حاصل ہو چکا ہے جس سے کسی کے تخلیقی انفراد کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تخلیقی انفراد دراصل روایت و جدت کے مابین ایک توازن اور استحکام کی صورت گری سے عبارت ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ طارق متینؔ روایت کی روشنی سے فیضیاب ہوئے ہیں اور اپنی تخلیقی جڑوں کو گہری جدوجہد سے کھنگال کر اس مقام تک پہنچے ہیں۔ چنانچہ آج ان کی رومانی نگاہ، ماضی سے اپنی گہری عقیدت اور امروز سے اپنی عمیق محبت کو ایک مقامِ مشترک پر لا کر یہ فیصلہ سنانے میں کوئی تکلف نہیں کر رہی ہے کہ ۔

میں بھی اک خاک کا پتلا ہوں ترے ہی جیسا    کسی دوزخ کسی جنت سے نہیں آیا ہوں

جہاں آج لوگ اپنی محزونی و یاس کو ادب میں Design کرنے کا تخلیقی رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور دوزخ و جنت کے درمیان کھڑے ہوئے ماتم کناں ہیں یا تخلیقی بصیرت کے نام پر نا معلوم مسرت کی منزل سے خود کو ہم کنار ثابت کر رہے ہیں۔ ایسے میں طارق متینؔ کے اشعار ان کی بیش قیمت تخلیقی سادگی و ہنرمندی کا مظہر ہیں ۔

میرے قد میں بھی کسی روز اضافہ ہو جائے    آسماں تیری بلندی کے برابر ہو جاؤں
وسعتِ دشت میں مانا کہ اتر جاؤ گے    درو دیوار نہ دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے
میں تھک گیا ہوں بہت امتحان دیتے ہوئے    ہر ایک سانس پہ یارب لگان دیتے ہوئے
نہ جانے ختم کب ہوگی یہ میعادِ قفس طارقؔ    کہاں جا کر کٹیں گے یہ سلاسل کہہ نہیں سکتے
غزالِ درد مرے دشت جاں میں رہتا ہے    بہت سکون سے اپنے مکاں میں رہتا ہے

طارق متین پر بھی زمانے سخت گزر رہے ہیں۔ غمِ حیات و مسائلِ حیات جن کا بشر کے ساتھ روزِ ازل سے سلسلہ ہے، طارق متین کو بھی دامن گیر رہے ہیں، مگر وہ اس دباؤ سے متاثر ہو کر بھی ٹوٹے یا بکھرے

نہیں ہیں بلکہ پا مردی سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ سچائیوں کے اظہار پر قادر اور گامزن ہیں لیکن تلخ یا ناشائستہ ہوئے بغیر صرف ایک مہذب افسردگی کا بہ مشکل شکار ہوئے ہیں۔

کوئی منزل نہیں ایسی جہاں جا کر ٹھہر جاؤں — غمِ دنیا تری زنجیر سے بچ کر کدھر جاؤں
دلِ محزوں ! کوئی اس شہر میں غم خوار ہے تیرا؟ — یہ مایوسی کی چادر اوڑھ کر میں کس کے گھر جاؤں

دہر میں آنے کی کیا خوب سزا پائی ہے — خود تماشا بھی ہوں میں اور تماشائی بھی

ہم اپنا نام و نسب کیا بتائیں اے طارقؔ — جو لٹ گیا ہے اسی کارواں کے ہم بھی ہیں

ہم اگر ڈھونڈ رہے ہیں تو تعجب کیوں ہے — اپنے جینے کا سہارا تو سبھی ڈھونڈتے ہیں

بجھتے بجھتے بجھ گیا طارقؔ چراغِ آرزو — اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سانحہ میرے لیے

طارقؔ دکھائی در بدری نے وہ راہِ زیست — ملنے لگا سکون ہمیں انتشار میں

مسائلِ حیات سے دو چار شاعر ایک مسافر درویش بھی ہے، ایک عاشق بھی ہے اور ایک عارف بھی۔ کہیں پر ایک سچے عاشق کی طرح وہ کائنات میں حسن کا متلاشی ہے جو یقیناً خیر سے عبارت ہے یہاں اس کی سرمستی ایک عاشق کی سرمستی ہے جو خود کو ''حسن و خیر'' کی تصویر میں ڈھونڈنے لگا ہے اور ایک مسافرِ کامران ہے جو استغنا کے باہر ہو کر بھی اپنے آداب نہیں کھوتا۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی گمان گزرتا ہے آپ بھی دیکھئے۔

وارفتگیِ شوق کا عالم نہ پوچھئے — ہم خود کو ڈھونڈنے لگے تصویرِ یار میں

عارفانہ سرشاری تو پیکرِ صدق و رضا کا امتیاز ہے آپ اسے یہاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اس کی تصویر بنانے میں زمانے لگ جائیں — لوگ کتنے ہی نئے اور پرانے لگ جائیں
کوئی آوازِ جرس آئے تو ہم بھی طارقؔ — اپنی سوئی ہوئی راہوں کو جگانے لگ جائیں

طارقؔ متین اس میں کوئی شک نہیں کہ شخصی اعتبار سے ایک درویش مسافر ہیں جو نہ صرف ایک عاشق کا قلب و مزاج رکھتے ہیں بلکہ وہ ایک حد تک دانشورانہ ذہن بھی رکھتے ہیں اور کائنات کے مطالعہ اور مشاہدہ میں اپنی نگاہ کو باریک اور گہری بھی رکھتے ہیں۔ تخیل کی سادگی حالانکہ ان کی شاعرانہ شناخت میں غالب عنصر کی حیثیت رکھتی ہے جس کا اندازہ ان کے اب تک کے آئے ہوئے اشعار سے بھی آپ بخوبی لگا چکے ہوں گے۔ مگر تخیل کی یہ سادگی اپنی معنویت کی ترسیل میں اکہری نہیں بلکہ اس سے تہہ داری کا سراغ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ تخیل کی باریکی کے اعتبار سے بھی ان کی باخبری اور عمیق نگاہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عجب قدرت ہے اس کی کیا فراہم کر دیا اس نے — کہ اک قطرے سے انساں کو مجسم کر دیا اس نے

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ''ہم نے پانی سے ہر شئے کی تخلیق کی اور زندگی پیدا کی۔'' (صورت الانبیاء ۱۳۔۲۱)



درج بالا شعر اس آفاقی صداقت کا مظہر ہے کہ پانی کے ایک قطرے سے خدا نے انسان کو مجسم کر دیا۔ مذکورہ شعر کی تخلیقی باز آفرینی خوب ہے۔

طارق متین سیاسی بصیرت بھی رکھتے ہیں اور سیاسی و ثقافتی شعور نے ان کو تخلیقی عمل میں ایک ذمہ دار شاعر کے منصب پر رکھا ہے، ملاحظہ فرمایئے درج ذیل شعر۔

ایک دن خاک میں مل جائے گا وہ بھی، جس نے — ابھی دنیا کو ہتھیلی پہ اٹھایا ہوا ہے

ایسے اشعار اپنی قبیل آپ رکھتے ہیں جو کسی بھی شاعر کو ممیّز و ممتاز کر سکتے ہیں۔

یہ خاک و خوں کا عجب امتزاج چاہتی ہے — مری زمیں مرے سر کا خراج چاہتی ہے
یہ صرف وعدۂ فردا پہ ٹل نہیں سکتی — امیرِ شہر! رعایا اناج چاہتی ہے
بدل لیا ہے فقیری نے بھی لباس اپنا — یہ بوریا نہیں اب تخت و تاج چاہتی ہے

لیکن ابھی طارقؔ متین کو اور بھی تخلیقی منزلیں طے کرنی ہیں۔ ایک گہرے تخلیقی احساس نے ان کو صاحبِ اسلوب تو بنا دیا ہے مگر ان کی شاعری کو استعارہ سازی کے عمل سے بھی گزرنا ہے جس کا تقاضا اب ناگزیر و فطری ہے۔ مقام شکر ہے کہ طارقؔ متین استعارہ سازی کے اس مخصوص عمل سے اپنی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہوئے کسی حد تک اسے بروئے کار لانے کی کوشش کا آغاز کر چکے ہیں۔

آئینہ ہوں مگر اک عمر سے ہوں زنگ آلود — اپنی آنکھوں کے تبسم سے اجالے کوئی

یہاں ''آنکھوں کا تبسم اور اس سے جڑا ہوا اجالا'' استعارۂ معکوس سے کام لینے کی اچھی صورت ہے۔ امید ہے طارقؔ متین اس پہلی منزل کو ایک نمایاں اختصاص فراہم کریں گے اور آئندہ بھی ہمیں حظ اٹھانے کا موقع دیں گے۔

طارقؔ متین ایک امکانی شاعر ہیں جو کسی نہ کسی سطح پر خواب دیکھنے کے ایک بڑے تصور سے جڑے ہوئے ہیں اور خواب دیکھنا محض ایک رومانی عمل نہیں بلکہ ہر انقلاب سے پہلے واقعہ ہے کہ اس کا ایک تصور رہا ہے جسے اہلِ انقلاب نے خواب کی صورت میں آنکھوں میں رکھ کر اس کی حفاظت کی ہے۔ خواہ وہ خوابِ سحر ہی کیوں نہ ہو۔ ملاحظہ فرمایئے اس بحث کا آخری شعر جو اس تخلیقی امکان پر تمام ہوتا ہے کہ طارقؔ متین اسے آنکھوں میں بسانے کے لیے بیداری کی منزل سے گذر رہے ہیں۔ یہ ایک اچھا اور سچا عمل ہے۔

مجھ سے کہنے لگی یہ رات کہ طارقؔ صاحب — آپ جاگے ہوئے کس خوابِ سحر کے لیے ہیں

◀◀ ● ▶▶

Dilawarpur, Munger 811201
Mob : +91 9934628955

**● اعتراف ۲**

**● اجے مالوی**

# اسرار گاندھی کے افسانوی فکروفن میں تخلیقیت افروزی

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے اس مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک کے تناظر میں اردو افسانہ نگاری کے منظرنامہ میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی ہے۔اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں فرد، ہندوستانی تہذیب، معاشرہ اور انسانی رشتوں کے معیار میں زبردست گراوٹ اور تبدیلی رونما ہوئی ہے اور اس کی آہٹ اور زندگی میں ہو رہی تبدیلی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔اس نئی صدی میں عالمی سطح پر سیاسی اور سماجی صورتِ حال بدل چکی ہے، انسانیت مٹ چکی ہے، بازار میں خرید وفروخت کا دور جاری وساری ہے اور آج کے ہندوستانی سماج میں انسانی رشتوں کا معیار بدل چکا ہے۔اس بدلتے ہوئے منظر اور فضا کا اثر فنکار کے ذہن اور اس کی تخلیقیت پر بھی پڑ رہا ہے۔آج کا حساس فنکار آزادانہ طور پر کھل کر بڑی بیبا کی کے ساتھ اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کر رہا ہے۔اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اسرار گاندھی انسانی رشتوں میں ہو رہی کھٹاس اور زندگی میں ہو رہی تبدیلی کی آہٹ کو محسوس کرتے ہیں۔اس ضمن اسرار گاندھی اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ’’کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ پچھلی تین چار دہائیوں میں کتنی تبدیلیاں انسانی قدروں میں آئی ہیں اور جس تیزی سے آئی ہیں پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ایسا نہیں تھا کہ پہلے انسان خود غرض نہیں ہوتا تھا یا اس کے اندر بے حسی نہیں تھی۔تھی اور ضرور تھی۔لیکن یہ چیزیں زندگی پر حاوی نہیں تھیں۔شاید یہی وجہ ہے کی آج زیادہ تر شہروں میں Old Age Home کھل رہے ہیں اور اپنی اولادوں سے عاجز والدین ان جگہوں پر زندگی کے آخری ایام گزارنے کے لیے مجبوراً داخل ہو رہے ہیں۔
>
> آج زندگی بہت ہی پیچیدہ ہوگئی، نتیجے میں لوگ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو رہے ہیں۔اس کی جو سب سے بڑی وجہ نظر آتی ہے وہ کارپوریٹ لائف اور شہری زندگی



> ہے۔اس طرز زندگی نے ہم سے نہ جانے کیا کیا چھین لیا۔آج زیادہ تر لوگ تنہائی کا شکار ہو گئے ہیں اور انسان کے لئے مادی وسائل کی جستجو مقصد حیات بن کر رہ گئی ہے۔مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم دوبارہ غیر مہذب ہوتے جا رہے ہیں۔ایک گہرا اندھیرا ہر طرف چھاتا جا رہا ہے۔اس اندھیرے کے درمیان سے گذرنا کافی اذیت ناک ہوگیا ہے۔‘‘ (’غبار‘ ص:7 اور 8)

اس مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک کے نئے افسانوں میں افسانہ نگار کی اصل بغاوت خطیبانہ، شور وشر، رومانیت، جذباتیت اور فارمولازدہ کہانیوں سے، سیاہ اور سفید کی سطحیت سے، متوسط طبقے کی کھوکھلی اخلاقیات اور نظریہ بازوں کی اشتہاریت سے ہے۔اردو افسانہ نگاری میں ہو رہی تبدیلی کے ضمن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے پرمغز، معنی خیز، بصیرت افروز اور فکر آلود خیالات وتاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’نئی کہانی نے اپنی سب سے بنیادی پہچان تصور حقیقت اور اظہار کے پیرایوں میں تبدیلی سے کرائی۔یعنی لفظ نرے لفظ نہیں تھے بلکہ ایسے استعاروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے لگے، جن کے مفاہیم کو منطقی طور پر PARAPHRASE کرنا ممکن نہیں۔ فرد کی فردیت، اس کے معمولی پن میں اس کی UNIQUENESS، چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ اور بنیادی صداقتیں، یعنی زندگی کی نوعیت اور ماہیت ،خوشی اور غم کی حقیقت، وجود کا اختیار اور جبر، جنس کی سچائی، عرفان ذات کی دہشت، نیز طرح طرح کے موضوعات کی رنگارنگی کہانی کی دنیا میں اپنی کیفیت دکھانے لگی۔کہانی کی قدر شناسی کی سطح پر بڑی تبدیلی یہ آئی کہ موضوع سے چونکہ ادب کی تشکیل نہیں ہوتی، اس لیے موضوع اور اظہاری پیکر سے مل کر جو تخلیقی وحدت وجود میں آتی ہے، وہ افسانہ ہے۔یوں ہندوستان اور پاکستان کے نوجوان باغی افسانہ نگاروں نے نئی فنی بلندیاں سر کیں اور بہت سے ایسے افسانے لکھے جو تاریخ کا حصہ ہیں۔‘‘ (جدیدیت کے بعد، ص:394)

معاصر اردو افسانہ نگاروں میں اسرار گاندھی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔جن کے تخلیقی سفر کا آغاز 1974 سے ہوتا ہے، جب ان کا پہلا افسانہ ’الجھی ڈور‘ نیا دور، لکھنؤ میں شائع ہوتا ہے۔اس کے تقریباً چار برس کے بعد دوسرا افسانہ ’ہڈیاں‘ کے عنوان سے 1978 میں ’آہنگ‘ گیا سے شائع ہوا تھا۔اس کے بعد

ان کے افسانے قومی اور بین القومی سطح پر تمام رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسرار گاندھی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'پرت پرت زندگی' 1997 میں منظرِ عام پر آیا۔ جس میں کُل پندرہ افسانے ہیں 'بے بسی'، 'کہرے سے ڈھکی ایک رات'، 'پرت پرت زندگی'، 'گہرے بادل'، 'آڑے ترچھے دائرے'، 'وہ جو راستے میں کھوئی گئی'، 'کھلی آنکھوں کا خواب'، 'ہڈیاں'، 'پست بلندی بلند پستی'، 'پہیئے'، 'دھند سے پرے'، 'دوسری گلی'، 'بے جڑ کے پودے'، 'منظر پس منظر اور 'ایک جھوٹی کہانی کا سچ'۔ دوسرا افسانوی مجموعہ 'رہائی' کے نام سے 2004 میں شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعہ میں کُل بارہ کہانیاں ہیں۔ 'رہائی'، 'خلیج'، 'بلّی'، راستے بند ہیں سب'، نالی میں اُگے پودے'، 'رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں'، 'نجات'، 'صیّاد اجل'، 'اخباروں میں لپٹی روٹیاں'، 'دھوئیں کے مارے ہوئے لوگ'، 'چیرہ دست' اور 'بلیک آوٹ'۔ تیسرا افسانوی مجموعہ 2014 میں 'غبار' کے عنوان سے منظرِ عام پر آ چکا ہے اور ادبی حلقوں میں اُن کے افسانے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں افسانہ نگار کے کُل نو افسانے شامل ہیں۔ 'مفاہمت کا عذاب'، 'محو حیرت ہوں....'، 'غبار'، 'شاور کا شور'، 'دھوپ چھاؤں'، 'خواب خواب سفر'، 'کانٹے'، 'مارکیٹنگ' اور 'راستے'۔

اسرار گاندھی کے ان تمام افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقت اور زندگی کی بے رحم سچائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول سے اپنے افسانوں کی رنگ مالا بہت ہی خوبصورتی اور فنی لطافت کے ساتھ تیار کی ہے اور اسے کامیابی کے ساتھ اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ اسرار گاندھی نے زندگی کے مختلف رنگ کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے آس پاس کے تمام موضوعات کو اپنے افسانے میں جگہ دی ہے اور اپنے افسانوں کے ذریعہ نت نئے تجربے پیش کیے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں سیاسی، سماجی، جنسی اور رومانی رنگ کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔

جنسیات کے حوالے سے اسرار گاندھی نے متعدد افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً 'ہڈیاں'، 'شاور کا شور'، 'ایک جھوٹی کہانی کا سچ' اور 'محو حیرت ہوں' وغیرہ وغیرہ۔ جنسیات ایک نہایت ہی نازک موضوع ہے لیکن اسرار گاندھی نے بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ اس ضمن میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کی طرح کامیابی کے ساتھ گزرنے کی سعی کی ہے جو قابلِ ستائش ہے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس نازک موضوع پر قلم اٹھانے میں افسانہ نگار جھجھکتا ہے، اس کو اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ سماج کے لوگ کیا کہیں گے یا لوگ کیا سوچیں گے اور کیا محسوس کریں گے، کیوں کہ اگر افسانہ نگار جنسی پہلو کو کامیابی کے ساتھ اپنی تخلیق میں نہیں برتتا ہے یا کہانی افسانہ نگار کے اوپر حاوی ہو جاتی ہے تو اس میں فنکار کی رسوائی ہوتی ہے اور افسانہ ادبی معیار سے گر جاتا ہے اور وہ کہانی بازارو ہو جاتی ہے لیکن اسرار گاندھی نے جنسیات کے پہلو کو جس



نفسیاتی بصیرت اور فنی لطافت کے ساتھ اپنے افسانوں میں برتا ہے وہ ان کا ہی خاصّہ ہے۔ ان کے غیر معمولی افسانوی فکر و فن نے ان کو بیباک افسانہ نگار بنا دیا۔ 'ہڈیاں' اسرار گاندھی کا کامیاب افسانہ ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے abnormal sex کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے اور اس کو انہوں نے بہت ہی خوش اسلوبی اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی فنی چابکدستی کی تصویر افسانے کے آخر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جس میں افسانے کی ہیروئین اپنے جسم کی آگ کو بجھانے کے لیے موم بتی کا سہارا لیتی ہے۔ اسی دوران بجلی چلی جاتی ہے۔ وہ پسینے سے شرابور ہو جاتی ہے اور جھلا کر کہتی ہے "کم بخت بجلی کو بھی آج ہی جانا تھا"۔ افسانے کا آخری اقتباس خاطر نشیں ہو:

> "رات کے ابھی صرف دس بجے تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی اور پورے گھر میں اندھیرا ہو گیا۔ ماچس کے سہارے کوئی شمعدان لینے کمرے میں گیا اور پھر دادی ماں کی بڑ بڑاہٹ سنائی دی۔ پتہ نہیں شمعدان سے شمع کہاں چلی گئی۔ شام تک تو تھی۔ اب تو دوکانیں بھی بند ہو گئی ہوں گی۔
>
> وہ چپ چاپ خموشی سے اپنے پلنگ پر لیٹی تیز تیز سانسیں لے رہی تھی اور پورا جسم پسینہ سے تر بتر ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔
>
> "کمبخت بجلی کو بھی آج ہی جانا تھا۔"

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں 'شاور کا شور' اسرار گاندھی کا شاہ کار افسانہ ہے۔ اس افسانہ کا مرکزی کردار یونیورسٹی کا ایک پروفیسر ہے۔ جو آزاد خیال ہیرو ہے۔ اس کہانی کا ہیرو اپنے شاگردوں، بیوی، بچوں، محبوبہ شہناز، ڈاکٹر ابوالقیس، عزیز دوست ہاشمی صاحب اور سیمینار کے منتظمین کو بھی غفلت میں رکھتا ہے۔ لمبی لمبی ڈینگیں مارتا تھا۔ سب سے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس کو اس بات کا خبط سوار رہتا ہے کہ دنیائے ادب میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے لیکن حقیقت سے سب واقف ہیں۔ اسی جھوٹ بولنے کی وجہ سے اس کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب بھی وہ جھوٹ بولتا ہے تو اس کے کانوں میں کچھ آوازیں لہراتی ہیں اور دھیرے دھیرے اس کی زندگی پریشان کن ہو جاتی ہے۔ وہ آوازیں صرف اس کو پریشان ہی نہیں کرتی ہیں بلکہ اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہیں۔ ایک پروفیسر کی فطرت کو اسرار گاندھی نے جس فنی حسن و جمال اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ 'شاور کا شور' میں نمایاں کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ اسرار گاندھی اپنے آس پاس کے ماحول سے آنکھیں نہیں چراتے ہیں بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتے ہیں اور ان کو افسانے کا موضوع بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ 'شاور کا شور' نفسیاتی حقیقت نگاری کی ایک

عمدہ مثال ہے۔ کہانی کا ہیرو عموماً جب بھی باہر جاتا تو اپنے شاگردوں کو ریزرویشن کے لیے بھیجتا اور شاگرد بھی بیچارے گرمی ہو، جاڑا ہو یا پھر برسات کا مہینہ اس کا ریزرویشن کرواتے تھے لیکن چند خاص مواقع پر وہ صاحب خود ہی ریزرویشن کرواتے۔ اس بار بھی حضرت خود ہی گرمی کے موسم میں ریزرویشن ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ کافی جدوجہد کے بعد پسینہ پسینہ ہو کر جیسے ہی وہ ٹکٹ لے کر باہر نکلتے ہیں شہناز کو فون کرتے ہیں کہ سیمینار کے چوبیس گھنٹے پہلے میں پہنچ جاؤں گا اور میں نے سیمینار کے منتظمین کو اپنے اور تمہارے پہنچنے کی تاریخ نہیں بتائی ہے۔ تم آ رہی ہو نا؟ جھوٹ بولنے میں کہانی کے ہیرو کو مہارت حاصل ہے۔ ہر مہینے ہونے والی نشست میں شاگردوں کو اپنے گھر پر جمع کرتے ہیں۔ طلبات اور طالبات پر رعب جھاڑتے ہیں۔ ان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور پھر سیمینار کی کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں۔

''میں جب بمبئی پہنچا تو سیمینار کے منتظمین مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ دراصل انہیں اپنے سیمینار کی کامیابی کا یقین ہو گیا تھا کہ میں اب سیمینار کی کامیابی کی ضمانت بن گیا ہوں۔ منتظمیں نے میرے قیام کا انتظام ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کر رکھا تھا۔ اسٹیشن سے ہوٹل تک انہی لوگوں نے مجھے اپنی کار سے پہنچایا۔''

''جھوٹ بولتے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تم نے خود ٹیکسی لی تھی اور اپنے آپ ہوٹل تک گئے تھے۔ تمہیں تو اسٹیشن پر کوئی ریسیو کرنے تک نہیں آیا تھا۔ اب یہ جھوٹا بلند بانگ قصیدہ کیوں؟'' اچانک ایک آواز اس کے کانوں میں آئی اور وہ اچھل پڑا۔

اس نے اپنے شاگردوں پر نظر ڈالی۔ وہ سب اس کی آواز پر ہمہ تن گوش تھے۔

''کیا کسی نے کچھ کہا ؟''

''نہیں تو۔'' ایک شاگرد بولا۔

''تمہیں یقین ہے نا کہ کوئی کچھ نہیں بولا''

''جی ہاں سر۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔'' سارے شاگرد حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''واقعی تم لوگوں نے کچھ نہیں سنا؟''

''قطعی نہیں۔'' کئی شاگرد ایک ساتھ بولے۔

اسے وقتی اطمینان ہو گیا مگر آوازوں کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ وہ جب جھوٹ بولتا اور زیادہ تر جھوٹ ہی بولتا تو اس طرح کی آوازیں اسے کچوکے لگاتیں اور گھنٹوں پریشان رہتا۔''



کہانی کے ہیرو کو اپنی مردانگی پر بھی بڑا ناز ہے۔

ہندوستانی سماج کے ایسے بدوضع اور بدکردار پروفیسر کو اپنے افسانہ کا ہیرو بنا کر اسرار گاندھی نے قاری کو جھنجھوڑ دیا ہے اور عوام کو سوچنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ قاری کو کہانی کے ہیرو سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کی ہیرو کی محبوبہ شہناز کو بھی اس ریاکاری، مکاری اور نامردی کا علم ہو جاتا ہے۔ اس کے یہ جملے ہیرو کی پوری حقیقت کو بیان کر دیتے ہیں۔ جب وہ یہ کہتی ہے ''تم پر اب عمر کا اثر ہو چلا ہے۔ مجھے یاد ہے میرے ساتھ پچھلی بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔'' اور جب ہیرو یہ پوچھتا ہے کہ تمہارے شوہر کیسے ہیں؟'' تو شہناز نے کہا ''ٹھیک ہیں۔ تم سے تو بہتر ہی ہیں۔'' اسرار گاندھی کا فنی حسن و کمال یہ ہے کہ وہ کہانی کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں اور کہانی کے آخر تک suspense کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ وہ کہانی کا اختتام بڑے ہی بیباکی اور دیانت داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ جس میں افسانے کے ہیرو کی حقیقی تصویر مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

''شہناز دیر ہو رہی ہے، جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اسی وقت یہ ہوٹل چھوڑنا ہے۔ سیمینار کے منتظمین کو انتظار ہوگا، انہیں یہ اطلاع نہیں ہے کہ میں اور تم کس ٹرین سے آ رہے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' وہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

وہ باتھ روم کے دروازے پر اچانک رکی اور مڑ کر بولی۔ ''ایک بات بتاؤ۔ وہ جو تمہارے کانوں میں پریشان کن آوازیں آیا کرتی تھیں، ان کا کیا ہوا؟''

''وہ آوازیں...... وہ آوازیں اب نہیں آتیں۔ وہ مجھ سے شکست کھا کر ختم ہو چکی ہیں۔ دیکھو نا، میں پورے وجود کے ساتھ تمہارے سامنے سالم و ہٹا کٹا کھڑا ہوں۔'' اس کی آواز میں بے چینی تھی۔

''ڈھونگی تمہارے اندر سڑاندھ پیدا ہو چکی ہے۔ بو سے ناک پھٹی جاتی ہے۔ یہ تم کسے دھوکہ دے رہے ہو؟'' اجنبی اجنبی سی ایک آواز نے ایک بار پھر اسے چور چور کر دیا اور اس کے چہرے کا رنگ پیلا ہو گیا۔

شہناز اسے ہکا بکا دیکھتی رہی۔ اچانک وہ مڑ کر باتھ روم میں داخل ہو گئی۔

پھر فضا شاور کے شور سے بھر گئی۔''

'ایک جھوٹی کہانی کا سچ' اسرار گاندھی کا کامیاب ترین افسانہ ہے۔ انہوں نے ان چھوئے

موضوع کو اپنے افسانے میں جگہ دی ہے۔ جس کو پڑھ کر قاری کو تخلیقی بصیرت افروزی و نفسیاتی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے jigalo یعنی call boy کو موضوع بنایا ہے۔ اس کہانی میں قاری مرد طوائف سے روبرو ہوتا ہے۔ پہلے یہ چلن تو یوروپ میں عام تھا لیکن اب ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں عام ہو گیا ہے جہاں رئیس گھرانے کی عورتیں جسمانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مرد طوائف کی خرید فروخت کرتی ہیں اور ان کو ہر طرح کا عیش و آرام کی زندگی میسر کراتی ہیں۔ اس افسانے کے اہم کردار موہن اور جنّی ہیں۔ موہن اور جنّی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ جنّی تو موہن کے ساتھ گھر بسانے کو راضی ہے لیکن موہن ایک بے داغ چادر کا خواہش مند ہے۔ یہ زندگی کی حقیقی سچائی ہے جسے جنّی 'عورت ہونے اور نہ ہونے' کی بات کہہ کر سامنے رکھ دیتی ہے اور ہم پاتے ہیں کہ اس نئی کائنات میں سیٹھانی تو اپنی جسمانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے موہن کے ساتھ کھلا پن برت سکتی ہے اور عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگ جنّی کو طوائف کی جگہ sex worker کا خطاب دلا سکتے ہیں مگر یہی sex worker اپنی اس عزت افزائی کے باوجود گھر نہیں بسا سکتی اور دوسری طرف ایک مرد ذلالت کے گٹر میں سو غوطے لگانے کے بعد بھی اپنے لیے ایک کنواری بیاہتا کا خواہش مند ہے۔ مجبوری چاہے سیٹھانی کی ہو یا پھر جنی کی۔ چاہے وہ شکار بنے یا پھر شکاری۔ یہ زمینی سچائی ہے کہ خوشحال زندگی بہر حال اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ بڑے گھرانے کی عورتیں اپنی جسمانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہر قیمت دینے کے لیے تیار رہتی ہیں اور آج کے دور میں اپنے مردوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تقریباً ستر فیصد عورتیں غیر مردوں سے جسمانی لذت حاصل کر رہی ہیں۔ اسرار گاندھی نے اکیسویں صدی میں زندگی میں ہو رہی تبدیلی کی آہٹ کو محسوس کیا ہے اور اسے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ اس اقتباس کے ذریعہ ہندوستانی سماج کی ننگی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔

فون کی گھنٹی پھر بجی تو یادوں کی بھیڑ تتر بتر ہو گئی۔ اس نے برا سا منھ بنایا لیکن رسیور اٹھا کر بڑی شائستگی سے بولا۔

''موہن دِس سائڈ''

''گھر پر ہی ہو' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''اوہ جنّی تم۔ کہو کیسی ہو؟''

''بس ٹھیک ہی ہوں۔ بور ہو رہی تھی سوچا تمہیں بھی بور کروں۔''

''گھنٹہ، دو گھنٹہ! ارے میں تو پورے ویک کے لیے فری ہوں'' وہ زور



سے ہنستی ہوئی بولی۔

''سنو جنّی، تو پھر ایسا کرو کہ یہیں چلی آؤ۔ دیر تک غپ لڑے گی۔''

''اچھا آتی ہوں۔ میرا انتظار کرو۔'' دوسری طرف فون کاٹ دیا گیا۔ اس کی نظروں میں جنّی کا چہرہ گھوم گیا۔

جنّی...... ایک سیکس ورکر۔ دولتمند مردوں میں خاصی مقبول۔ چہرے پر اب بھی معصومیت کی دھندلی دھندلی سی پر چھائیاں۔ اس سے اس کی ملاقات کسی محفل میں پہلی بار ہوئی تھی۔ پھر وہ دونوں بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ وہ جب بھی چاہتی اس کے یہاں بے کھٹکے چلی آتی۔ گھنٹوں رہتی۔ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی۔ کبھی اپنے تجربے بتاتی۔ کبھی اس کے سنتی۔ کبھی اس کے دکھوں میں شامل ہو جاتی کبھی اپنی پریشانیوں میں اسے شامل کر لیتی۔

جنّی جب بھی آتی، اسے بے حد خوشی ہوتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ جنّی آئی تو وہ کھل اٹھا۔

''اچھا ہوا جنّی جو تم آ گئیں۔ آج موڈ بہت خراب تھا۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

وہ اسے سیٹھانی کے فون کے بارے میں بتانے لگا۔

''سالی کہہ رہی تھی تم میرے نوکر رہ چکے ہو۔''

اسی طرح اسرار گاندھی کے رومانی افسانوں میں 'خواب خواب سفر'، 'خلیج' اور 'بلیک آؤٹ' وغیرہ ہیں۔ ان افسانوں میں رومانی رنگ کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ سیاسی کہانیوں میں 'گہرے بادل' اور فسادات کے حوالے سے 'آڑے ترچھے دائرے'، 'کھلی آنکھوں کا خواب'، 'دوسری گلی' اور 'راستے بند ہیں سب' کامیاب افسانے ہیں۔ سماجی افسانے بھی اسرار گاندھی نے بہت ہی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ سماجی افسانوں کی جھلک 'رہائی'، 'صیاد ازل'، 'بلّی'، 'وہ جو راستے میں کھوئی گئی'، 'اخباروں میں لپٹی ہوئی روٹیاں'، 'بے جڑ کے پودے'، 'بے بسی'، 'کہرے سے ڈھکی ایک رات' اور 'پست بلندی بلند پستی' وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سماجی حالات کے ضمن میں اسرار گاندھی کی کہانی 'وہ جو راستے میں کھوئی گئی' میں نظریاتی صورت بہت حد تک واضح ہو گئی ہے۔ صدیوں سے دبا، پسا اور کچلا جانے والا دلت طبقہ آج کے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے تناظر میں بھی ہندوستانی سماج میں کس طرح آزاد ہوا ہے اور پھر

سرکاری اور سماجی دعووں کے باوجود، دلت طبقہ برہمنی اور بالا دست نظام سے کہاں رستگاری حاصل کر سکا ہے؟ اس کی سب سے ہولناک اور دہشت خیز ترجمانی اسرا گاندھی کے افسانے 'وہ جو راستے میں کھوئی گئی' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ معاشرتی کوائف و احوال صحافت گزیدہ نہیں ہے بلکہ یہ طبقاتی عصبیت کی آگ ہے جو کلبسیا کے انجام کی شکل میں آج کے نام نہاد آزاد معاشرہ میں بھرپور طور پر منکشف ہوتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی سفاک حقیقت کو اسرار گاندھی نے جس خوش اسلوبی اور فنی قدرت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ 'وہ جو راستے میں کھوئی گئی' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سر سے پیر تک ننگی کلبسیا سب سے آگے چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے ٹھاکر کا داہنا ہاتھ راگھو پنڈت بندوق تانے چل رہا تھا۔ اس کے ڈراؤنے چہرے پر پھڑکتی ہوئی مونچھیں اس کی خوفناکی کو بڑھا رہی تھیں۔ اس کے برابر ایک بھیانک سا آدمی چل رہا تھا۔ جس کے ہاتھ میں کسی پیڑ سے تازی توڑی ہوئی ایک سنٹی تھی۔ کلبسیا کے قدم جب رکنے لگتے تو سنٹی اس کے ننگے کولہے پر زور سے پڑتی پھر ایک چیخ کے ساتھ اس کی سست پڑتی رفتار کچھ تیز ہو جاتی۔''

اسی سلسلے کی ایک اور سماجی اور فنی عکاسی اسرار گاندھی کے افسانے 'بے بسی' میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جہاں نتھو کی سادہ لوحی اور بھگوان سے اس کی عقیدت، پنڈت جی کے نمائشی عقیدت پر نہ صرف حاوی نظر آتی ہے بلکہ ہندوستان میں اعلیٰ طبقہ کی اس طبقاتی نفرت کا بھی راز منکشف کر دیتی ہے جو پسماندہ طبقے کے لیے اس نظام کی زائیدہ اور پروردہ ہے، جہاں شودر کی تخلیق کردہ مورتی مندر میں قائم تو کی جاسکتی ہے لیکن اس مورتی کی تخلیق کرنے والے حسن کار کو مندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس مورتی پر اپنی والہانہ عقیدت کے پھول چڑھا سکتا ہے کیوں کہ مورتی کار کے مندر میں داخل ہونے اور عقیدت کے پھول چڑھانے سے ہندو دھرم کے ناپاک ہو جانے کا خطرہ ہے۔ یہ ہندوستانی سماج کا المیہ ہے جس کو دلت نتھو کے کردار کے ذریعہ اسرار گاندھی نے زندگی کی تلخ حقیقت، بے رحم سچائی اور ہندوستانی سماج کی کھوکھلی تصویر کو آئینہ بنا کر بہت ہی فنی حسن و جمال اور اقداری کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا آخری اقتباس خاطر نشان ہو:

''بھیڑ جب ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے پھولوں کو لیے ہوئے آہستہ آہستہ مندر کے دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مندر میں داخل ہوتا، پنڈت جی کی نظریں اس پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے نتھو کی طرف بڑھے اور اسے



دروازے سے باہر ہی روکتے ہوئے بولے ''نتھو تم! تم مندر کے اندر کیسے آ رہے ہو؟'

''کیوں کیا میں اپنی بنائی ہوئی مورتی پر پھول بھی نہیں چڑھا سکتا؟'' نتھو بولا۔

''ہاں تم اب اپنی بنائی ہوئی بھگوان کی مورتی پر پھول نہیں چڑھا سکتے کہ یہ اب مندر کی ہے۔'' پنڈت جی نے نتھو کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''لیکن پنڈت جی اسے بنایا تو میرے ہی ہاتھوں نے ہے۔''

''ہاں بنایا تو تمہارے ہی ہاتھوں نے ہے۔ پر اسے اب پوتر کر لیا گیا ہے۔ تمہارے ہاتھوں سے پھول ڈلوا کر اسے اپوتر نہیں کیا جاسکتا۔ تم گھر چلے جاؤ نتھو۔''

''نہیں میں تو بھگوان کی مورتی پر پھول چڑھائے بنا نہیں جاسکتا۔ اب وہ سمئے لد چکا ہے پنڈت جی۔''

نتھو کی بات سن کر پنڈت جی غصے سے سرخ ہو گئے۔ وہ زور سے چیختے ہوئے بولے۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کہاں سے بول رہے ہو لیکن تم یہ سمجھ لو یہ مندر ہے سرکاری نوکری نہیں۔ تم یہاں نہیں گھس سکتے۔ نتھو تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' پنڈت جی کی چیخ سن کر وہاں موجود دوسرے لوگ بھی آ گئے۔

پھر جب نتھو نے پنڈت جی کو ہٹا کر مندر کے اندر جانے کی کوشش کی تو سبھی نے مل کر اسے پکڑ لیا۔ جہاں وہ گرا تھا وہاں سے اسے بھگوان کی مورتی صاف نظر آ رہی تھی۔ بھگوان سر سے پیر تک پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر ویسے ہی مسکراہٹ تھی لیکن نہ جانے کیوں بھگوان کی روشن روشن آنکھوں میں نتھو کو بڑی بے بسی نظر آئی۔''

اسرار گاندھی کی کہانی 'رہائی' میں بھی سماجی پہلو جلوہ گر ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے مختلف پہلوؤں کے ذریعہ کہانی میں جان ڈالنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ ہندوستانی سماج میں طبقاتی فرق اور زندگی میں نت نئی ہو رہی تبدیلی کو افسانے میں افسانہ نگار نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک طرف حامد کی لڑکی عطیہ کا سعید کے ساتھ بھاگ جانے پر حامد کے اوپر نہ تو خود کی بدنامی اور نہ ہی قصبہ کی بے عزتی یا سماج کا ڈر ہے اور دوسری طرف رام اوتار کی لڑکی کا گھر سے بھاگ جانے پر رام اوتار کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور آخر کار رام اوتار گاؤں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے

میاں کے خاندان میں عالیہ کے بھاگ جانے پر بدنامی کے ڈر سے ریشم کی رسی سے گلا گھونٹے جانے کی تصویر افسانہ نگار نے پیش کی ہے۔ افسانے کے آخر میں بڑے میاں کا یہ کہنا کہ ''خدا کا شکر ہے عطیہ کسی ہندو کے ساتھ نہیں بھاگی۔'' یہ زمینی سچائی ہے جسے افسانہ نگار نے بڑے میاں کے اس ایک جملے کے ذریعہ سے افسانے میں جان ڈال دی ہے اور اس جملے کے ذریعہ افسانہ نگار نے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر دیا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے کہ آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بڑے شہروں میں یہ بات عام ہو گئی ہے کہ ہندو کی لڑکی مسلمان کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور شادی کر لیتی ہے۔ اسی طرح مسلمان لڑکی بھی ہندو لڑکے کے ساتھ بھاگ کر شادی کر رہی ہے۔

اسرار گاندھی نے عصر حاضر کے تقاضوں اور ضرورت سے اپنی آنکھیں نہیں چرائی ہیں بلکہ انہوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی ہیں اور اپنے اردگرد کے ماحول کے ساتھ ساتھ زندگی کے نِت نئے تجربات سے بصیرت و آگاہی حاصل کی ہیں اور ان کو اپنے افسانے کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے عورت اور مرد کے گھریلو جھگڑوں سے بھی اثرات قبول کیا ہے اور ان موضوعات کو بھی اپنے افسانے میں بہت ہی عصری آگہی اور فنی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کی جمالیاتی تصویر کشی اور زندگی کی تلخ حقیقت افروزی ان کے افسانے 'پرت پرت زندگی'، 'پہیئے'، 'منظر پس منظر'، 'دھند سے پرے' اور 'دھوپ چھاؤں' وغیرہ میں نظر آتی ہے جو قاری کو چونکاتی ہے، اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور بیک وقت جمالیاتی مسرت اور انسانیاتی بصیرت عطا کرتی ہے۔ اسرار گاندھی کے افسانوی آئینہ خانہ میں اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے سفاک حقائق، اسرار اور مختلف اور منفرد کرداری امتیازات تخلیقی اور اقداری سطح پر منکشف نظر آتے ہیں جو ان کے غیر معمولی افسانوی فکر و فن میں معاصر تخلیقیت، عصریت، معنویت اور فنیت کو بھرپور طور پر چراغاں کرتے ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

1278/1 Malviya Nagar
Allahabad-211003
(M) 09451762890

| | |
|---|---|
| نام کتاب: اٹوٹ رشتے (افسانے) | نام کتاب: پنجرے کا قیدی (افسانے) |
| مصنفہ: ساوتری دیوی | مصنفہ: قمر جہاں |
| سن اشاعت: ۲۰۱۶ء | سن اشاعت: ۲۰۱۵ء |
| قیمت ۲۵۰/روپے | قیمت: ۳۰۰/روپے |
| ملنے کا پتہ اسباق پبلی کیشنز، پونہ | ملنے کا پتہ: قمر جہاں بھیکن پور، بھاگلپور |



## ● گوشہ انتظار حسین

# کوائف

نام: انتظار حسین
قلمی نام: انتظار حسین
تاریخ پیدائش: ۷/دسمبر۱۹۲۳ (تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے، تاہم ماہ دسمبر میں کوئی اختلاف نہیں)
جائے پیدائش: دیبائی (بلند شہر کا نواحی گاؤں، متحدہ ہندستان)
تعلیم: ایم اے (اردو)
والد کا نام: منظر علی بن امجد علی
والدہ کا نام: صغریٰ بیگم بنت وصیت علی
بھائی بہن: پانچ بہنیں
اہلیہ: عالیہ بیگم (وفات، جنوری ۲۰۰۵)
سال ہجرت: ۱۹۴۷ء
وابستگی: صحافت

## تصانیف:

گلی کوچے (افسانے، ۱۹۵۱ء)
چاند گہن (ناولٹ، ۱۹۵۳ء)
کنکری (افسانے، ۱۹۵۵ء)
آخری آدمی (افسانے، ۱۹۶۷ء)
شہر افسوس (افسانے، ۱۹۷۲ء)
بستی (افسانے، ۱۹۷۹ء)
خیمے سے دور (افسانے، ۱۹۸۶ء)۱

خالی پنجرہ (افسانے،۱۹۹۳ء)

آگے سمندر ہے (ناولٹ،۱۹۹۵)

چراغوں کا دھواں (آپ بیتی،۲۰۰۲ء)

علامتوں کا زوال (تنقید،۲۰۱۱ء)

گچھوے (افسانے،۲۰۱۱ء)

زمیں اور فلک اور (افسانے،۲۰۱۳ء)

دن اور داستان (ناولٹ،۲۰۱۳)

دلی تھا جس کا نام (آپ بیتی،۲۰۰۷)

جل گرجے (داستان)

نظریہ سے آگے (تنقید)

اس کے علاوہ انہوں نے ترجمے کیے اور سفرنامے بھی تحریر کیے۔ ان کی کہانیوں اور کئی ناولوں کو انگریزی زبان میں بھی شائع کیا جاچکا ہے۔

## انعامات واعزازات

☆ پرائڈ آف پرفارمینس، پاکستان، ۱۹۸۷ء میں دیا گیا۔

☆ ستارہ امتیاز، حکومت پاکستان کی طرف سے۔

☆ ستمبر۲۰۱۴ء، آفیسر آف دی آرڈر آف آرٹس اینڈ لیٹرز، حکومتِ فرانس کی طرف سے۔

☆ انتظار حسین پاکستان کے پہلے ادیب تھے جن کا نام مین بکر پرائز کے لیے شارٹ لسٹ کیا گیا تھا۔

☆ انہیں حکومت پاکستان نے ستارہ امتیاز اور اکادمی ادبیات پاکستان نے پاکستان کے سب سے بڑے ادبی اعزاز کمال فن ایوارڈ سے نوازا تھا۔

تاریخ وصال: ۲/فروری ۲۰۱۶

جائے مدفن: لاہور

◀◀ ● ▶▶



- **گوشہ انتظار حسین**
- **انٹرویو**

# انتظار حُسین سے ایک گفتگو

## میزبان: شمس الرحمٰن فاروقی ......رپورٹ: چودھری ابن النصیر

چودھری ابن النصیر: انتظار حسین صاحب! آپ کی الہٰ آباد آمد پر ہم لوگ بیحد مسرور ہیں۔ ادارہ ''شب خون'' کی طرف سے ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ گفتگو جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے مکان پر ۱۳/فروری ۱۹۹۶ء کو منعقد ہو رہی ہے۔ شرکاء ہیں شمس الرحمٰن فاروقی، ضیاء الحق، اسرار گاندھی، ساجد سعید اور یہ ناچیز۔ آج ہم لوگ آپ سے اردو ناول اور افسانہ کی موجودہ صورتِ حال پر گفتگو کریں گے۔ ہم درخواست کرتے ہیں کہ سوالوں کا سلسلہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی جانب سے شروع ہو۔

شمس الرحمٰن فاروقی: انتظار صاحب سے سوال تو اتنے ہو چکے ہیں کہ یہ بے چارے سوال و جواب سے بہت زیادہ پریشان ہو چکے ہیں۔ سوال نہیں پوچھنا چاہتا ہوں بلکہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ یہ بتائیں کہ آپ کا جو نیا ناول ''آگے سمندر ہے'' آیا ہے، اس کے بعد آپ کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟ اب کیا لکھنا چاہتے ہیں اور کیا لکھ رہے ہیں؟ اور یہ بات کہ اب تک آپ نے جو لکھا ہے اس سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

انتظار حسین: فاروقی صاحب نے بڑا مشکل سوال کر دیا ہے، بظاہر یہ بہت آسان سوال ہے۔ اصل میں میں نے بھی کبھی اس طرح کی منصوبہ بندی نہیں کی کہ اب میں نے یہ کام کر لیا ہے تو آئندہ مجھے یہ کچھ کرنا ہے۔ ناولوں کا معاملہ بھی میرا یہی رہا ہے کہ میں نے تو زیادہ تر کہانیاں ہی لکھی ہیں، لیکن شروع میں ایک ناول ''چاند گہن'' لکھا تھا اور اس سے خاصے لمبے وقفے کے بعد ''بستی'' اور پھر ''بستی'' کے بعد ''تذکرہ'' اور

اب آیا ہے ’’آگے سمندر ہے‘‘......تو ’’آگے سمندر ہے‘‘ کے بعد مجھے کوئی ناول لکھنا ہے یا کہانیاں ہی لکھتے رہنا ہے، یہ طے تو نہیں ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ یہ ناول جس طریقے سے ختم ہوتا ہے تو مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ صورتِ حال مجھ سے کچھ اور تقاضا کر رہی ہے تو شاید اس تسلسل میں اور کوئی ناول لکھا جائے گا۔ وہ اسی کا حصہ ہوگا یا اس کی کوئی الگ حیثیت ہوگی، یہ میرے ذہن میں نہیں ہے اور یہ بھی کہ میں لکھ بھی پاؤں گا یا نہیں لکھ پاؤں گا۔ لیکن مجھے ایک احساس ضرور ہے، ایک مبہم سا احساس کہ اس ناول کا انجام مجھ سے کچھ تقاضا کر رہا ہے۔

چودھری ابن النصیر: ناول اور افسانے کا جو فرق ہے وہ آپ پر عیاں ہے۔ آپ جو ناول لکھتے ہیں، اس کی جو تقسیم ہوتی ہے، جو ماحول ہوتا ہے، جو فضا ہوتی ہے وہ سب افسانے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ تو افسانے لکھتے وقت آپ جن کیفیات سے گزرتے ہیں ان میں آپ کس طرح کا فرق محسوس کرتے ہیں؟

انتظار حسین: ناول تو ایک بڑا کام ہوتا ہے، کہانی لکھنے کی بہ نسبت۔ کہانی لکھی تو اس سے ایک فرحت تو ملتی ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے ایسی کہانی لکھی اور فوراً ہی پتا چل جاتا ہے کہ اچھی کہانی لکھی ہے یا ذرا کمزور کہانی ہے۔ اگر ہمیں پتا نہیں چلتا تو میرے دوست ہیں اور جو میرے دشمن ہیں، ان کے واسطے سے یہ چل جاتا ہے کہ میں نے یہ کام اچھا کیا ہے۔ میں نے کہانی اچھی لکھی ہے یا کہانی بری لکھی ہے۔ ان کے ردِّعمل کے حوالے سے بھی میں سوچتا ہوں اور میرا اپنا ردِّعمل ہوتا ہے۔ اچھا! میں ان لکھنے والوں میں نہیں ہوں جو لکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے بہت تیر مارا ہے اور اب جو کچھ لوگ اِرد گِرد رہ رہے ہیں بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔ تو مجھے اتنی خوش فہمی اور خود فریبی کبھی نہیں رہی۔ لیکن میں ایک امتیاز ضرور کرتا ہوں کہ ایک تو وہ حلقہ ہے قارئین کا اور میرے دوستوں کا جن کی رایوں پر میں اعتبار کرتا ہوں تو میں ان کی رایوں کو ضرور دیکھتا ہوں کہ یہ میری کہانی کے بارے میں یا ناول کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ باقی جو بڑا حلقہ ہے، ہم عصروں کا نقادوں کا اور قارئین کا......ان کی رائیں میں سنتا ضرور ہوں لیکن اس پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔ اور ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ وہی تحریر جس کے بارے میں میرے دوستوں کی رائے کچھ اور ہوتی ہے اور جو فضا



ہے، ہماری ادبی فضا اس میں مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، ایک تو یہ بات ہے۔ ناول خاصا وقت لیتا ہے۔ دیر میں تکمیل پاتا ہے کہ مجھے محسوس ہو کہ ناول اپنے انجام تک آ گیا۔ تو ظاہر ہے کہ اگر اس میں یہ احساس ہو کہ ہم نے کوئی ٹھیک کام کیا ہے تو زیادہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ناول کو میں مسلسل کبھی نہیں لکھتا۔ اس طریقے سے کبھی نہیں لکھا کہ شروع کیا تو ختم کر کے دم لیا۔

ہاں ’’چاند گہن‘‘ تو ذرا کم عرصے میں لکھ لیا لیکن ’’بستی‘‘، ’’تذکرہ‘‘ اور ’’آگے سمندر ہے‘‘ کو میں نے آغاز کیا کچھ حصہ لکھا اور پھر چھوڑا اور اس کے بعد کئی سالوں کے بعد دھیان آیا کہ وہ ناول جو ہے اب اسے کچھ کرنا چاہیے۔ پھر میں کچھ کرتا ہوں اس پر، کچھ کام کرتا ہوں، کچھ کاٹتا ہوں، کچھ پیٹتا ہوں تو کئی برسوں میں جا کر ناول پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ’’بستی‘‘ کے بارے میں بھی یہی ہوا تھا اور اب بھی یہی ہوا ہے۔ کوئی ایک خاص صورتِ حال ہوتی ہے جس میں میرے اندر اُبال اُٹھتا ہے اور میں آغاز کر دیتا ہوں کام کا، لیکن ایک تسلسل میں وہ کام نہیں ہوتا، وقفے کے بعد پورا ہوتا ہے۔

ضیاء الحق: ’’آگے سمندر ہے‘‘ آپ نے کتنے عرصے میں لکھا؟

انتظار حسین: میرے خیال میں یہ کوئی پانچ چھ سال کا زمانہ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا میں نے مسلسل نہیں لکھا، یہ نہیں کہ پانچ سال تک اس پر غور و فکر کرتا رہا، کاٹتا پیٹتا رہا بلکہ ایک حصہ لکھا پانچ سال پہلے اور چھوڑ دیا اور بھول گیا کیوں کہ آگے قلم نہیں چل رہا تھا اور سوچا کہ پھر دیکھوں گا کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ تو پھر کئی سال کے بعد اس پر سوچ بچار کیا اور اسے پھر میں نے شروع کیا کہ اب اسے مکمل ہونا چاہیے، پھر بہت تیزی سے میں نے لکھا اس کو مکمل کیا۔

ضیاء الحق: کیا آپ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ ناول کچھ تقاضا کر رہا ہے کہ اسے آگے اور بڑھایا جائے؟ یہ احساس پڑھنے والے کو تو ہوتا ہے کہ ناول کچھ اور مطالبہ کر رہا ہے؟

انتظار حسین: جس طریقے سے اس کہانی میں صورتِ حال بیان ہوئی ہے اور جس طریقے سے ختم ہوئی ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ ابھی آگے بہت کچھ پڑھنے والے کے لیے ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی: اس میں لیکن فرق ہے کہ ضیاء بھائی کا تو معاملہ یہ ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ابھی ناول حل تک نہیں پہنچا ہے اور حل مانگ رہا ہے اور آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ناول

ابھی اپنے فنی ارتقا کی آخری منزل تک نہیں پہنچا ہے یا تکمیل تک نہیں پہنچا۔

ضیاءالحق: نہیں معاف کیجیے گا، حل کی بات نہیں بلکہ......

انتظار حسین: میرے خیال کے مطابق یہ ناول مکمل ہے اپنی جگہ پر۔ وہ جو صورتِ حال ہے اور اس میں جو میرا Involvement ہے، وہ صورتِ حال مجھ سے تقاضا کر رہی ہے کہ ابھی اس کا بیان اور اس کی تفہیم باقی ہے کیوں کہ وہ صورتِ حال تو ابھی ہے۔

چودھری ابن النصیر: آپ نے ''بستی'' لکھا پھر اس کے بعد ''تذکرہ'' لکھا۔ کچھ لوگوں نے اسے ''بستی'' کا Extension سمجھا اور اب بھی بعض لوگ دونوں کو اکائی سمجھ کر ان پر گفتگو کرتے ہیں۔ کیا ''آگے سمندر ہے'' کے بعد بھی کوئی ایسی صورت ہے دوسرے ناول کے بننے کی؟

انتظار حسین: یہ تو قاری کا خیال ہے۔ ''بستی'' بالکل الگ ہے ''تذکرہ'' بالکل الگ۔ میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن بعض ناول ایسے لکھے گئے کہ Trilogy بن گئے یا دو ناول اپنی جگہ پر الگ الگ ہیں لیکن وہ ایک سلسلے کی کڑی ہیں۔ تو میرے ذہن میں یہ آ رہا ہے کہ شاید......شاید کی بات ہے، کہ ایک اور ناول اس طرح لکھا جائے جو اس میں ایک تسلسل قائم کر سکوں۔ یہ لازم نہیں ہے لیکن یہ گنجائش مجھے نظر آ رہی ہے۔

اسرار گاندھی: تو آپ پوری طرح مطمئن نہیں ہیں، کچھ اور لکھنے کو جی چاہتا ہے؟

انتظار حسین: جی نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ اس ناول کے سلسلے میں میری کوئی بے اطمینانی نہیں ہے۔ یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ ناول اپنی جگہ پر مکمل ہے میری دانست میں۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ جس آشوب میں ہم وہاں ہیں، وہ ابھی موجود ہے تو شاید اس میں کچھ ایسی جہتیں ہیں، کچھ اور چیز ہے اس میں ایسا پہلو ہے یا اس میں نظر آ رہا ہے کہ کچھ اور ہونے والا ہے تو شاید میرا قلم پھر چل پڑے اور پھر کوئی ایسی تحریر لکھی جائے جس سے اس کا رشتہ خاصا مربوط ہو۔

اسرار گاندھی: انتظار صاحب، آپ افسانہ نگار ہیں، ناول نگار ہیں اور صحافی بھی ہیں۔ بعض صحافی جو ناول نگار بھی رہے ہیں مثلاً خواجہ احمد عباس یا ظفر پیامی، ان کے جو ناول ہیں ان میں صحافت کا رنگ غالب ہے یا اسلوب صحافیانہ ہے۔ لیکن آپ کے ناولوں میں ایسی بات نظر نہیں آتی بلکہ آپ کی شخصیت اس عہد کے وقائع نگار کی طرح بن کر



سامنے آئی ہے۔ جہاں ادب ہی ادب ہے، صحافت بالکل نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

انتظار حسین: آپ نے بالکل جائز سوال کیا ہے، کیوں کہ میں پیشے کے اعتبار سے ایک اخبار نویس ہوں، لیکن میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے محض کالم نگاری نہیں کی بلکہ میرا کام Sub Editor سے شروع ہوا تھا۔ باقاعدہ Desk پر کام کیا اور اخباروں میں جو کام ہوتے ہیں وہ ایک مرحلے تک میں کرتا رہا۔ ایک مرحلے پر آ کر جب میں نے ''مشرق'' میں شمولیت اختیار کی تو میں وہاں صرف کالم نگار کی حیثیت سے کرتا رہا، لیکن اس سے پہلے اخبار نویسی کے جو مراحل ہوتے ہیں وہ سب طے کر چکا تھا تو اخبار نویسی میرا پیشہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ لیکن میں نے شروع سے ہی ایک بڑی تقسیم اپنے اندر کر رکھی تھی کہ میں اخبار نویس ہوں، یہ میری اخبار نویسی ہے اور میں افسانہ نگار ہوں اور یہ میری افسانہ نگاری ہے۔ اور یہ تقسیم ایک وقت میں اتنی سخت تھی کہ اگر میں کبھی کوشش یہ کرتا کہ اس تقسیم کو شکست کر دوں، تو نا کام رہتا۔ چونکہ 'مشرق' میں صرف کالم لکھنا میرا کام تھا، باقاعدہ ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی کہ دفتر میں جا کر بیٹھوں۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ آج دفتر نہیں جاتا، مجھے اور دوسرے کام ہیں، میں گھر بیٹھ کر کالم لکھوں گا اور اُنھیں دیتا ہوا چلا جاؤں گا۔ لیکن میں کبھی گھر پر بیٹھ کر کالم نہیں لکھ سکا اور ایک بات یہ کہ میں افسانہ اور ناول ہمیشہ قلم سے لکھتا ہوں Fountain Pen سے۔ کالم میں نے کبھی قلم سے نہیں لکھا، اسے Ball Pen سے لکھتا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اخبار کا دفتر آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں کاغذ خاص طرح کا ہوتا ہے، پیلا کاغذ......اس کاغذ پر میں افسانہ نہیں لکھ سکتا، لیکن کالم سفید کاغذ پر نہیں لکھ سکتا۔ میں دفتر میں جا کر بیٹھتا ہوں، وہاں ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ مشین چل رہی ہے، شور ہو رہا ہے، چائے آ رہی ہے، کوئی Visitor آ گیا ہے۔ میں اسی دوران کہیں بیٹھا اپنا کالم لکھتا جاتا ہوں اور وہ مکمل ہو جاتا ہے۔ جب میں Retire ہو گیا ''مشرق'' سے اور مسئلہ یہ ہوا کہ مجھے گھر بیٹھ کر ہی کالم لکھنا ہے تو اب میرے لیے بڑی مشکل پیش آئی۔ لیکن خوش قسمتی میری یہ تھی کہ اب میں اردو کا کالم نہیں لکھ رہا تھا، انگریزی میں لکھ رہا ہوں۔ اب یہ ہے کہ میں انگریزی میں جو کالم لکھتا ہوں تو میں سفید کاغذ پر لکھتا ہوں۔ اردو میں جو کالم لکھ رہا ہوں وہ سفید کاغذ پر نہیں لکھ سکتا، وہ پیلے کاغذ پر لکھتا ہوں۔ یہ میرے اندر کی تقسیم ہے۔ اس لیے

میں کبھی بھی اپنی اخبار نویسی کی ادبی تحریروں کو ادبی تحریروں کے ساتھ Confuse نہیں ہونے دیا۔ ہاں ایک بات اور، ایک چھوٹا سا انتخاب ایک صاحب نے میرے کالموں کا چھاپنے کا ارادہ کیا اور میں نے اس پر دیباچہ لکھا تھا۔ اس میں میں نے صاف عرض کر دیا کہ جو شخص میری اس کتاب کو میری ادبی کاوش کے طور پر پڑھے گا وہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہوگا۔ میں اسے ادبی کارنامے کے طور پر پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ میری صحافیانہ تحریروں کا مجموعہ ہے۔

چودھری ابن النصیر: آپ کا یہ جو ادبی سفر ہے فکشن نگاری کا سفر ہے۔ یہ پچاس برسوں پر محیط ہے اور آپ اپنے افسانوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اپنے تخلیقی عمل کی آپ کو آگہی ہے۔ آپ نے کیا کبھی یہ محسوس کیا کہ کسی معاصر افسانہ نگار میں آپ کے اندر کا افسانہ نگار کسی شکل میں موجود ہے؟ کیا آپ اپنے اندر کی کیفیتوں کو دوسرے افسانہ نگاروں کی تحریروں میں پاتے ہیں؟

انتظار حسین: نہیں، یہ سب تو کبھی نہیں ہوا۔ لیکن یہ کہ ۱۹۶۰ء کا جو دور شروع ہوتا ہے اور یہ جو نیا افسانہ آتا ہے، علامتی اور تجریدی افسانہ تو بعض افسانہ نگاروں کے بارے میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شاید میری ذہنی قربت ان سے ہو۔ یعنی یہ افسانہ نگار ہیں جو زیادہ معنی رکھتے ہیں۔ مثلاً خالدہ حسین اور اتفاق سے میں اس وقت ''ادب لطیف'' کا ایڈیٹر تھا۔ ان کی جو کہانیاں شروع کی ہیں انہوں نے اسی رنگ میں لکھیں وہ ''ادب لطیف'' میں ہی شائع ہوئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ افسانہ نگار ایسی ہے جو بہت بامعنی افسانہ لکھ رہی ہے، اس وقت تک ان کی اتنی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔

چودھری ابن النصیر: یعنی وہ افسانے جو انہوں نے خالدہ اصغر کے نام سے لکھے۔

انتظار حسین: جی ہاں!...... تو بہت Excitement مجھے محسوس ہوا۔ جب میں نے ان کے افسانے پڑھے یا مثلاً سریندر پرکاش کے ایک دو افسانے جو ''شب خون'' میں اس زمانہ میں شائع ہوئے تھے، میں نے دیکھے تو میں نے یہ کہا کہ یہ افسانہ نگار ایسے ہیں جن کے ساتھ میرا کوئی رشتہ بن سکے۔

چودھری ابن النصیر: اب یہ جو خالدہ حسین ہیں یا سریندر پرکاش ہیں۔ ان کے بعد کی نسل ہندوستان یا پاکستان میں جیسے رشید امجد، مرزا حامد بیگ ہیں یا محمد منشا یاد ہیں۔ کراچی



میں دو چار نام ہیں...... کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے یہاں آپ کے اثرات ہیں یا ان میں آپ کی طرح کا افسانہ لکھنے کی صلاحیت ہے؟

انتظار حسین: میرے خیال میں اپنے اپنے طور پر یہ سب افسانہ نگار اپنے افسانے لکھ رہے ہیں اور مجھے تو اب کوئی احساس نہیں ہوتا کہ مجھ سے ان کا کوئی ذہنی رشتہ یا اس قسم کا رشتہ ہو۔ انہوں نے مجھ سے کوئی اثر قبول کیا ہو یا میں نے اثر قبول کیا ہو اور ایک بات ہے کہ ہم عصروں سے رشتہ بڑا پیچیدہ قسم کا ہوتا ہے۔ ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ کے ہم عصر جو لکھ رہے ہیں تو آپ نے اگر ایک کو پسند کر لیا ہے تو ہمیشہ پسند کرتے چلے جائیں۔ یہ بڑا جدلیاتی قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ آپ کی ان سے چشمک ہوتی ہے اور ان سے تھوڑا رشک اور حسد بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ صاحب یہ کیا لکھ رہے ہیں۔ اصل میں تو میں لکھ رہا ہوں۔ تو یہ بہت سے خیالات ہوتے ہیں جو بیک وقت ان لوگوں کے بارے میں ہوتے ہیں جو میرے ہم عصر ہیں...... میرے جونیئر ہم عصر ہیں۔ تو ان سے رشتہ اسی قسم کا ہے کہ کبھی کہانی پسند آ گئی اور کبھی مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ کیا بکواس لکھ رہے ہیں...... تو یہ دونوں قسم کے رشتے ہوتے ہیں۔

چودھری ابن النصیر: یہ تو پاکستان کی بات ہوئی۔ ہندوستان کے سلسلے سے......؟

انتظار حسین: میں اس طریقے کی تقسیم نہیں کرتا۔ مثلاً ۱۹۶۰ء میں جو لکھنے والے آئے ہیں۔ مینرا، سریندر پرکاش...... بعد میں قمر احسن اور نیر مسعود وغیرہ۔ تو ان سے میرا رشتہ بھی اسی قسم کا ہے جس طرح انور سجاد سے ہے یا خالدہ حسین سے۔

چودھری ابن النصیر: ایک بات یہ بھی ہے کہ ان دنوں علامتی افسانے یا تجریدی افسانے کے بارے میں شکایتی لہجہ اختیار کرنا ایک فیشن بن گیا ہے اور ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے آس پاس لکھے جانے والے افسانوں کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں انہیں ہدفِ ملامت بنانا درست ہے۔؟

انتظار حسین: اس سلسلے میں ایک بات عرض کروں گا۔ جب یہ علامتی یا تجریدی افسانہ شروع ہوا ہے تو نقادوں نے بہت لبیک کہا اسے اور اس طریقے سے لبیک کہا کہ جیسے حقیقت نگاری کا افسانہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور جو اچھے لکھنے والے تھے، درمیانہ درجہ کے لکھنے والے تھے اور برے لکھنے والے تھے سب کی انہوں نے پذیرائی کی اور ہر جگہ ان کی تعریفیں

ہوئیں۔ پھر اچانک نقادوں نے پینترے بدلے اور اب وہ سب لاٹھی چارج کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دور کے افسانے سے کہانی گم ہوگئی تھی اب کہیں کہانی واپس آ رہی ہے اور تکنیک واپس آ رہی ہے۔ تو جو یہ تضاد ہے اور عمل ہے نقادوں کے یہاں اور قارئین کے یہاں کہ ایک وقت میں بہت لبیک کہا افسانے کو اور اب اس کی مذمت کر رہے ہیں، یہ توجہ طلب ہے۔ لیکن میں ان دونوں میں شامل نہیں ہوں کیوں کہ میں اس وقت زور دار لبیک کہنے والوں میں کبھی نہیں رہا اور نہ اب لعن طعن کرنے والوں میں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے اس دور میں جو کچھ علامتی افسانہ کے نام پر لکھا گیا اس میں رطب و یابس رہا ہو۔ لیکن اس وقت یہ عمل بہت ضروری تھا کیوں کہ تجربہ تو جاری رہنا چاہیے نا!

ہمارا اردو افسانہ ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں ایک جمود کا احساس ہو رہا تھا اور اسے توڑنا بہت ضروری تھا اور جب نیا تجربہ ہوتا ہے تو اس میں رطب و یابس بہت لکھا جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا جب آزاد نظم کا دور شروع ہوا تھا تو اس زمانے میں بھی رطب و یابس بہت زیادہ لکھا گیا تھا تو اگر علامتی اور تجریدی افسانے کے نام پر رطب و یابس لکھا گیا تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ اردگرد رطب و یابس نہ ہو تو اچھی تحریر کیسے نکلے گی؟ وہ جو ایک عمل ہوتا ہے نا بے معنی لکھنے کا، فضولیات لکھنے کا، اس عمل سے ہی کچھ اچھی چیزیں نکلتی ہیں۔ ہم تجربہ کر رہے ہیں تو خراب بھی لکھیں گے، بے معنی بھی لکھیں گے اور اچھا بھی لکھیں گے۔ تو یہ پورا ایک حرکیاتی Dynamic عمل ہے۔ میں سمجھتا ہوں اردو افسانے کا یہ عمل بہت اہم ہے۔ اب آپ نقاد صاحبان Assessment کریں کہ اس عمل نے افسانے کو کتنا دیا اور اس میں کتنا بے معنی ہے اور کتنا بامعنی ہے۔

اسرار گاندھی: آپ کہانی لکھنے کے عمل سے کیسے گزرتے ہیں؟ کیا ایک نشست میں یا دو، تین نشستوں میں کہانی لکھتے ہیں؟

انتظار حسین: مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی کوئی کہانی میں نے جھٹکے میں لکھی ہو۔ میں ان لکھنے والوں میں ہوں جو بہت سست رو ہیں۔ مہینوں کہانی ذہن میں پکتی رہی اور پھر اس کے بعد کسی وقت لکھ بیٹھتا ہوں اور پھر بھی لکھنے کا عمل بہت تیز نہیں ہوتا باوجود یکہ ذہن میں



بہت کچھ پک پکا جاتا ہے۔ میں کہانی بڑی آہستہ روی سے لکھتا ہوں، ایک نشست یا دو نشست میں مکمل نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات کئی ہفتے لگ جاتے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی: ابھی آپ نے چودھری کے جواب میں ایک بات کہی تھی کہ علامتی افسانہ جو آیا تو نقادوں نے اس کا بڑا خیر مقدم کیا اور بعد میں نقاد لوگ ہی برا کہنے لگے، یعنی اس کے خلاف ردِعمل ہونے لگا تو وہ کون سے نقاد ہیں؟ کیوں کہ ہم لوگوں میں یعنی ہندوستان کی جو صورتِ حال ہے تو یہاں جو نقاد ہیں ان میں سے بعض نے علامتی افسانے کو تب ناپسند کیا اور اب بھی ناپسند کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر ترقی پسند نقاد یا افسانہ نگار ہیں اور جن لوگوں نے علامتی افسانے کو تب پسند کیا وہ اب بھی پسند کرتے ہیں، جیسے میں ہوں۔ یہ بات جو آپ نے کہی کہ نئے طرز میں بہت رطب و یابس آتا ہے یہ بات سچی ہے۔ یہاں بھی اچھا یا برا جو بھی آیا اسی سے اچھا نکلا بھی۔ تو کیا کہ پاکستان میں ایسے نقاد ہیں جنہوں نے پہلے علامتی افسانے کا خیر مقدم کیا اور اب اس کے منکر ہو گئے ہیں؟

انتظار حسین: میں افراد کا نام کیا لوں، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت جو نقاد مثلاً آپ ہیں یا دوسرے ہیں سب خیر مقدم کر رہے تھے اس نئے اسلوب کا...... تو جب یہ ردِعمل شروع ہوا اس کے خلاف تو یہ سب نقاد خاموش ہو گئے...... اس کے دفاع میں سامنے نہیں آئے۔ نقاد کہتے ہیں کہ کہانی واپس آ رہی ہے؟ کیا اسی طرح سے واپس آ رہی ہے جس طرح منٹو نے لکھی تھی، کرشن چندر نے لکھی تھی یا راجندر سنگھ بیدی نے لکھی تھی؟ اگر ہاں تو اس کا مطلب ہے کہ افسانہ اپنے آپ کو دہرا رہا ہے یعنی تکرار ہے۔ لیکن کہانی اس طرح سے واپس آہی ہے کہ منٹو کی کہانی سے الگ ہے، یا کرشن چندر کی کہانی سے الگ ہے تو یہ کوئی نقاد بتاتا نہیں بس یہی کہتا ہے کہ کہانی واپس آ رہی ہے۔

اسرار گاندھی: ان کا مطلب ہے کہ کہانی سمجھ میں آنے لگی ہے۔ (ہنسی)

شمس الرحمٰن فاروقی: آپ نے یہ بات کہی ہے کہ جب علامتی یا تجریدی افسانے پر یلغار ہونے لگی تو نقاد اس کے دفاع میں نہیں آئے۔ چونکہ میں خود کو نقاد سمجھتا ہوں، اس لیے اپنی طرف سے میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے علامتی تجریدی افسانے کا دفاع بھی کیا اور اس کی تفہیم بھی کرنے کی کوشش کی، سمجھایا بھی اور سمجھا بھی ان کو، اور یہ سوال بھی کیا کہ

کہانی واپس آنے سے ان کی کیا مراد ہے؟ اور جیسا کہ اسرار گاندھی کہہ رہے ہیں اگر کہانی واپس آنے سے مراد یہ ہے کہ کہانی سمجھ میں آرہی ہے تو اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب ہم اس طرح کے افسانے کے عادی ہو گئے ہیں، اس لیے سمجھ میں آنے لگی ہے۔ پہلے ہم اس کے عادی نہیں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی نئے طرز کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تو اس طرز کو اختیار کرنے والے اپنا دفاع بھی پیش کرتے ہیں یا اگر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ یہ سوال تو بہت درست ہے کہ ''کہانی واپس آرہی ہے'' سے کیا مراد ہے؟ اگر یہی مراد ہے کہ منٹو والا افسانہ پھر آگیا یا پریم چند کا افسانہ آگیا تو یہ تو تکرار ہوئی اور تاریخ واپس جارہی ہے، یہ تو ہوا نہیں ہے۔ اور افسانہ آگے بڑھا۔ لہٰذا یہ بات مہمل ہے کہ ''کہانی واپس آرہی ہے''۔ لیکن یہ سوال ضرور اُٹھ سکتا ہے کہ تب سے اب تک افسانہ آگے بڑھا کہ نہیں؟ اور اگر آگے بڑھا تو پریم چندی ماڈل کو دوبارہ اختیار کرنے کے سبب یا اس باعث کہ علامتی تجریدافسانے نے آگے بڑھنے کی راہیں ہموار کیں؟

انتظار حسین: اس سوال کا جواب کہ آگے بڑھا ہے کہ نہیں...... ہمارے بعض نقاد ایسے ہیں جن کے کچھ تعصّبات ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر بہت اچھے نقاد ہیں مثلاً میرے دوست وارث علوی ہیں، اب میں نام لیتا ہوں۔ بہت اچھے نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں پسند کرتا ہوں لیکن فکشن کے سلسلہ میں ان کے خاص تعصّبات ہیں۔ مثلاً وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت نگاری معراج ہے اپنی جگہ اور حقیقت نگاری سے آگے کوئی اسلوب ایسا نہیں جس میں افسانہ نگار اپنا اظہار کرسکتا ہے۔ اس تعصب کو لے کر وہ تنقید لکھتے ہیں تو ان کے لیے یہ سارا افسانہ جو حقیقت نگاری سے ہٹ کر لکھا گیا ہے، بے معنی ہے بلکہ......

شمس الرحمٰن فاروقی: بلکہ ناقابلِ فہم ہے۔

انتظار حسین: جی ہاں! اب وہ جب باہر کے حوالے لاتے ہیں اور مغرب کی بھی، تو انیسویں صدی سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کے نزدیک ڈکنس ہی معراج ہے، ڈکنس سے آگے ان کے لیے کچھ نہیں...... جس نقاد کے تعصّبات اس قسم کے ہوں تو پھر اس سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ جو نیا اسلوب آیا ہے وہ اسے ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ آپ نے جو سوال کیا ہے کہ کیا افسانہ آگے بڑھا ہے تو میں ابھی



تک عرض کر رہا تھا کہ ۱۹۵۰ء تک ہمارا افسانہ ایک منزل تک پہنچ چکا تھا، جس کے بعد حقیقت نگاری سے انحراف کیا گیا اور ایک بغاوت ہوئی اس کے خلاف اور لکھنے والوں نے اپنے اپنے تئیں ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کی۔ تو میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ افسانہ آگے بڑھا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، تجربے میں تو یہ ہوتا ہے کہ بہت کچھ بے معنی بھی لکھا جائے گا اور کسی بھی اچھے لکھنے والے کو بے معنی اور لغو لکھنے سے شرمانا نہیں چاہیے۔

شمس الرحمٰن فاروقی: سبحان اللہ، عمدہ بات کہی آپ نے اور لکھنے والے کا تو حق ہے کہ وہی لکھے جو اس کے جی میں آتا ہو۔

انتظار حسین: میں تو سمجھتا ہوں کہ میں افسانہ ہی لکھتا چلا جاؤں اور لوگوں کی سمجھ میں آتا جائے، بڑی آسانی سے، تو پھر یہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے۔

اسرار گاندھی: اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج جو افسانہ سامنے آیا ہے وہ رطب و یابس کے لکھے جانے کے بعد ہی اس ارتقائی منزل تک پہنچا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی: بے شک میں تو یہ کہتا ہوں کہ آج جو لکھا جارہا ہے وہ وجود ہی میں نہ آتا اگر ۱۹۶۰ء کی نسل نے اس کے لیے راہ ہموار نہ کی ہوتی، نئے نئے امکانات کو روشن نہ کیا ہوتا۔

ساجد سعید: میں اس سلسلے میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، حالانکہ میں نے آپ کے بہت زیادہ افسانے نہیں پڑھے ہیں۔ کل آپ نے جو افسانہ سنایا تھا ''جبالا کا بیٹا'' اس پر جاتک کہانیوں کا بہت اثر ہے۔ کل بھی آپ بات کر رہے تھے Legend کی۔ آپ جو Legend کو اپنی کہانیوں میں لیتے ہیں تو آپ شاید نہیں دیکھتے کہ وہ Legend وقت کے ساتھ کیسے بدل رہا ہے۔ مطلب یہ کہ جو Legend ہے وہ بالکل Solid اور Firm ہے، اسے آپ Pick up کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ عمل بالکل Straight اور Simple معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس Legend پر کوئی Limitation Impose نہیں کر رہے ہیں، وہ جیسی ہے آپ نے اس کو اسی طرح سے پیش کر دیا۔ آپ کے خیال میں ان کی Appeal ابھی تک کیوں بنی ہوئی ہے؟ تو کیا وجہ ہے کہ ابھی بھی لوگ اس اسلوب کو پسند کرتے ہیں اور ہر آدمی ان سے خود Identity کر لیتا ہے؟

انتظار حسین: اس سلسلے میں عرض کروں کہ مثلاً کوئی Legend یا پرانی کہانی ہے اور مجھے اس میں گنجائش نظر آتی ہے کہ اسے لوں اور اپنی کہانی میں لکھوں تو اب اس میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ یہ قدیم زمانے میں لکھی گئی تھی تو اس کی اس زمانے میں کوئی Relevance ہے یا نہیں؟ پہلا سوال تو پڑھنے والے کے ذہن میں آئے گا لیکن میں اس طرح سے غور نہیں کرتا۔ میں اس زمانے میں زندہ ہوں اور اپنے عہد سے پیوست ہوں اور میرا شعور اپنے زمانے سے پیوست ہے اور جب اس کہانی کو دوبارہ لکھوں گا تو مجھے شعوری طور پر یہ کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ اسے اپنے زمانے کے ساتھ پیوست کردوں، اس لیے کہ جب میں اپنے زمانے کے ساتھ پیوست ہوں ہی تو جب میں اس کہانی کو دوبارہ لکھوں گا اور واقعی تخلیقی صلاحیت کے ساتھ لکھوں گا تو یہ کہانی وہ نہیں رہے گی جو کسی گذشتہ یا موجودہ زمانے تک محدود ہو لیکن اس زمانے سے بھی اس کا کوئی نہ کوئی تعلق رہے گا۔

ساجد سعید: کیا یہ Cultural Ethos کی اپیل تو نہیں؟

انتظار حسین: دوسری بات یہ کہ یہ وہ کہانیاں ہیں جن میں پوری انسانی تاریخ اور دیومالائی کہانیاں یا اور پرانی کہانیاں ہیں یا داستانوں میں جو کہانیاں آتی ہیں، ایک بڑے اجتماعی شعور کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ ہمارے شعور کی، ہمارے لاشعور کی، ہمارا Ethos ہے یا ہمارا تہذیبی شعور ہے......اس کا ان میں کسی طرح اظہار ہوا ہے اور جب میں ان کہانیوں سے اپنا رشتہ جوڑتا ہوں اور ان کہانیوں کو دوبارہ لکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پوری تہذیب سے اور اپنا جو دل و دماغ ہے، اپنی تاریخ ہے، ان سے میرا رشتہ استوار ہو رہا ہے۔ لہٰذا میں صرف اس زمانے میں بیٹھ کر نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ پیچھے جو زمانہ گزرا ہے، جو روایت ہے، جو میری تاریخ ہے، اس کی قوت کے ساتھ میں لکھ رہا ہوں۔

چودھری ابن النصیر: آپ نے جتنا کام کیا ہے آپ اس سے کس حد تک مطمئن ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ سے زیادہ Impact آج شاید کسی اور فکشن نگار کا نہیں ہے۔ جو لوگ آپ سے عمر میں کم ہیں ان پر Impact کچھ زیادہ پڑا ہے اور میں سمجھتا ہوں سب پر تھوڑا بہت پڑا ہے۔ جب آپ پچاس برس کی اپنی ادبی زندگی دیکھتے ہیں تو



آپ کے تاثرات کیا ہوتے ہیں؟

انتظار حسین: اچھا ایک بات تو یہ ہے کہ جیسے لکھنے والوں کو یہ زعم ہوتا ہے کہ میں نے اپنے عہد کو متاثر کیا ہے یا میں کوئی Trend Setter ہوں یا جو مجھ سے جونیئر ہیں وہ متاثر ہیں تو اس قسم کا زعم یا اس قسم کی خوش فہمی کبھی مجھے نہیں رہی اور اگر کسی نے اثر کو قبول کیا تو یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن اس کی وجہ سے میر......

شمس الرحمٰن فاروقی: نفس موٹا نہیں ہوا۔

انتظار حسین: جی ہاں! نفس موٹا نہیں ہوا۔ میں عرض کروں گا کہ کہانی لکھتے وقت ایک یہی احساس رہا کہ میں کہانی لکھ رہا ہوں اور میں نے جو اتنی تعداد میں کہانیاں لکھی ہیں اور ناول جو اب چار ہو گئے ہیں، اگر مجھے یہ احساس ہو جائے کہ میں نے بہت تیر مارا ہے اور کارِنمایاں انجام دیا ہے تو میں شاید چُپ ہو جاؤں گا اور جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ اس ناول کے بعد بھی مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے کچھ اور لکھنا ہے اور لکھنا چاہیے۔ اطمینان تو نہیں ہے لیکن بے اطمینانی بھی نہیں ہے، مجھے احساس ضرور ہے کہ کچھ کہانیاں میں نے ایسی ضرور لکھی ہیں جن کو میرے ہم عصر اور نقاد شاید اہمیت دیں گے اور ان کی وجہ سے میری کوئی چھوٹی موٹی جگہ بن جائے اردو فکشن کی عمارت میں، لیکن مجھے زیادہ خوش فہمی نہیں ہے۔

ضیاء الحق: ابھی آپ نے ذکر کیا ہے کہ تاریخ اور روایت کا، تو آپ اس کا دائرہ اور حد کسی خاص علاقے میں محدود رکھتے ہیں یا عالمی پیمانے پر دیکھتے ہیں؟

انتظار حسین: میں ہمیشہ اپنے آپ کو ایک تاریخ سے وابستہ کرتا رہا ہوں۔ ایک تو اس برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ایک تاریخ بنی شروع ہوئی اور جسے میں ہنداسلامی تاریخ کہتا ہوں۔ ہنداسلامی تاریخ و تہذیب سے میری جذباتی وابستگی ہے۔ پھر اس تاریخ سے پہلے کی مسلمانوں کی تاریخ، وہ بھی ہے جہاں سے اسلام شروع ہوتا ہے۔ پھر اس برصغیر میں آ کر اس کی وجہ سے ایک نئی تاریخ بنتی ہے۔ تو اس ہنداسلامی تاریخ سے وابستگی مسلمانوں کی جو مجموعی تاریخ ہے اس سے وابستگی پر میرا Basel ہے۔ پھر مجھے ایک وقت میں یہ احساس ہوا کہ یہ جو ہنداسلامی تاریخ ہے تو اس ہندوستان کی بھی ایک تاریخ ہے۔ اس سے بھی میرا کوئی رشتہ ہے کہ نہیں؟ یہ سوال میرے ذہن میں

پیدا ہوا تو کہانیوں کے واسطے سے میں اس تاریخ تک پہنچا۔ قدیم ہند میں جو کہانیاں جو لکھی گئیں اور پھر وہ کہانیاں سفر کرتی ہوئی ایران اور عرب میں پہنچیں اور دوسری شکل میں ہم تک پہنچیں، تو یہ جو سفر ہے کہانی کا تو اس سفر سے اس کے حوالے سے اصل کہانیوں سے میرا رشتہ بنا۔ پنچ تنتر ہے، کتھا سرت ساگر ہے، بیتال پچیسی ہے، سنگھاسن بتیسی ہے۔ میں نے ان کہانیوں میں جب سفر کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں گویا ایک نئی دنیا دریافت کر رہا ہوں۔ مہاتما بُدھ کی جا تک کتھائیں پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ اس جزیرے کا...... کہانیوں کا یہ جو جزیرہ ہے اس کا مجھے کوئی پتا نہیں تھا اور نہ ہی کسی اردو نقاد نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا تو ایسا احساس ہوا کہ جیسے میں کولمبس ہوں اور میں نے امریکہ دریافت کر لیا اور ان میں سفر کرتے ہوئے پھر مجھے کتھا ساگر کی جلدیں نظر آئیں۔ میں نے اُنہیں پڑھنا شروع کیا۔ میں نے سوچا کہ الف لیلیٰ تو میں نے پڑھی تھی وہ اپنی جگہ پر فکشن کی بڑی کتاب ہے اور جو مسلمانوں کا غیر معمولی تخلیقی کارنامہ ہے۔ پھر کتھا سرت ساگر کیا چیز ہے؟ اسے پڑھتے ہوئے میں نے تہذیب کے نئے پہلو، اساطیر اور روایت کے نئے تناظر دریافت کیے اور میں خود کو ان چیزوں سے الگ نہیں سمجھتا۔

چودھری ابن ابن النصیر: انتظار حسین صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے فکشن کے حوالے سے ہم کو بڑی کار آمد باتیں بتائیں۔

انتظار حسین: میں بھی آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ الہٰ آباد میں آ کر میرے دماغ میں کئی دریچے کھلے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی: آپ سب حضرات کا شکریہ!

بہ شکریہ: رسالہ ''شب خون'' الہ آباد، شمارہ ۱۹۶، جولائی ۱۹۹۶ء

انتظار حسین کے اس انٹرویو کی فوٹو کاپی کی فراہمی کے لیے جناب چودھری ابن النصیر اور کمپوزنگ کروا کر بھیجنے کے لیے جناب اسرار گاندھی کا شکریہ! (ادارہ)

◄◄ ● ►►



- **گوشہ انتظار حسین**
- **عمر فرحت**

# انتظار حسین کا افسانوی چلن

## (انتظار حسین: ۷ دسمبر ۱۹۲۳ء تا ۲ فروری ۲۰۱۶ء)

ہمارے انتظار حسین بٹوارے سے قبل ۷ دسمبر ۱۹۲۳ء میں ریاست اتر پردیش کے ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے شہر لاہور میں منتقل ہو گئے۔ انہوں نے اردو ادب اور انگریزی ادب میں ماسٹرز ڈگریاں حاصل کیں۔

گذشتہ نصف صدی سے زیادہ اردو کے افسانوی ادب نے تعمیر و ترقی کی کئی منزلیں طے کی ہیں اور یہ پیش رفت بڑی تیز رفتار، کثیر الجہت اور پہلو دار رہی ہے اس لیے کہ دوسری جنگ عظیم اور پھر آزادی کے بعد ہندوستان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات میں بڑی نتیجہ خیز تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان کے اثر سے انسانی رشتے اور سماجی رویے بھی بدلے۔ تقسیم، فسادات، ہجرت، خاتمہء زمینداری، صنعتوں کا فروغ، زرعی ترقیاں، مزدوروں کی تحریکیں، تعلیم کی توسیع، ہمسایوں سے جنگیں، ہریجنوں اور اقلیتوں کے ساتھ بے انصافیاں، عدم تحفظ، بے روزگاری، بڑھتی ہوئی گرانی اور ایسے ہی دوسرے قومی مسائل نے عام انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس عہد کے اردو افسانے میں اس صورت حال سے پیدا شدہ سماجی کیفیات اور انسانی نفسیات کی پیش کش کے لیے اظہار و اسلوب، ہیئت اور تکنیک کے نو بہ نو تجربے کیے گئے۔

نئی سماجی حقیقتوں کے ادراک اور اظہار نے افسانے میں نئے رجحانات کو جنم دیا اور ان کی پرورش کے لیے راہیں ہموار کیں۔ مغرب کے افسانوی ادب میں جو رجحانات اور تجربات جگہ بنا چکے تھے اردو افسانہ ان سے بھی متاثر ہوا۔ پلاٹ کی اہمیت کم ہو گئی، افسانے کے مسلمہ اور مروجہ فنی عناصر کو برتنے سے گریز کیا جانے لگا اور اظہار و اسلوب میں نئے پیرائے اپنائے جانے لگے۔ بعض افسانہ نگاروں نے بیانیہ اور حقیقت پسندانہ تکنیک کے بجائے داخلی، ہیئتی اور علامتی اظہار پر زور بھی دیا، نتیجتاً ہر نئے تجربے کی طرح یہ سارے تجربات بھی بڑے انوکھے اور پر کشش معلوم ہوئے اور نوجوان لکھنے والوں نے اس کو ادبی فیشن کی

طرح اپنایا بھی۔

آزادی کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں نے جہاں نت نئے فنی تجربوں اور تکنیکوں سے مختصر افسانہ کے فن کو بہرہ مند کیا وہیں افسانے کی قدیم روایتی ہیئتوں کو بھی نئے اسلوب و تکنیک اور فکر و انداز میں فنکارانہ طور پر برتنے کی مسلسل کوشش کی اور اس طرح اردو افسانے کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

جہاں تک جدید افسانے میں ہیئت اور تکنیک کے تجربے کا سوال ہے تو موضوعات اور طرز اظہار کو لے کر اردو افسانوں میں نئے تفہیم اور صورت و معنی کا ایک ایسا سیلاب آیا جو قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، اقبال مجید سے لے کر انور سجاد، سریندر پرکاش، بلراج مین را، نیر مسعود، جوگندر پال اور شمس الرحمٰن فاروقی تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ جن میں سے کم و بیش تمام لوگوں نے فن کے حوالے سے تجربے بھی کیے ہیں۔

موضوع، اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے جدید افسانے کی کئی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان میں تنہائی، علاقائیت، اجنبیت، بے گانگی، کرب، اضطراب، مشینی اور صنعتی نظام، قدروں کا زوال، مایوسی، خوف، ٹوٹتے بکھرتے رشتے ناطے اور تہذیبی بازیافت اور اسی قبیل کے دوسرے موضوعات ہیں، جو اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے علامت نگاری، علامتی کردار کی پیش کش، استعارے، امیجز، تمثیل، داستانوی انداز، دیو مالا اور اساطیر، مرکب اور پیچیدہ پلاٹ، نثر میں شعری زبان کا استعمال، کلیدی جملوں کی تکرار، تجریدیت، اینٹی کلائمکس، اینٹی کردار اور اینٹی پلاٹ افسانے، شعور کی رو، آزاد تلازمہء خیال، فلیش بیک کی تکنیک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جدید اردو افسانے کی انہی خصوصیات کے تحت انتظار حسین کے ان افسانوں سے بحث کی جائے گی جن میں اسلوب، ہیئت اور تکنیک کے تجربے ہوئے ہیں۔

انتظار حسین کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے جس طرح کسی زمانے میں عصمت چغتائی اور منٹو کا ذکر کیا جاتا تھا۔ حالانکہ دونوں کے فن میں مماثلت کے ساتھ کافی اختلاف کی گنجائش بھی ہے۔ ایک چیز جو دونوں میں مشترک ہے وہ تہذیبی عکاسی، ماضی کی بازیافت کی کوشش اور اساطیری رجحان ہے۔

انتظار حسین نے اپنا افسانوی سفر ''قیوما کی دکان'' ۱۹۴۸ء سے شروع کیا اور اب تک ان کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''گلی کوچے''، ''کنکری''، ''آخری آدمی''، ''شہر افسوس''، ''کچھوے''، ''خیمے سے دور''، ''خالی پنجرہ''، ''زمین اور فلک اور'' جن کے رجحانات و موضوعات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور مختلف جہات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انتظار حسین کا ناول ''بستی''، ''چاند گہن'' اور ''آگے سمندر ہے'' بھی بہت اہم ہیں۔ ان کے افسانوں کے انگریزی تراجم کے دو مجموعے ''The



Seven Door'' اور ''Leaves'' کے نام سے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہجرت، مایوسی، ڈر اور خوف کی نفسیات، مذہبی و اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت، تقسیم ملک کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی اور سماجی حالات، ان سب سے اہم ماضی کی بازیافت، تہذیبی و معاشرتی رشتوں کا احساس اور ان تمام کے نتیجے میں انسان کا پائیہ انسانیت سے گر جانا بلکہ حیوان کی جون (شکل) میں تبدیل ہو جانا شامل ہے۔

اپنی افسانہ نگاری کے اس طویل عرصے میں ان کا فن کئی طرح کے تجربوں سے گذرا، کبھی تصوف کی منزل، کبھی اس پر فلسفیانہ رنگ چڑھا، کبھی وہ شاعری سے قریب تر ہوا، کبھی اس میں اقبال کے نظریات کی جھلکیاں نظر آئیں۔ کبھی روسی ادیبوں خصوصاً ترگنیف اور ٹالسٹائی کی حقیقت پسندی ان کے فن پر اثر انداز ہوئی تو کبھی چیخوف کی جزئیات نگاری ان کے افسانوں میں رچی بسی نظر آئی۔ کبھی کافکا کا مسئلہ تناسخ نے انتظار حسین کو دعوت فکر دی جن میں ناولٹ ''METAMORPHOSIS'' کے طرز پر انہوں نے ''کایا کلپ'' کی تخلیق کی۔ گو ان کے تخیل اور تخلیقات میں مختلف اثرات ضرور راہ پا گئے مگر ان کا کمال یہ ہے کہ تکنیک تو انہوں نے مغرب سے لی لیکن اس تکنیک میں جو کچھ پیش کیا وہ خالص مشرقی ہے، جیسے قدیم اسلامی تاریخ کے حوالے، دیو مالائی دور کے قصے، کہانیاں، حکایات، لوک کتھائیں، یہ سب ان کے افسانوں میں علامات کے طور پر استعمال ہوئیں۔ انہوں نے ماضی کی بازیافت کے لیے مغربی تکنیک کا سہارا لیا اور اس آئینہ میں موجودہ عہد کے بعض ایسے مسائل کو پیش کیا جو انہیں بے چین رکھتے ہیں۔

انتظار حسین کا بنیادی تجربہ ہجرت کا تجربہ ہے۔ تخلیقی اعتبار سے ہجرت کے احساس نے انتظار حسین کے یہاں ایک یاس انگیز داخلی فضا کی تشکیل کی ہے، ہجرت کا احساس اگرچہ انتظار حسین کے فن کا اہم ترین محرک ہے اور اس کی مثالیں ''گلی کوچے'' اور ''کنکری'' کے بعد کے مجموعوں میں حتیٰ ان کے ناول ''بستی'' اور افسانہ ''کشتی'' تک میں مل جاتی ہیں، لیکن جس طرح اس کا اظہار ناول ''چاند گہن'' اور اولین مجموعے ''گلی کوچے'' اور ''کنکری'' کی کہانیاں میں ہوا ہے بعد میں اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔ یعنی وہی بات جو درد کی ٹیس بن کر ابھری تھی، اب ایک دھیمی آگ بن کر پورے وجود میں گداز پیدا کر دیتی ہے۔ بقول ناصر کاظمی:

> ' انتظار حسین کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ وہ مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ وہ لکھنا جانتا ہے۔'' (ناصر کاظمی: ''چند پریشان کاغذ'' ص ۱۰۰)

بقول گوپی چند نارنگ:

> '' یوں معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدے کی منزل سے نکل کر انتظار حسین کا

فن اب مراقبے کی طرف راجع ہے۔ یہ تصوف کی منزل ہے جس کی کوئی پرچھائیں اس سے پہلے اردو افسانے پر نہیں پڑی تھی۔''

( گوپی چند نارنگ: اردو افسانہ، روایت اور مسائل، ص ۵۴۱ )

چنانچہ ان کا افسانہ '' آخری آدمی'' جو اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا افسانہ ہے، یہیں سے انتظار حسین کے فن میں نمایاں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اور وہ خارج سے باطن کی جانب اور انبوہ سے فرد کی طرف سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ '' آخری آدمی'' سے انتظار حسین کا تمثیلی دور شروع ہوتا ہے۔ اب انتظار حسین علامتوں، تمثیلوں، حکایتوں اور اساطیری حوالوں سے اپنے کرداروں کی تعمیر و تشکیل میں مدد لینے لگتے ہیں۔ انتظار حسین کے فن میں اس بنیادی تبدیلی کے آثار چھٹی دہائی کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ وہ افسانہ نگار جو اب تک ماضی کی پرچھائیوں، بھولی بسری یادوں یا تقسیم سے پیدا ہونے والے معاشرتی المیے کے بارے میں سیدھی سادی کہانیاں لکھ رہا تھا، اب وجودی مسائل پر سوچنے پر مجبور ہوا۔ سیدھی سادی بیا بیہ کہانی اب تمثیلی کہانی اور اس کی معنیاتی تہہ داری کو راہ دینے لگی۔ چنانچہ '' آخری آدمی''، '' زرد کتا''، '' کایا کلپ''، '' سوئیاں''، '' ہم سفر''، '' ہڈیوں کا ڈھانچہ''، '' دہلیز''، '' سیڑھیاں''، '' اپنی آگ کی طرف''، '' کٹا ہوا ڈبہ''، '' وہ جو کھو گئے''، '' شہر افسوس''، '' وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے''، '' رات''، '' دیوار''، '' کشتی'' اور '' کچھوے'' ایسے افسانے ہیں جو انتظار حسین کے فن میں علامیت کے ساتھ ساتھ ماضی کی بازیافت کے مطالعہ کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر افسانوں میں عہد نامہ عتیق، قبل اسلامی یا آریائی اسطوری روایتوں، ہندو دیومالا اور داستانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ '' آخری آدمی'' میں عہد نامہ عتیق کی فضا ہے۔ '' زرد کتا'' میں عہد وسطی کے صوفیا اور ان کے مفلوظات ہیں۔ '' وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے''، '' دیوار'' اور '' رات'' میں یاجوج ماجوج کا قصہ ملتا ہے جن کا ذکر قرآن پاک اور انجیل میں ہوا ہے۔ '' کشتی'' میں ہندو دیومالا اور اسلامی اسطور دونوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ '' کایا کلپ''، '' سوئیاں'' اور '' دوسرا گناہ'' میں '' الف لیلیٰ'' کی کہانیوں کی سی فضا ہے۔ '' کچھوے'' '' میں بودھ جاتکوں سے استفادہ کیا گیا ہے، '' کٹا ہوا ڈبہ''، '' سیڑھیاں''، '' دہلیز'' اور '' وہ جو کھو گئے'' میں یادوں یا خوابوں کے وجود یا علوم وجود سے تجربے کو معنی خیز بنا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ افسانے ماضی کے قصوں، کہانیوں، اسطور، روایتوں اور عقیدوں یا پھر خوابوں اور یادوں سے تشکیل پاتے ہیں۔ لیکن محض ماضی یا ماضی کے قصوں اور اسطور کو دہرانے کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ انتظار حسین انہیں اپنے وقت اور ماحول سے نکال کر ان سے عصری حقایق اور روبرو کھڑی زندگی کی تعبیر کا کام لیتے ہیں۔

'' آخری آدمی'' زماں و مکاں سے ماورا اور ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی انسانی الجھنوں اور روحانی



و اخلاقی قدروں کے زوال کا علامتی اظہار ہے۔ الیاسف جو اپنے قریئے کا آخری آدمی ہے، فطری زندگی گزارنے اور آخر تک آدمی بنے رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہوس پرستی، عیش کوشی، نفرت، غصے، خوف، جبلت کے جبر اور مکر و فریب کے ان تمام منفی جذبات سے اپنے وجود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے جو اس قریئے کے تمام آدمیوں کو فطری زندگی کے جوہر سے محروم کر دیتے ہیں اور انہیں آدمی سے بندر بنا دیتے ہیں۔ یہ کہانی ان انسانوں کے بندر بن جانے کی کہانی ہے جو سبت ( ہفتہ ) کے دن مچھلیاں پکڑتے تھے اور اس طرح حرص و ہوس کے جذبے کی تسکین کرتے تھے۔ لالچ، خوف، غصہ، وسوسہ کے منفی جذبات کے باعث وہ برتر انسانی سطح سے حیوانی سطح پر اتر گئے۔ آخری آدمی الیاسف ہے جو سب سے آخر میں بندر بنا، اس نے منفی جذبات سے خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بالآخر چوپایوں کی طرح ہاتھوں اور پیروں کے بل چلتا ہوا، اپنی محبوبہ بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا جنگل کی طرف چلا جاتا ہے اور آدمی سے بندر بن جاتا ہے:

'' بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چٹپے ہونے لگے اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر لگا دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں طرف پیر کے بل تیر کے موافق چلا۔''

( '' آخری آدمی'' از: انتظار حسین ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۷ء ص ۲۸ )

انتظار حسین اپنے تمثیلی پیرائے میں بتاتے ہیں کہ انسان لاکھ لالچ، مکر، خوف، غصہ، جنس سے بچنے کی کوشش کرئے، اپنی سرشت سے نہیں بچ سکتا۔ یہ جبلی دباؤ انسانی سرشت میں گندھے ہوئے ہیں چنانچہ انسان اور اس کی جبلی قوتوں کی یہ باہمی کشمکش کہانی میں وہ تناؤ پیدا کرتی ہے جو قصے کی جان ہے۔ افسانہ ایک داستان، ایک الف لیلوی قصہ اور ایک طلسم معلوم ہوتا ہے اور روایتوں، قدروں اور عقیدوں سے بھرے پرے ماضی اور اس کے زوال کو محسوس بنا دیتا ہے۔

'' زرد کتا'' انتظار حسین کی شہکار کہانی ہے۔ اس کا موضوع بھی کم و پیش وہی ہے جو '' آخری آدمی'' کا ہے۔ لیکن اس میں بزرگان دین کے ملفوظات، داستانوی فضا سازی اور داستانوی کی سی زبان کا استعمال ملتا ہے جو بڑی تخلیقی اور فکری نوعیت کا حامل ہے۔ جس طرح '' آخری آڈمی'' کی فضا انجیل کی ہے اور اس میں پرانے عہد نامے کی زبان سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح '' زرد کتا'' میں بزرگان دین کے مفلوظات اور

داستانوی زبان کا نیا استعمال ملتا ہے۔ ''آخری آدمی'' اور ''زرد کتا'' میں فرق صرف زمانی فضا ہی کا نہیں ہے بلکہ تکنیک کا بھی ہے۔ انتظار حسین کی تکنیک میں مکالمے کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی پہلی موثر مثال ''زرد کتا'' میں سامنے آتی ہے۔ اس کہانی کی تکنیک میں مکالموں اور حکایتوں کو بڑے سلیقے سے ایک دوسرے کے ساتھ سمویا گیا ہے۔ کہانی کی پوری فضا عہد وسطی کے ملفوظات کی ہے۔ مرید شیخ سے سوال کرتا ہے اور حضرت شیخ کے ارشادات، حکایتوں اور ملفوظات پر مبنی ہے۔ افسانے کا پہلا حصہ شیخ عثمان کبوتر کی طرز زندگی، ان کے ارشادات اور ان کے مریدان باصفا کی اپنے مرشد کے تئیں بے انتہا عقیدت سے متعلق ہے۔ ابوالقاسم خضری، شیخ سے مختلف سوال کرتا ہے اور شیخ نفس، طمع دنیا، پستی، علم کے فقدان، ویش کے سوال، شاعر کی غرض، عالم کی تجارت جیسی باتوں کے بارے میں حکایتوں اور تمثیلوں کی صورت میں جواب دیتے ہیں:

'' میں یہ سن کر عرض پرواز ہوا، یا شیخ زرد کتا کیا ہے؟ فرمایا:
زرد کتا تیرا نفس ہے، میں نے پوچھا۔
یا شیخ نفس کیا ہے؟ فرمایا:
نفس طمع دنیا ہے، میں نے سوال کیا:
یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟ فرمایا:
طمع دنیا پستی ہے، میں استفسار کیا:
یا شیخ پستی کیا ہے؟ فرمایا:
پستی علم کا فقدان ہے، میں ملتجی ہوا:
یا شیخ علم کا فقدان کیا ہے؟ فرمایا:
دانشمندوں کی بہتات''

(زرد کتا ''آخری آدمی'' ص۳۲)

اس مرکزی خیال کو اس افسانہ میں انفرادی و معاشرتی دونوں حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور واقعات کو جوڑ کر کہانی کا پورا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے۔ ''آخری آدمی'' کی طرح اس کہانی میں بھی پورے معاشرے انحطاط میں ایک شخص کے روحانی انحطاط کو دکھایا گیا ہے۔

انتظار حسین کے اس دور کی کہانیوں میں اس لحاظ سے ایک معنوی ربط اور وحدت ہے کہ ان میں سے زیادہ تر انسان کے روحانی زوال کو کسی نا کسی نہج سے پیش کرتی ہیں اور وجود کی غرض و غایت اور نوعیت و ماہیت کے بارے میں طرح طرح کے سوال اٹھاتی ہیں۔ ''کایا کلپ''، ''سوئیاں'' اگرچہ تکنیک کے اعتبار



سے ''آخری آدمی'' اور ''زرد کتا'' سے مختلف ہیں لیکن ان میں پیرائیہ دیووں اور شہزادیوں کی تمثیلوں کا ہے، حالانکہ بنیادی موضوع ان کا بھی انسان کا زوال ہی ہے۔ لیکن یہاں مرکزیت طمع دنیا، جنسی کشش یا ہوس نا کی کو نہیں ہے، بلکہ خوف اور دہشت کو حاصل ہے، جس سے شخصیت اپنے میں اندر ہی اندر سکڑنے لگتی ہے اور بالآخر معدوم ہو جاتی ہے۔ بظاہر ''کایا کلپ'' کا نام ہی کافکا کی METAMORPHOSIS یاد دلانے کے لیے کافی ہے، تاہم انتظار حسین کا تمثیلی اسلوب، مکالماتی بنت اور معاشرتی فضا سازی ایسی زبردست انفرادیت لیے ہوئے ہے کہ انہیں نہ کسی کا مقلد کہا جا سکتا ہے نہ کسی سے متاثر ''زرد کتا'' اور ''آخری آدمی'' کے مقابلے میں ''کایا کلپ'' خاصی مختصر کہانی ہے۔ لیکن تاثر کے اعتبار سے ان سے کم نہیں، کہانی کی فضا داستانوں کی سی ہے۔ شہزادہ آزاد بخت اور سفید دیو کے نام تک داستانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ افسانے کا آغاز اس کے اختتامی واقعے کے بیان سے ہوتا ہے:

'' شہزادہ آزاد بخت نے اس دن مکھی کی صورت ہی صبح کی اور وہ ظلم کی صبح تھی کہ جو ظاہر تھا چھپ گیا اور جو چھپا ہوا ظاہر ہو گیا۔ تو وہ ایسی صبح تھی کہ جس کے پاس جو تھا وہ چھن گیا اور جو جیسا تھا ویسا نکل آیا اور شہزادہ آزاد بخت مکھی بن گیا۔''

( کایا کلپ ''آخری آدمی''، ص۸۳)

یہ کہانی خوف کی نفسیات کو پیش کرتی ہے اور خوف و دہشت کے فشار سے انسانی شخصیت کس طرح پچک جاتی ہے، اس کیفیت کو تمثیلی سطح پر پیش کرتی ہے۔ کہانی کے آغاز میں شہزادی کے سحر سے شخصیت کے معدوم ہونے کا جو دائرہ شروع ہوا تھا، کہانی کے آخری میں شہزادہ آزاد بخت کے مستقل طور پر مکھی کی خون میں منتقل ہو جانے سے وہ مکمل ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی عمل کے دائرے کا احساس انتظار حسین کہانی کے شروع میں ہی کرا دیتے ہیں کیونکہ کہانی کے انجام ہی سے انہوں نے اس کا آغاز کیا ہے۔

''آخری آدمی''، ''زرد کتا'' اور ''کایا کلپ'' تینوں افسانوں میں اخلاقی اور روحانی زوال اور شخصیت کی موت کے ایسے تجربے ملتے ہیں کہ قاری بھی اپنے اوپر بندر، زرد کتا یا مکھی کے غالب آ جانے کو محسوس کرتا ہے۔ ان افسانوں میں انتظار حسین براہ راست ماضی کو پیش نہیں کرتے بلکہ حال کی پیچیدگیوں کا اظہار کر کے ماضی کو قاری کی یاد کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

اسطوری سوچ یا اسطور سازی بھی انتظار حسین کے یہاں ماضی کی بازیافت کے عمل کا نتیجہ ہے۔ اساطیر، داستانوں کے کرداروں یا مختلف تلمیحات کو کھنگال لینا، انہیں نئے معنی دینا اور یوں عصری حقیقتوں کے سمجھنے کا ذریعہ بنانا حال کے ساتھ ساتھ ماضی کے گہرے وژن کا بھی مظاہرہ کرتا ہے۔ اسطوری سوچ کو ان

کے افسانوں میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔''سد سکندری''یا''یاجوج ماجوج'' کی تلمیح یا اس سے متعلق قصے کو انتظار حسین نے اپنے تین افسانوں''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے''،''رات''اور''دیوار''میں الگ الگ معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کی معنوی جہتوں کا احساس دلایا ہے۔

اس طرح یہ تینوں افسانے تلمیح کو محض دہرانے کا عملی مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ اسے جدید دور میں زیادہ بامعنی بناتے ہیں۔

انتظار حسین نے جہاں اسلامی معاشرے کے عقاید اور اساطیر کی طرف توجہ دی ہے، وہیں ہندو دیومالا اور بودھ جاتکوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔''کچھوے''اور''واپس''بودھ جاتکوں پر مبنی افسانے ہیں۔ اس بارے میں گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

''کچھوے''،''واپس''اور''کشتی''اول تو ان کے موضوعات یں زندگی کے بنیادی مسائل یعنی بقائے انسانی اور سرشت انسانی جیسے پیچیدہ سوالات کو لیا گیا ہے، لیکن اہمیت بالذات موضوع کی نہیں بلکہ اس کی فنی پیش کش کی ہے یعنی جس پیرائے اور جن وسائل سے اسے بیان کیا گیا ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کہانیوں میں بودھ جاتکوں اور ہندوستانی دیومالا کو پہلی بار اعلیٰ تخلیقی سطح پر استعمال کیا گیا ہے اور''کشتی''میں تو ہندوستانی دیومالا ،اسلامی روایتوں، سمیری اور بابلی اساطیر سب کو ملا کر ایک بالکل نیا تکنیکی تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

(انتظار حسین کا فن، متحرک ذہن کا سیال سفر، اردو افسانہ روایت اور مسائل، ص۵۸۰)

چنانچہ بودھ اثر کا پہلا اشارہ انتظار حسین کے یہاں''شہر افسوس''میں ملتا ہے۔لیکن اس کا بھرپور اثر انتظار حسین کے چوتھے دور کی خصوصیت ہے۔''کچھوے''اور''واپس''دونوں کی بنیاد بودھ جاتکوں پر ہے ان میں زبان بھی پراکتوں کا عنصر لیے ہوئے قدامت آمیز ہے جس سے قدیم عہد کی فضا سازی میں مدد ملی ہے۔''کچھوے''کے درج ذیل اقتباس کو دیکھیے :

''ہے ودیا ساگر، بھکشوست پتھ سے پھر گئے ہیں تھتا گت کے بنائے ہوئے نیموں کا پالن نہیں کرتے۔پیڑ کی چھاؤں چھوڑی، چھتوں تلے اونچی کھاٹوں پر آرام کرتے ہیں۔ایک سنگھ کے اندر کتنے سنگھ گئے اور کتنی منڑلیاں ہیدا ہوگئیں۔ہر منڈلی



کی جان کی بیری ہے۔تو پلٹ چل اور انہیں سکشا دے کہ تو ہمارے بیچ گنی اور گیانی ہے۔'' (کچھوے، انتظار حسین بحوالہ افسانہ بیسویں کی روشنی میں، ص۳۶۔۳۷)

''کچھوے'' کی زبان ٹھیٹ ہندی بلکہ سنسکرت لفظیات کا اسلوب ہے اسی لیے اس کی زبان پر شبہ ہوتا ہے کہ یہ اردو ہے یا ہندی۔بہر حال''کچھوے''،''واپس''اور''کشتی''انتظار حسین کے تمثیلی اسلوب کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔''کچھوے''اور''پتے''میں تو دیومالا کا استعمال بھی ہے۔

''کشتی''اس دور کی بہترین تمثیلی کہانی ہے۔اس میں قدیم سامی و اسلامی روایتوں اور ہندوستانی دیومالائی حکایتوں کو تخلیقی طور پر مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس لحاظ سے یہ افسانوی تکنیک کا ایسا تجربہ ہے جس کی کوئی مثال اس سے پہلے اردو میں نہیں ملتی۔

انتظار حسین نے داستانی اور دیومالائی طرز بیان سے ہٹ کر بھی اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔اس ضمن میں''وہ جو کھو گئے''،''سیڑھیاں''اور''شرم الحرم''وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس طرح انتظار حسین مختلف روایتوں، تہذیبوں، اساطیر اور ماضی قدیم کی کہانیوں کی مدد سے اپنے افسانوں کی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔گمشدہ ماضی بازیافت کا یہ عمل انتظار حسین کے افسانوں میں حال کی صورت حال کو سمجھنے اور مستقبل کی فکر کا عمل ہے اور معنیاتی سطح پر یہ انتظار حسین کے فن کا بنیادی نقطہ ہے۔

انتظار حسین کے افسانوں کی ایک لمبی فہرست ہے یہاں سب کو سمیٹنا ناممکن ہے۔پھر بھی یہ کوشش رہی ہے کہ ان کی تخلیقات کے ذریعے ان کے فن کی مختلف جہات اور ذہنی و فکری ارتقاء کی مختلف کڑیاں سامنے آجائیں۔جن سے ان کی انفرادیت اور امتیازی نشانات حتی الامکان واضح ہوسکیں اور ہم فکر و فن، اسلوب اور تکنیک کے حوالے سے ایک مجموعی خاکہ تیار کرلیں۔ویسے تو انتظار حسین کا ہر افسانہ تحقیق طلب ہے، بالخصوص جب فنکار کا پیرایہ اظہار رمزیہ، استعاراتی اور تمثیلی ہو۔ہم انتظار حسین کے ان افسانوں پر غور کریں جن کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے کہ علامتی افسانے ہیں اور ان کی تکنیک بھی علامتی یا داستانوی ہے تو ایک چیز جو سامنے آتی ہے وہ کہ انتظار حسین کے افسانوں میں اکثر مختلف طریقوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔کہیں قدیم یعنی قصص، کتھا، حکایت تکنیک کا استعمال ہے تو کہیں جدید تکنیک کا۔قدیم و جدید کا یہ امتزاج اس سے پہلے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں اس سطح پر نظر نہیں آتا۔ایسا نہیں ہے کہ انتظار حسین نے کسی افسانے میں صرف ڈرامائی تکنیک کا استعمال کیا ہے یا صرف خود کلامی کی تکنیک کا، بلکہ ان کا افسانہ اگر کبھی ڈرامائی تکنیک شروع ہوتا ہے تو آخر میں انتظار حسین خود کلامی کی تکنیک استعمال کرنے لگتے ہیں۔مطلب یہ کہ ایک ہی افسانے میں وہ بیک وقت مختلف تکنیکوں کا استعمال کرتے ہیں اور ملی جلی تکنیک خود ایک تکنیک

بن جاتی ہے۔اس طرح انتظار حسین مشرق ومغرب ،قدیم وجدید تکنیکوں کا ساتھ ساتھ استعمال کرتے ہیں، کہیں زبان کے حوالے سے اور کہیں مواد کے حوالے سے دونوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔گوپی چند نارنگ ایک جگہ لکھتے ہیں :

'' قدیم وجدید کا وہ امتزاج جو انتظار حسین کے فن میں زبان کی ساخت اور کرداروں کی تعمیر میں کہانی کی تکنیک اور داستان کے پیرائے کا باہم مخروج ومربوط کرنے سے عبارت ہے۔ اسکی گرہیں بتدریج آخری آدمی ، کی کہانیوں میں کھلتی ہیں۔کہانی کے روایتی ڈھانچے کو علامیت اور استعاریت نے توڑ ہی دیا تھا۔ انتظار حسین نے داستانوی اسلوب وعناصر کی مدد سے اسیتازہ سرئیلی ذائقہ سے آشنا کرایا جس کی کوئی نظیر اس پیانے پر اردو افسانے میں نہیں ملتی۔''

(اردو افسانہ روایت اور مسائل ،ص،۵۵۷)

بقول محمد حمید شاہد :

''زبان کو فکشن کی زبان رکھ کر اس میں جمالیاتی قرینے رکتے چلے جانا اور ایک عام سے منظر اور سادہ سے واقعہ کو مختلف کر کے اس کے اندر سے بھیدوں کے سلسلے نکال لانے کا جادو انتظار حسین کو آتا ہے۔''

(محمد حمید شاہد :فکشن کا بڑا نام :انتظار حسین ،دنیازاد، شمارہ:۳۸،ص،۲۹۱)

چنانچہ''آخری آدمی''،''کچھوے''اور''شہرافسوس'' یہ تین مجموعے ایسے ہیں جن میں انتظار حسین نے مختلف تجربات کیے ہیں۔ یہ تجربات کہیں مکالمے اور عمل میں بھی ساتھ ساتھ متوازی پیرائے میں ظاہر ہوتے ہیں یعنی ان کا بیان ایسا ہے،جس میں مکالمہ اور عمل ملے جلے ہوتے ہیں،دوسرے افسانے جیسے''خیمے سے دور''،''سفر منزل شب''،''وہ جو کھو گئے''اور''سیڑھیاں'' ایسے افسانے ہیں جن میں مکالمے اور عمل ساتھ ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ان افسانوں میں انتظار حسین نے سامعہ کے ساتھ قوت باصرہ کو بھی بیدار کیا۔یعنی انہوں نے نثر کو شعری پیکروں سے مزین کیا ہے۔ان افسانوں میں حقیقت پسندانہ پیرائے کو''غیر حقیقت''سے مربوط کر کے ایک منفرد تکنیکی تشکیل کی گئی ہے جسے ہم مکالمے اور عمل کی امتزاجی تکنیک کہہ سکتے ہیں۔ ان ساری باتوں کو وارث علوی جو کہ جدید افسانے کے بہت بڑے پارکھی ہیں۔انتظار حسین کے افسانوں میں جادوئی اسلوب اور اس کے پیش کش کا مجموعی کچھ یوں کھینچتے ہیں :

''انتظار حسین گو اسطوری اور علامتی طریقہء کار اختیار کرتے ہیں لیکن



حقیقت پسند تکنیک کے ہتھکنڈوں ،یعنی واقعہ نگاری ،کردار نگاری ،جزئیات نگاری ، مکالمہ تصویر کشی اور فضا بندی کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔اسی سبب سے ان کے افسانے ، تجریدی افسانوں کی ذیل میں نہیں جاتے اور ان کا اسلوب تجریدی افسانوں کے اسلوب کی مانند شاعری کے اسلوب سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔انتظار حسین کا یہ امتیازی وصف ہے کہ ان کے کسی جملے پر شعریت ، یا غنائیت یا شاعرانہ پن کا گمان تک نہیں ہوتا ، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ان کی پوری کوشش غنائیت سے گریز کی طرف ہے،اس کے باوجود ان کا اسلوب غنائی شاعری کے اسلوب کی مانند ہم پر وجد کی کیفیت طاری کرتا ہے۔ یہ نثر کی معراج ہے اور ایسے معجزے آسمانی صحائف میں ہی نظر آتے ہیں جن کے اثرات انتظار حسین کے اسلوب پر دیکھے جاسکتے ہیں۔آسمانی صحائف کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے جو کچھ کہا گیا وہ اہم نہیں ہے بلکہ کیسے کہا گیا وہ اہم ہے۔''

(جدید افسانہ اور اس کے مسائل ص۱۷)

ان کے افسانوں میں پوری قوم کے شاندار ماضی کی عظمت کا احساس اور پوری قوم کا درد ملتا ہے۔وہ اس آگہی کے ساتھ تہذیب اور ادب کی جڑیں تلاش کرتے ہیں۔ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں :

''میں افسانہ کیا لکھتا ہوں،کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا ہوں اور آتش رفتہ کا سراغ لیتا پھرتا ہوں۔''

(علامتوں کا زوال :مضمون ''اجتماعی تہذیب اور افسانہ ''ص ،۲۱ )

دراصل انتظار حسین کو اپنی تاریخ وتہذیب سے کٹ کر الگ ہوجانا ایک عظیم المیہ محسوس ہوتا ہے۔ اس المیہ کو وہ کتنے درد کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو افسانے کے کئی رجحان سامنے آئے ہیں ان میں سے جو رجحان بنیادی نوعیت کے ہیں،وہ چار ہیں۔ پہلا رجحان تقسیم کے المیے کو پیش کرنے کا ہے۔اس ذیل میں دو طرح کے افسانے آتے ہیں۔ایک تو وہ جن کی نوعیت ہنگامی تھی اور جو فسادات کو براہ راست موضوع بنا کر لکھے گئے تھے،دوسرے وہ جو تہذیبی سطح پر تقسیم کے المیے کو پیش کرتے ہیں۔اس رجحان کے بہترین علم بردار ہندوستان میں قرۃ العین حیدر اور پاکستان میں انتظار حسین ہیں۔دوسرا رجحان زندگی کی جامعیت اور اس کے نارمل حسن کو اس کی سیاہی اور سفیدی کے ساتھ پیش کرنے کا ہے۔تیسرا رجحان علاقائی افسانے کا ہے۔چوتھا بنیادی رجحان تجریدی اور علامتی افسانے کا ہے اس قسم کا افسانہ آزادی سے پہلے کیا فسانہ نگاروں کے یہاں بھی ملتا ہے۔مثلاً کرشن چندر کا''غالیچہ''،''چوراہے کا کنواں''،''جہاں ہوا

نہ تھی''اور''چھری''،احمد ندیم قاسمی کا''سلطان''،''وحشی''اور ممتاز شیریں کا''میگھ ملہار''وغیرہ۔

آخر میں بس اتنا ہی کہوں گا انتظار حسین نے انسان کی جڑیں نئے معاشرے کی فضا میں جو معلق ہو چکی ہیں، انہیں لوک کتھاؤں اور دیو مالائی عناصر میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس دور کے مسئلہ کو جو کہ عدم اعتماد کا مسئلہ ہے، اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔آج کے دور میں ہر انسان دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔اس موضوع پر انتظار حسین نے کئی افسانے تحریر کئے۔ان کا افسانہ''مشکوک لوگ''اسی بات کا ثبوت ہے۔اس افسانے کے تعلق سے رشید امجد لکھتے ہیں :

'' انتظار حسین کے''مشکوک لوگ''میں اس دور کی تشکیک کو موضوع بنایا گیا ہے، جہاں ہر شخص دوسرے کو حتیٰ کہ خود کو مشکوک سمجھتا ہے۔صابر ایسے ماحول کا فرد ہے جہاں ہر آدمی دوسرے کے بارے میں جاسوس کی آنکھ رکھتا ہے۔دوسرا، تیسرے سے تعلق اپنی معلومات کا اظہار کرتا ہے۔صابر اس ساری گفتگو کا گواہ ہے اور ہر ایک کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔اس کا یہ رجحان اس حد تک بڑھتا ہے کہ آخری میں اسے اپنی ذات بھی اس کی زد میں محسوس ہوتی ہے۔انتظار حسین نے اس افسانے میں بڑی خوبصورتی سے اس دور کے پڑھے لکھے لوگوں کی ذہنی کیفیت بیان کی ہے۔یہ افسانہ محض چند کرداروں کا المیہ نہیں بلکہ پورے معاشرے کے ذہنی رویہ کا احاطہ کرتا ہے۔''

(رشید امجد، افسانے کے نئے موضوعات، پاکستانی ادب تنقید، ص: ۷۸۲،۷۸۳)

اور اردو ادب کا یہ سورج (انتظار حسین) ۲فروری ۲۰۱۶ء دوپہر ۲ بج کر ۴۵ منٹ پر ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

◂◂ ● ▸▸

Opp:ITI Road
W.No-4
Rajouri-185131(J&K)



- **گوشہ انتظار حسین**
- **رافد اویس بھٹ**

# انتظاریات: مضمرات وممکنات

جدید افسانوی ادب کی تشکیل پذیری کے ساتھ ہی خارجی حقیقت نگاری سے انحراف کیا گیا اور داخلی ونفسی کوائف، دہشت، تنہائی، ذہنی بے چینی کے علاوہ داخلی کرب اور زندگی کی لایعنیت افسانے کے اہم اور چنندہ موضوعات ٹھہرے۔مگر خارجیت اور داخلیت کی اس کشمکش میں چند ایک تخلیق کار ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے خارج اور داخل کے درمیان ایک ایسے راستے کی تلاش کی جو تخلیق کار کو انسان کے ماضی میں پہنچا دیتا ہے جہاں انسانی وجود کا ہر وہ پہلو نمایاں ہوتا ہے جس کی تلاش جدید تخلیق کار کو تھی، اُن میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حُسین نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔انتظار حُسین نے ماضی کی بازیافت، تہذیبی زوال، محرومیٔ ذات اور متنوع وجودی مسائل سے جڑے موضوعات کو اپنی افسانوی تحریروں میں برتا ہے جسے نقادانِ فن اُن کے فن کا مابہ الامتیاز ٹھہراتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بادی النظر میں جب بھی قاری انتظار حسین کے افسانوی ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو ہجرت، ماضی کی بازیافت، تہذیبی تشخص اور تہذیب سے بکھرنے کا احساس جیسے موضوعات ملتے ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ انتظار حسین کا افسانوی ادب انہی موضوعات کے گرد گھومتا ہے جس کی بنیاد پر اُن کے کئی مفسرین نے اُن پر 'ہجرت' کا لیبل بھی لگایا ہے۔لیکن اگر قاری اُن کے فن کی مکمل تفہیم چاہتا ہے تو بادی النظری کے مقابلے میں گہرے اور عمیق مطالعے کی ضرورت ہے نہ کہ انھیں چند گنے چنے موضوعات میں قید کر کے اُن کے موضوعاتی اور فنی شعور کا محاکمہ کرنے کی کوشش کی جائے۔اُن کے تئیں اس نوع کی تفہیم کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اُن کے افسانے افکار واظہاریت کی کن نئی اور منفرد کڑیوں کا پتا دیتے ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ اُن تمام مروج پیمانوں سے قطع نظر ہو کر اُن کی افسانہ نگاری کی متوازی شعریات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے تا کہ اُن عناصر کا پتا لگایا جائے جس کی وجہ سے اُن کے فن کی انفرادیت قائم ہے۔

اکثر ناقدینِ انتظار حسین اُن کے افسانوں کا تجزیہ کرتے وقت تہذیب کی شکست وریخت کا ذکر کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُن کی افسانوی تحریریں اجتماعیت کی بجائے فرد کی بے چہرگی، اخلاقی،

اصلاحی اور روحانی اقدار کے زوال جیسے عناصر سے تشکیل پذیر ہوئی ہیں۔ جس کے لیے ''زرد کتا''، ''جل گرجے''، ''آخری آدمی'' اور '' کچھوے'' جیسی تحریروں کو مثال میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانیت کے زوال اور قرب وقیامت کی تباہیوں اور ہولنا کیوں کا ذکر اکثر کیا ہے جس کا مواد انہوں نے اپنے ہی معاشرے، تہذیب اور اپنی ہی روایات سے لیا ہے اور اُس کھوئے ہوئے انسان کی تلاش کے لیے ذرائع ڈھونڈتے رہے جس نے اپنی تہذیب سے اپنا رشتہ کاٹ لیا تھا۔ فرد کی اس حالتِ دگرگوں کا تذکرہ کرنے کے دوران وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ جن افراد کے روحانی اقدار کی تلاش وہ کرتے ہیں اُنہی افراد میں کئی فرد ایسے ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں ایسے مسائل نے سر اُٹھایا ہے جو انسان کو اُس کی تہذیب، روحانی اقدار اور ثقافت سے رشتہ منقطع کرنے پر اکساتے ہیں۔ اُن کو اس بات پر ایقان تھا کہ کوئی بھی انسان اپنی تہذیب سے الگ ہو کر اپنی شناخت قائم نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں تصورِ کائنات بھی قدرے مختلف تھا جس میں کائنات متنوع و متضاد رویوں کا ممبع و محور ہے جس کا ادراک مانوسی منطق سے ممکن نہیں۔ اُن کے افسانوی ادب کے افکار واظہار کے متوازی پہلوؤں کی نشاندہی اس بات سے بھی ہو سکتی ہے کہ اپنے ہم عصر تخلیق کاروں کے مقابلے اُنھوں نے صرف عقلیت پسندی اور خارجی کوائف کو وسیلۂ اظہار بنانے کے برعکس ایسے موضوعات کو برتا ہے جس پر کسی عقلیت پسند فلسفے کی لیبل لگانا مشکل ہے کیوں کہ جس طرح لوک ادب کی بنیاد عقلیت پسند فلسفے کی بجائے عوام کے حافظے پر استوار ہوتی ہے ٹھیک اُسی طرح اُن سے اُٹھائے گئے موضوعات کی اساس ایسے عقائد پر قائم ہے جس کو عقلیت پسند دنیا ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے انہوں نے عام روش سے ہٹ کے ایک ایسا وسیلۂ اظہار اپنایا جو افسانے کے فکر واظہار کی سطح پر نئی منزلوں کا پتا دیتا ہے۔ اس ضمن میں شافع قدوائی لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین نے اُن متعین موضوعات، مروجہ اقدار، ثقافتی ترجیحات اور تصورِ کائنات کو Subvert کرنے کی خاطر ایک ایسا بیانیہ تخلیق کیا ہے جس پر کسی نجات کوش فلسفے کی فضا مستور کی نہیں ہے......انتظار حسین کے بیش تر افسانوں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ عقلیت پسندی دراصل ثقافتی استعماریت کی ایک شکل ہے اور اسے Subvert کرنے کے لیے انھوں نے ایک ایسا بیانیہ خلق کیا ہے جس کی اساس سکہ رائج الوقت Rationlaism کے بجائے Incredible Beliefs پر استوار ہے۔ ان عقائد اور تصورات کو عقلیت پسند دنیا توہمات قرار دیتی ہے مگر یہ عوامی حافظے کا جزو جلیل ہے۔'' [۱]

یعنی انہوں نے ایک ایسا بیانیہ خلق کیا جو ایسی فضا میں سانس لیتا ہے جہاں عقلیت پسند فلسفے



کو ایک طرف رکھ کر اُن عقائد اور تصورات کو جگہ ملتی ہے جس کی اساس عقل کی بجائے یقین پر استوار ہے۔ اُن کے یہاں ثقافت، اقدار اور کائنات کا تصور مروجہ معیار اور طریقۂ اظہار کے مقابلے میں بالکل غیر معمولی اور منفرد ہے جس کا محور کوئی رائج الوقت تصور نہیں بلکہ عوامی حافظہ ہے۔

انتظار حسین نے جہاں ایک طرف مروجہ موضوعات سے انحراف کرتے ہوئے عام روش سے ہٹ کر غیر معمولی، منفرد اور اچھوتے موضوعات کو افسانوی ادب کے بخیے میں ڈال دیا۔ وہیں دوسری فنی سطح پر بھی تبدیلیوں کے لیے کوشاں تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے افسانے کے لیے ایک ایسی زبان تشکیل دی جس کے ذخیرۂ الفاظ کا گنجینہ عوامی بول چال ہے۔ چوں کہ اُنہیں اپنی تحریروں میں معاشرے کے فرد کی شخصیت اور اس کی کھوئی ہوئی شناخت سے سروکار رہا ہے لہٰذا اُنہیں ایسی زبان کا انتخاب کرنا پڑا جو پورے معاشرے کو محصور کرے اور جو قاری کو کسی عقلیت پسند فلسفے میں اُلجھانے کی بجائے براہ راست اُن گمشدہ افراد کی آواز گوش گذار کر سکے جنہیں معاشرے کے ہی کئی فلسفہ طرازی کرنے والوں نے کسی کال کوٹھری میں قید کر کے رکھا تھا۔ اُن کے فن میں کئی ایسی خصوصیات موجود ہیں جس نے اُن کے فن کو ایک امتیازی حیثیت عطا کی۔ فرد کے تئیں اُنہوں نے جس کرب اور اداسی کا اظہار اپنی تحریروں کیا ہے وہ صرف اس لیے ہے کہ وہ فرد کو کسی بھی حال میں بے سہارا اور بے جڑ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کے فن کی مرکزیت کو بیان کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> '......ماضی کی بازیافت اور جڑوں کی تلاش کا پیچیدہ سوال انتظار حسین کے فکشن کا مرکزی سوال ہے۔'' [۲]

آگے لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین کا گن آج کے کھوئے ہوئے یقین کی تلاش کا فن اس لیے ہے کہ مستقبل کا انسان اپنی آگہی حاصل کر سکے اور اپنی ذات کو برقرار رکھ سکے، اس لیے انہیں پرانے عہد نامے، انجیل، قصص الانبیاء، دیو مالا، بودھ جاتکا، پرانوں، داستانوں اور صوفیا کے ملفوظات سب سے استفادہ کرنا پڑا ہے اور نتیجتاً ایسا اندازِ اظہار وجود میں آیا ہے جو خاص اُن کا اپنا ہے۔'' [۳]

انتظار حسین اپنے افسانوں میں گمشدہ افراد کے متلاشی رہے ہیں۔ حالاں کہ اس بات کا انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ ''میں تو کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا ہوں۔'' لہٰذا وہ اپنے افسانوں کے ذریعے بقول نارنگ ایسے افراد کی جستجو کرتے ہیں جو تہذیب کے چھتنا ور درخت سے کٹ چکے ہیں۔ جنہوں نے اپنی ثقافت، اپنے اقدار اور اپنی تہذیب سے رشتہ کاٹ کر تاریکی میں خود کو دھکیلا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ جینے کا ڈھنگ بھی بھول گئے ہیں اور ساتھ میں اپنی شناخت کو بھی مسخ کر بیٹھے۔ اُنہوں نے کھوئے ہوئے افراد کے

وقار اور منصب کو اُنہی کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے اعادے کو اُن کی تلاش کا ذریعہ بنا دیا اور اس کے لیے انہوں نے ملفوظات، قرآنی آیات، تلمیحات اور جاتک کتھاؤں کو اپنی تحریروں میں جگہ دے کر اس کے پس منظر میں فرد کی ذات کو ٹٹولا اور انسان کے روحانی اور اخلاقی زوال سے نجات پانے کے ذرائع کے متلاشی رہے۔ انہوں نے ماضی کی بازیافت اور جڑوں کی تلاش کے لیے تہذیب، ثقافت اور اقصائے پارینہ کا سہارا لے کر یہ ثابت کر دکھایا کہ عقلیت پسندی اور ظاہری حواس جیسے ذرائع کے علاوہ بھی فرد کی پستی اور حالتِ دگرگوں کی بازیافتی کے لیے Incredible beliefs کا سہارا لے کر تاریخ، مذہب، دیومالا، حکایتیں اور عقائد و توہمات جیسے ذرائع بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں تاکہ فرد کو اُس کے منصب و وقار کا اعادہ کر کے اُس کے ذہن کو اُس کی کھوئی ہوئی تہذیب کی طرف مراجعت کرنے پر اُکسایا جائے۔ ان سب عناصر کی مثالیں 'جل گرجے'، ''زرد کتا''، ''آخری آدمی'' اور ''کچھوے'' میں جیسی تحریروں میں ملتی ہیں۔

انتظار حسین نے اپنے منفرد اور غیر معمولی تخلیقی تجربوں سے نہ صرف موضوعاتی سطح پر اردو افسانے کے لیے دریچے وا کیے بلکہ فنی لوازمات کا بھی لحاظ کرتے ہوئے پختہ اور منجھے ہوئے فنکار کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے استعارات، علامات اور تلمیحات کو اپنی تحریروں میں ایک مخصوص وسیلۂ اظہار کے طور پر برتا ہے جسے اردو افسانے نے ایک نئے طرز اظہار کے طور پر قبول بھی کیا اور اپنا دامن بھی وسیع کرتا گیا۔ گرچہ ملفوظات صوفیاء، جاتک کتھاؤں، اقصائے انبیا اور حکایتوں سے اُن کے افسانوں کی منفرد شناخت قائم ہے تاہم انہوں نے افسانے کی شعریات میں بھی کئی متوازی عناصر کو شامل کیا ہے۔ انتظار حسین کی اس امتیازی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین کے افسانوی ادب کی پہچان بزرگانِ دین کے ملفوظات، تلمیحات اور داستانوی لب ولہجہ کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں اوپر سے تھوپی ہوئی معلوم نہیں ہوتیں بلکہ پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ یہ کہانی یوں ہی لکھی جا سکتی تھی۔ ایسا گمان ہوتا ہے کہ اگر انتظار حسین کی کہانیاں نہ ہوتیں تو جدیدیت کے نام پر نام نہاد ادیبوں کی جو بھیڑ آئی تھی اُن کے بھونڈے پن کا اور اُن کی نقالی کا بھانڈا ابھی نہیں پھوٹتا۔ یہ انتظار حسین ہیں اور اُن کی کہانیاں ہیں جو طے کرتی ہیں کہ نئی کہانیاں یوں لکھی جاتی ہے اور استعارے، علامتیں، تلمیحات ترسیل کا المیہ ہرگز نہیں بنتی ہیں اگر لکھنے والا حقیقی فنکار ہو اور علامتوں کے پورے معنیاتی نظام سے واقف ہو علاوہ ازیں اسے اس کے برتنے کا سلیقہ بھی معلوم ہو۔''[۴]

ارتضیٰ کریم کی اس بات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ انتظار حسین نے موضوعاتی اور فنی دونوں سطحوں پر افسانے کے فکر و اظہار کی نئی منزلوں کا پتا دیا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے افسانے کی عام مروجہ شعریات میں تغیر پذیری کا خیال کرتے ہوئے کئی متوازی عناصر کو شامل کر کے افسانے کی شعریات کو ایک نئے تقاضوں کو سمجھنے کی اہلیت عطا کی ہے۔ انہوں نے تقریباً اپنی ہر تحریر میں کائنات کو ایک فطری شئے کے برعکس تاریخ سمجھ کر انسانی روایات کا ذکر کر کے اُن افراد کو اُس تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے جوڑنے کا کام کیا ہے جس سے جدید دور کا فرد پوری طرح سے کٹا ہوا تھا۔



الغرض افسانے کے اسالیب کی بات ہو یا موضوعات کی، دونوں سطحوں پر وہ نئے پن کے متلاشی رہے ہیں۔ اُن کی اہمیت صرف اس بات میں مضمر نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ہجرت اور افراد کا تہذیب وثقافت سے کٹ جانے جیسے عناصر کا ذکر اکثر کیا ہے۔ ہاں البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناقدین انتظار حُسین نے اُن کی تحریروں میں مذکورہ عناصر کو لے کے اپنی تنقیدی صلاحیت کا فرض ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریریں ابھی بھی مکمل تفہیم کی تلاش میں ہیں۔ انہیں چند ایک موضوعات میں قید کرنے اور اُن کی شخصیت اور تحریروں کو محدود کرنے کی بجائے اُن کی تخلیقات کو کلی طور پر پرکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اُن کی مکمل تفہیم ممکن ہو سکے۔ اکثر اُن کی تحریروں میں دیکھا گیا ہے کہ ہر فرد کی واردات سے شخصی تجربوں کی ایک کائنات خلق ہو جاتی ہے۔ اگر قاری اُس کائنات کی رنگارنگیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اُسے انتظار حسین کی افسانوی تحریروں کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا تاکہ وہ بھی اُن تجربات سے واقف ہو جائے جن کا اطلاق انہوں نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ ناقدین ادب کو چاہئے کہ وہ انتظار حسین کی تخلیقات کا فکشن کی تنقید کے مروجہ اصولوں، پیمانوں اور ذاتی وادبی تعصّبات وعناد سے قطع نظر ہو کے کھلے ذہن سے اُن کی تحریروں کا مطالعہ کریں تاکہ اُن عناصر یا پہلوؤں کا پتا چل سکے جن عناصر کی بنیاد پر انہوں نے افسانے کی مروجہ شعریات سے انحراف کر کے اپنی تحریروں کو امتیازی خصوصیات بخشیں۔

## حوالہ جات

[۱] فکشن مطالعات، پس ساختیاتی تناظر، شافع قدوائی، ص ۸۸ [۲] افسانہ روایت اور مسائل، گوپی چند نارنگ، بحوالہ فرقہ واریت اور اردو ہندی افسانے، شیخ محمد غیاث الدین، ص ۳۳۰ [۳] ایضاً [۴] انتظار حُسین ایک دبستان، ارتضیٰ کریم، ص ۱۵

◄● ►

South Campus, Men's Hostel "I", Room No. 132
University of Hyderabad Prof. C.R.Rao Road
Kachchi Bowli Hyderabad(Tilangana) 500046
rafidowais@gmail.com
7730866990

## ● سید عمران بلخی

# سماج ادب کا آئینہ ہوتا ہے

عام طور پر اردو والے مسلمانوں کی تہذیبی روش کو اپناتے ہیں۔اس سے غرض نہیں کہ مذہب و ملّت کیا ہے۔اردو والے ملنے پر تسلیم کہیں گے اور سلامتی اور بقا کی ضرور دعا دیں گے۔موت کی خبر سنتے ہی جوار رحمت میں جگہ نصیب ہونے کی دعا کی جائے گی اور اللہ سے مغفرت مانگی جائے گی۔ان کے مذہبی عقیدے کا خدا جو بھی ہو یہاں تک کہ لادین اردو کا ادیب اور قبیلے کا فرد بھی انشا اللہ، ماشا اللہ، سبحان اللہ، الحمد وللہ وغیرہ گاہے گاہے گفتگو میں دانستہ اور غیر دانستہ طور پر ضرور لائے گا اور خدا کا ذکر بے اختیار اس کی زبان پر آجائے گا۔

جب پنڈت برج نارائن چکبست اردو میں رامائن رچتے ہیں تو وہ بھی رام جی کے بنواس کے واقعہ کا بیان بھی کچھ یوں کرتے ہیں۔'رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام!' یہاں یہ اردو کلچر کا اثر ہے، اردو تہذیب کا اثر ہے یا اردو شاعری میں مذہبی تسلط کچھ بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے...... ہاں! پنڈت برج نارائن چکبست کسی پابند شریعت مولوی کی تعلیم سے متاثر اور تربیت یافتہ ضرور لگتے ہیں۔

مرحوم انتظار حسین نے بھی بہت سی اساطیری کہانیاں لکھی ہیں۔ان کے رچے ہوئے کردار اوشا پر بھائی کے شریر سے سمبھوگ کرنے کا آروپ لگتے ہی مرحوم کو بھی کہیں چین سے نہ رہنے دیا گیا تو کیا ہوگا۔ آروپ لگتے ہی سوال یہ اُٹھے گا کہ پتی کا شریر جس پر بھائی کا سر جوڑ دیا گیا وہی اصلاً اس کے دیہہ اور من کا ادھیکاری ہے یا بھائی کا شریر جس کے اوپر پتی کا ماتھا استھاپت کر دیا گیا۔وہ شریر کیا مستک، ماتھا جو دماغ پریم راس کا واچک تھا، وہ من کا ادھیکاری ہے اور شریر جو تن کو اُتّیجت کر بھوگتا تھا اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔یا وہ شریر ہی اصلاً اس کے تن کو بھوگنے کا ادھیکاری ہے۔اور وہ جو کہ وہ ماتھا رکھتا تھا جو راکھی کی پرمپرا نبھاتا آیا تھا اور جس کی سوچ میں اس کا شریر پوتر اور ابھوگنیئے تھا وہ اب چونکہ اسکے پتی کا شریر رکھ رہا تھا سو وہی اس شریر کو بھوگنے کا ادھیکاری ہے۔اوشا کا دھرم سنکٹ اب اردو پر بھی کہیں نہ منڈ رائے۔اس کی آتما من مستک اور اس کا شریر بھی اب کس کے لیے کیا ہے یہ بتانے کے لیے بھی تو انتظار حسین اس جہان فانی میں نہیں ہیں۔

پاکستان اور ہندستان کے اردو سماج میں بھی تو یہی ہے کہ مستک کسی کا تو شریر کسی اور کا ہے اور



دونوں ملکوں کا معاشرہ بھی تو اب اوشا کا کردار بن چکا ہے۔معاشرہ انتظار حسین کی اس کہانی کو جی رہا ہے سماج ہی ان کی اس ادبی رچنا کا آئینہ بن گیا ہے۔سلامت رہیں انتظار حسین...... میں یہ بھی تو نہیں کہہ سکتا کیوں کہ آپ تو سدھار لیے۔

اور ہمارے سماج کو آپ ادبی آئینہ بنا گئے یا یوں کہیں کہ آپ کی اس تحریر کا عکس اور اس کی چھوی کو ہم سماج میں دیکھنے لگے ہیں اور سماج ہی آپ کی انہی ادبی تخلیقات کا آئینہ بن گیا ہے۔اگر یوں ہوا ہے تو آپ ہی کیا انتظار حسین صاحب، عصمت کے ادب کا بھی آئینہ سماج ہے، منٹو کے ادب کا بھی آئینہ سماج ہے، بیدی کے ادب کا بھی آئینہ سماج ہے، غلام عباس کے ادب کا بھی آئینہ ہے، پیغام آفاقی کے ادب کا بھی، حسین الحق کے ادب کا بھی، سلام بن رزاق کے ادب کا بھی اور اردو ہندی اور دیگر زبانوں کے باقی سبھی لکھاریوں کے ادب کا بھی آئینہ سماج ہے۔سماج ادب کا آئینہ ہے۔یہ بات واضح طور پر اُبھری ہے......ٹھوس شکل میں سامنے آئی ہے مرحومین لکھاریوں کی دنیا اور تخلیقات سماج میں معکوس ہیں۔انہوں نے جیسا لکھا ویسا ہی سماج ہو گیا۔موجودہ لکھاریو! آپ جیسا ادب لکھ رہے ہو ہم ویسا ہی سماج دیکھ رہے ہیں۔ہم پر رحم کھاؤ......مثبت ادب لکھو کہ ہم مثبت سماج دیکھیں منفی ادب مت لکھو کہ ہم منفی سماج دیکھیں۔آپ اپنے قلم کی رچنا گری لفظوں تک ہی محدود نہ سمجھیں۔آپ کردار کو سماج میں اتارتے ہیں اور سماج آپ کے کرداروں سے پٹا پڑا دکھتا ہے۔آپ ریپ مرڈر لکھ کر سماج میں اسکو معکوس کرتے ہیں۔یا پھر آپ نیکی سے پُر اور بلند کردار والے کرداروں کو پیش کر کے سماج میں نیک اور بلند کردار پیدا کرتے ہیں۔انتظار حسین صاحب آپ گزر گئے مگر اب عالم بالا سے دیکھئے۔برصغیر کا ہر شہری اوشا ہو گیا ہے اور پاکستان اور ہندستان دو شریر بن گئے ہیں جن پر دو الگ الگ سر جڑ گئے ہیں دونوں ملکوں کا شہری فرداً فرداً اوشا کا کرب جھیلتا ہے اور جھیل رہا ہے......انتظار حسین! کاش آپ یہ کہانی نہیں لکھتے۔شائد آپ اس وقت صرف یہ سمجھ رہے تھے ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اگر آپ یہ بھی سمجھ رہے ہوتے کہ سماج ادب کا آئینہ ہوتا ہے تو شائد کچھ اور رچتے۔صرف جسم ہی سچا نہیں سایا بھی تو سچ ہے۔

کاش آپ مان رہے ہوتے کہ 'سماج ادب کا آئینہ ہوتا ہے۔'

◄◄ ● ►►

Manama, Bahrain
Mob: +966552197727

● **خاکہ**

● **انتظار حسین**

# اے حمید: افسانہ نگار جو پہلوان بنتے بنتے رہ گیا

**(۱۹۲۸ء۔۲۰۱۱ء)**

۱۹۴۸ء میں جب اے حمید پہلی مرتبہ ٹی ہاؤس میں نمودار ہوا تھا تو بالکل نہیں لگا تھا کہ وہ اکھاڑے سے بھاگ کر اور اپنے پہلوان باپ کی مار کھا کر یہاں آیا ہے۔ اس کی چال ڈھال چغلی کھا رہی تھی کہ یہ کوئی رومانٹک روح ہے جو بھٹک کر یہاں آنکلی ہے۔ انہی دنوں اس کا ایک افسانہ شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا ''منزل منزل''۔ یہ اردو افسانے کی دنیا میں اس کا پہلا قدم تھا۔ اس افسانے سے بھی یہی غمازی ہوتی تھی کہ یہ نوخیز رومانی مزاج لے کر افسانے میں نمودار ہوا ہے۔

اس اکھاڑے کا نقشہ کھینچتے ہوئے اے حمید نے ان امرودوں کے پیڑوں کو بہت یاد رکھا جو اس اکھاڑے کے اردگرد کھڑے تھے اور میٹھے امرودوں سے لدے ہوئے تھے۔ ہم نے پوچھا کہ پھر وہاں سے بھاگ کیوں آئے۔ کہنے لگا کہ یار! میرا باپ مجھے مارتا بہت تھا اور بہت ڈنڈ بیٹھک کراتا تھا۔ بس میں بھاگ کھڑا ہوا۔

بھاگ کر وہ کہاں کہاں گیا کلکتہ، بمبئی، رنگون، کلکتہ، بنگال کا جادو، کانسی کی گڑیاں، مٹکیاں، ایک دیوداسی سانولی سلونی۔ اے حمید نے اس کا عجیب نقشہ کھینچا۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کر کہا کہ ''وہ ایسی نظروں سے اوجھل ہوئی کہ پھر نظر ہی نہیں آئی۔''

اے حمید کس خمیر کا بنا تھا اور آنکھوں میں کس قسم کے خواب لیے پھرتا تھا۔ مت پوچھیے کہ اپراوتی ندی اور اس نوح کے جنگلوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کا تخیل کیسے کیسے گل کھلاتا۔ پھر اس سب کچھ کا عکس اس کے افسانوں میں بھی نظر آیا۔ یہ رنگ اس کے افسانے کو لے اڑا اور پھر ترقی پسند تحریک ان دنوں اپنے عروج پر تھی۔ اس نے اس دانے کو نگینہ سمجھ کر چن لیا۔

ویسے تو اس قسم کا مزاج ترقی پسند نظریے کو وارا نہیں کھاتا۔ اس کے حساب سے تو یہ فراریت پسندی ہے مگر افراد بھی اور تحریکیں بھی تجربے سے بھی تو کچھ نہ کچھ سیکھتی ہیں۔ کرشن چندر کی مثال سے ترقی



پسند تحریک نے یہ جانا کہ ایسی رومانی طبیعتیں بھی اگر تھوڑی سی حقیقت نگاری کو اپنا لیں تو تحریک کے مقاصد پورے کر سکتی ہیں اور کرشن چندر ایسا رومانیت پسند بھی 'گرجن کی ایک شام'، ایسے رومانی افسانے لکھنے کے بعد 'ان داتا' جیسا افسانہ بھی لکھ سکتا ہے۔

مگر افسوس کہ اے حمید کرشن چندر نہیں بن سکا۔ بس بنتے بنتے رہ گیا۔ کرشن چندر سے اسے داد بھی کمال ملتی تھی۔ ابھی تک ہمیں اس کا یہ لکھا ہوا فقرہ یاد ہے کہ اے حمید کا افسانہ پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ میں زردے میں ملائی ملا کر کھا رہا ہوں۔ یہ فقرہ خود ایک رومانٹک مزاج کی چغلی کھا رہا ہے۔

اے حمید کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس نے اپنے افسانے کے دائرے سے نکل کر جس سمت میں قدم بڑھایا کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ اس کے ابتدا کے افسانوں کے دو مجموعے اور ایک ناول ''ڈربے''...... یہاں وہ اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ جب اس نے بچوں کے لیے لکھنا شروع کیا تو وہاں اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ پھر اس نے چند ایسے ناول لکھے جن کے متعلق ادب کے نقادوں کے رائے کچھ بھی ہو مگر قبول عام کی سند اسے مل گئی۔

بشکریہ......اخبار اردو اسلام آباد جولائی ۲۰۱۱ء

◀ ● ▶


| | |
|---|---|
| نام کتاب : منتخبات شاد عارفی<br>مصنف : پروفیسر مظفر حنفی<br>سن اشاعت : ۲۰۱۶ء<br>قیمت : ۳۵۰/روپے<br>ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی | نام کتاب: خدا سے سوال (افسانوی مجموعہ)<br>مصنف : ڈاکٹر اختر آزاد<br>سن اشاعت: ۲۰۰۵ء<br>قیمت : ۳۰۰/روپے<br>ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی |
| نام کتاب : غبار (افسانوی مجموعہ)<br>مصنف : اسرار گاندھی<br>سن اشاعت : ۲۰۱۴ء<br>قیمت : ۲۰۰/روپے<br>ملنے کا پتہ: اسرار گاندھی کرام کی چوکی، الہ آباد | نام کتاب : سید اجمل فرید یادیں باتیں<br>مصنف : ڈاکٹر منصور خوشتر<br>سن اشاعت : ۲۰۱۵ء<br>قیمت : ۵۰۰/روپے<br>ملنے کا پتہ: سہ ماہی دربھنگہ ٹائمس، شوکت علی ہاؤس محلّہ پرانی منصفی، دربھنگہ (بہار |

## ● انتخاب

## ● انتظار حسین

# پسماندگان

ہاشم خان اٹھائیس برس کا کڑیل جوان، لمبا تڑنگا، سرخ وسفید جسم آن کی آن میں چٹ پٹ ہوگیا۔ کمبخت مرض بھی آندھی وہاندی آیا۔ صبح کو ہلکی حرارت تھی، شام ہوتے ہوتے بخار تیز ہوگیا۔ صبح جب ڈاکٹر آیا تو پتہ چلا کہ سرسام ہوگیا ہے۔ غریب ماں باپ نے اپنی سی سب کچھ کرڈالی۔ دن بھر میں ڈاکٹر سے لے کر پیروں فقیروں تک سب کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن نہ دوا دارو نے اثر کیا اور نہ تعویذ گنڈے کام آئے۔ پہر رات ہوئی تھی پھر حالت بگڑگئی اور ایسی بگڑی کہ صبح پکڑنی دشوار ہوگئی۔ ماں باپ نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی اور بلک بلک کر دعا مانگی کہ کسی طرح صبح ہوجائے۔ ان کی دعا قبول ہوئی تو سہی مگر ادھر صبح کا گجر بجا ادھر مریض نے پٹ سے دم دے دیا۔ آناً فاناً مرنے والوں کی خبر بھی آناً فاناً پھیلتی ہے سارے محلّہ میں، ملک پڑ گیا۔ جس نے سنا سناٹے میں آگیا۔ حلیمہ بوا کے گھر خبر نبو نے پہنچائی۔ دہلیز میں قدم رکھتے ہی بولی۔

''اجی حلیمہ بوا قہر ہوگیا۔ ہاشم ختم ہوگیا۔'' حلیمہ بوا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہئے! ہئے!!'' حلیمہ بوا اس وقت چولہے پہ بیٹھی بچوں کے ناشتہ کے لئے روٹی ڈال رہی تھی۔ مگر ہاتھ پیر ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ فوراً انہوں نے الٹا چولہے کی آگ ٹھنڈی کردی۔ کلثوم کی بیٹی کی خانصاحبنی سے ایسی لڑائی تھی کہ آپس کا بھاجی بخرا ابھی بند تھا۔ چنانچہ کلثوم کی بیٹی کا منہ کھلا ہوا ہے۔

''نابی بی میں ضرور جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر چادر اٹھا فوراً خانصاحبنی کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ صوبیدارنی بھی خبر سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر پھر انہیں کچھ خیال آیا۔ صوبیدار صاحب کو مردانے سے بلوا کر ہدایت کی کہ ایک وقت کی روٹی ہماری طرف سے ہوگی۔ اس کا انتظام کرواؤ، میں جارہی ہوں۔ پھر انہوں نے چلتے چلتے نوکرانی کو بھی ایک ہدایت کرڈالی کہ ارے دیکھ ری رات کی روٹیاں رکھی ہیں لونڈے کو بھوک لگے تو گھی بورا سے اسے روٹی کھلا دیجو۔

صوبیدارنی نے خانصاحبنی کے گھر تک کا راستہ عجلت سے لیکن خاموشی سے طے کیا۔ انہوں نے



عورتوں کی تقلید مناسب نہ سمجھی جنھوں نے مردوں کے ہجوم سے گزرتے ہوئے گلی ہی سے اپنے جذبات کا دبا دبا اظہار شروع کردیا تھا۔ ہاں دہلیز سے گھسنے کے بعد ان سے ضبط نہ ہوسکا۔ ان کے بین صرف چند لمحوں تک سنے جاسکے۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اس میں صوبیدارنی یا کسی کی آواز بھی الگ سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا لیکن باہر اسی قدر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھک سے کرسیاں اٹھادی گئی تھیں۔ اب وہاں صرف جاجم بچھی ہوئی تھی۔ ایک شخص خاموشی سے بیٹھا کفن سی رہا ہے۔ اس کے چہرے پہ نہ تو حزن وملال کی کیفیت تھی اور نہ اطمینان اور خوشی کی جھلک تھی۔ ایسی جاندار چیزیں بھی ہوتی ہیں جو احساس سے سرے سے ہی عاری ہوتی ہیں اور ایسی بے جان چیزیں بھی ہوتی ہیں جو ہردم ایک نئی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ سفید لٹھا عید کی چاندنی رات کو درزی کی جس دکان اور جس گھر میں نظر آتا ہے اس سے حرکت اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ جب اس کا کفن سلتا ہے تو سفید غبار کی طرح بیٹھنے لگتا ہے۔ بیٹھک میں سب سے نمایاں چیز تو یہ کفن ہی تھا۔ ویسے اس سے الگ ایک کونے میں خان صاحب گھٹنوں میں سر دئے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اکا دکا اور لوگ بھی وہاں نظر آتے لیکن زیادہ لوگوں نے بیٹھک سے باہر گلی میں ٹھہرنا مناسب سمجھا تھا۔ دبی دبی آواز میں گفتگو ہوتی اور خود بخود ختم ہو جاتی۔ پھر کوئی نیا شخص گلی میں داخل ہوتا۔ آہستہ سے کسی کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ سرگوشی کے انداز میں کچھ سوال کرتا۔ کچھ غم اور حیرت کا اظہار کرتا اور پھر چپ ہوجاتا۔ صوبیدار سب سے الگ بیٹھک کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھے کسی سوچ میں گم تھے۔ بیٹھک کے سامنے ذرا ہٹ کر ایک دوسرا مکان تھا جس کے چبوترے پہ باقر بھائی اور تجمل بیٹھے بڑے سنجیدہ انداز میں ہولے ہولے باتیں کرتے تھے۔ ان کے اندازِ گفتگو نے علی ریاض کو کئی مرتبہ للچایا تھا، لیکن ان کے پاس جانے کا اسے کوئی بہانہ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ جب چھنوں میاں وہاں پہنچے تو ہمت کر کے وہ بھی آہستہ سے ادھر ہولیا۔ چھنوں میاں ہاشم کی خبر سن کر گھر سے بہت لپ کے چلے تھے لیکن گلی میں داخل ہوتے ہی ان کی رفتار دھیمی پڑگئی شاید انہیں اپنے قدموں کی آہٹ سے بھی کچھ الجھن ہورہی تھی۔ چھنوں میاں جب تجمل اور باقر بھائی کے پاس پہنچے تو اس وقت تجمل ہاشم خاں کے تھانیداری کے انتخاب کا ذکر کررہا تھا۔ ہاشم خاں کی چھاتی تھی غضب تھی مجھ سے تو دو اس میں سما جائیں۔ بس باقر بھائی سمجھ لو کہ سپرنٹنڈنٹ نے جو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ علی ریاض آہستہ سے بولے۔

''کیا خبر ہے بھائی اسی کی نظر لگ گئی ہو۔''

''ہاں کیا خبر ہے۔'' تجمل نے تائید کی۔

باقر بھائی دھیمے سے لہجے میں بولے۔

''سب کہنے کی باتیں ہیں۔ موت کا بہانہ ہوتا ہے۔''

کُلُّ نفسٍ ذَائِقَۃَ الموتِ۔

چھنوں میاں نے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ ''کیا خدا کی قدرت ہے؟'' باقر بھائی دونوں ہاتھوں سے

سر پکڑے اکڑوں بیٹھے تھے۔نگاہیں زمین پہ جمی ہوئی تھیں۔اسی کیفیت میں بیٹھے بیٹھے پھر بولے۔

''آدمی میں کیا رکھا ہے۔ہوا کا جھونکا ہے آیا اور گیا۔''

علی ریاض کی آنکھوں میں ایک تحیر کی کیفیت پیدا ہوئی۔

''باقر بھائی کیا ہوتا ہے۔آدمی اچھا خاصا بیٹھا کہ ہچکی آئی، پٹ سے دم نکل گیا۔جارہا ہے۔جارہا ہے۔ٹھوکر لگی۔آدمی ختم کچھ عجب کرشمہ ہے۔''

باقر بھائی سوچتے ہوئے بولے۔

''بس بھائی سانس کا ایک تار ہے، جب تک چلتا ہے، چلتا ہے۔ذرا ٹھیس لگی، تار ٹوٹا آدمی ختم۔''

باقر بھائی اور چھنوں میاں دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ چند لمحوں تک علی ریاض بھی چپ رہا۔مگر وہ بولا بھی تو کچھ اس انداز سے گویا خواب میں بڑبڑا رہا ہے۔

''زندگی کا کیا بھروسہ۔آنکھ بند ہوئی کھیل ختم کیسا ستم ہے، اِدھر نوکری کا پروانہ آیا اُدھر موت کا تارِ برقی آ گیا۔اس کے بھید وہی جانے، عجب کارخانہ ہے اس کا۔''

پھر علی ریاض بھی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ایک ڈیڑھ منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔علی ریاض اور چھنوں میاں دونوں بت بنے ہوئے تھے۔باقر بھائی بدستور ہاتھوں میں سر تھامے کہنیاں گھٹنوں پہ ٹیکے بیٹھے تھے۔مگر ان کی آنکھیں شاید اب بند ہوتی جا رہی تھیں۔علی ریاض پھر چونکا اور باقر بھائی سے مخاطب ہوا۔

''باقر بھائی خدا ہے بھی یا نہیں؟'' باقر بھائی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔''بھائی میرے!'' وہ رکے اور پھر بولے۔

''موت ہی اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ خدا ہے۔''

علی ریاض باقر بھائی کی صورت تکتا رہا۔ پھر خیال کی نہ جانے کونسی دنیا میں پہنچ گیا۔تجمل اور چھنوں میاں پھر کسی خیال میں گم تھے۔ پھر چھنوں میاں نے گھٹنے سے اپنی ٹھوڑی اٹھائی اور نیم محسوس سے انداز میں پھر چھا گئی۔ باقر بھائی اس طرح بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔البتہ علی ریاض اور تجمل نے ان کی طرف دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔چھنوں میاں کی زبان سے ایک فقرہ پھر نکلا۔

''بار بار اس کی شکل آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔یقین نہیں آتا کہ وہ مر گیا۔''

''یقین کیسے آئے یار!'' تجمل آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔''ترسوں تک تو اچھا بھلا تھا۔بازار میں مجھ سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ میں پوچھنے لگا، ہاشم خاں! کب جا رہے ہو نوکری پہ؟ بولا، یار تقرری تو ہوگئی ہے اس ہفتے میں چلا ہی جاؤں گا۔علی ریاض نے ٹھنڈا سانس لیا۔

''ہاں، غریب چلا ہی گیا۔'' چھنوں میاں نے علی ریاض کے فقرے پر دھیان نہیں دیا۔ وہ تجمل



سے مخاطب تھے۔

''بھئی پچھلی جمعرات کو میں اور وہ دونوں شکار کو گئے ہیں۔'' شکار کے لفظ کے ساتھ ساتھ مختلف انمٹ بے جوڑ تصویریں چھنوں میاں کی آنکھوں کے سامنے ابھر آئیں۔پھر ریں لے کر بولے۔

''کیا نشانہ تھا نیک بخت کا۔صبح کی دھند میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔قازیں ہڑبڑا کر اٹھی ہیں۔پروں کی پھڑ پھڑ پھڑاہٹ پہ دھوں سے گولی چلائی اور قازیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔اب اسی دفعہ کا ذکر ہے صاحب مجھے تو پتہ چلا نہیں کہ ہرنی کدھر سے اٹھی اور کدھر چلی۔ بندوق کو تانتے ہوئے بولا، وہ ہرنی چلی۔میں نے کہا کہ بہت دور ہے، مگر وہ بھلا مانس کہاں سنتا تھا، دھن سے گولی چلا دی۔ ہرنی بیس قدم گری، چلی اور پھر لڑکھڑا کے گر پڑی۔چھنوں میاں چپ ہوگئے۔پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے

''وقت کی بات ہے۔بعض وقت منہ سے ایسی آواز نکلتی ہے کہ پوری ہو کر رہتی ہے۔شکار سے واپسی میں کہنے لگا۔

''چھنوں میاں اپنا یہ آخری شکار تھا۔اب ہم چلے جائیں گے۔غریب سچ مچ چلا گیا۔''

باقر بھائی کے جسم کو آخر ذرا جنبش ہوئی۔سوچتے ہوئے بولے

''جمعرات کا دن تھا وقت کیا تھا؟'' علی ریاض اور تجمل دونوں بھائی کو تکنے لگے۔باقر بھائی اک ذرا تامل سے ہچکچاتے ہوئے بولے۔

''ایسے وقت میں جانور کو نہیں مارنا چاہئے۔''

آہستہ آہستہ اٹھتے قدموں کے افسردہ شور سے ساری بزریا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔کالے پنواڑی کی دکان پہ جو قہقہے بلند ہو رہے تھے وہ ایکا ایکی بند ہوگئے۔سامنے کے کوٹھے والی نکئی پہاڑن کے سلسلہ میں شبراتی کے ذہن میں ایک بہت پھڑکتا ہوا فقرہ آیا تھا۔اسے اس اچھے فقرے کا گلا گھونٹ دینا پڑا۔ سامنے ایک سائیکل سوار گزر رہا تھا۔میت دیکھ کر وہ بھی سائیکل سے اتر پڑا۔سمی حلوائی اس وقت موتی چور کے لڈو بنا رہا تھا۔اس کے ہاتھ یک بیک رک گئے اور آنکھوں میں ایک حیرت انگیز افسردگی کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ملا پنساری کے اعصاب پر مذہب سوار تھا شائد اس لیے وہ موت کی سنجیدگی سے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مرعوب ہو جاتا تھا۔ بڑھیا کو تین پیسے کا دھنیا تولتے تولتے وہ ایک ساتھ اُٹھ کر کھڑا ہوا اور جب تک جنازے کو کاندھا دینے کا ثواب حاصل نہ کر لیا پلٹ کر نہیں آیا۔ یوں تو اس نے واپس آتے ہی کام میں لگ جانے کی کوشش کی تھی۔مگر بڑھیا کے بھی آخر کچھ روحانی مطالبات تھے۔ملاں کے واپس آتے ہی اس نے سوال کیا۔''بھیا رے! یو کس کی میت تھی؟'' ملاں نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''خانصاحب ہیں نا، ان کا لونڈا گذر گیا۔'' بڑھیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔''ہائے اللہ!''

ہیرا سنارا ابھی ابھی گلال لینے کی نیت سے دکان پہ پہنچا تھا۔خانصاحب کا سن کر وہ چونکا۔

’’خانصاحب جی کا پتر؟ وامر گیئو؟ بڑی گھٹنا ہوگئی۔‘‘ پھر ذرا تامل سے بولا۔

’’وا کی دیئی تو بڑی بنی ہوئی تھی کیسے مر گیو؟‘‘

ملاں نے پھر ٹھنڈا سانس لیا۔’’مہاراج موت بڑی بلوان ہے۔ وہ بوڑھے جوان کسی کو نہیں چھوڑتی۔‘‘ ہیرا ابھی بہک نکلا۔

’’ملاں یو تو سچ کیہوے ہے۔موت تو جوگیوں اور مہارشیوں کو بھی آئی اور شکتی مان راجوں مہاراجوں کو بھی آئی۔راجہ کنش ادھک چتر ہنو تھا، پر موت نے دا کو بھی داب ہی لیو۔‘‘ ملاں کے لہجے میں اب توانائی پیدا ہوئی۔

’’لالہ! رشی منی ہوں یا پیر پیغمبر، موت نے کسی کو معاف نہیں کیا۔سنا کیا کہ افلاطون نے ایک بوٹی تیار کی۔اپنے شاگرد سے مرتے وقت کہا کہ مجھے دفن مت کیجیو۔یہ بوٹی چراغ میں ڈال کے میرے سرہانے چالیس دن تک جلائیو۔ چراغ بجھنے نہ پائے۔ چالیسویں دن میں اٹھ کھڑا ہوں گا۔مگر چالیسویں دن کیا ہوا کہ شاگرد کی آنکھ لگ گئی اور چراغ بجھ گیا۔افلاطون مرا کا مرا رہ گیا۔تو لالہ، موت بڑی ظالم ہے۔‘‘

ہیرا کا سر جھک گیا۔ بڑھیا کے لہجہ میں افسردگی پیدا ہوگئی۔

’’ہاں بابا! موت پر کسو کا کیا بس ہے۔‘‘ بڑھیا چپ ہوگئی مگر جب کوئی کچھ نہ ملا تو ایک فقرہ پھر اس کی زبان سے نکل گیا۔

’’خانصاحبنی کے دونوں کڑیل جوان گئے۔اس کے غضب سے ڈرتا ہی رہے۔‘‘

ملاں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

’’بڑی بیوہ امتحان لیوے ہے۔‘‘

شبراتی نہ جانے کس لہر میں کالے کی دکان سے اٹھ کر ملاں کی دکان پر آ بیٹھا تھا۔ ملاں کے اس فقرے سے وہ گرما گیا۔

’’ملاں بے! یوں تیرا خدا بڑی زہری ہے، جو اس کے امتحان کے اڑنگے میں آ گیا۔اس کا کباڑا ہو گیا۔‘‘

ملاں کو ٹوٹ کر غصہ تو شاید ہی زندگی میں آیا ہو۔مگر اس کے لہجے میں ہلکی سی برہمی ضرور پیدا ہو گئی کہنے لگا۔

’’بھیا! خدا تو میرا بھی ہے اور تیرا بھی ہے۔‘‘

شبراتی کی بغاوت کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ جواب وہ کیا دیتا۔اس کا سر جھک گیا اور اس



کی ٹھوڑی کھسک کر گھٹنوں پہ آن ٹکی۔ملاں اب شبراتی سے قطعاً بے نیاز ہو کر فضا میں گھورنے لگا تھا۔

بڑھیا کنجڑی، ہیرا، شبراتی، ملاں چاروں کے چاروں چند لمحوں کے لیے بالکل گم سم ہو گئے اور ان کے چہروں پہ کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوگئی جو زندگی کی بے ثباتی اور کسی بڑی طاقت کے وجود کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔آخر بڑھیا کنجڑی چونکی۔

’’لا میرے بیر ادھنیا باندھ دے۔میں چلی۔‘‘

ملاں نے ہڑبڑا کر ترازو اٹھائی اور دھنیا تول کر کاغذ میں باندھنے لگا۔اب ہیرا بھی ہوش میں آ گیا تھا۔اس نے تقاضا کیا۔

’’ملاں مو کو بھی گلال باندھ دے۔‘‘

’’کتنے کا دوں؟‘‘

’’اکنی کا۔‘‘

لالہ اکنی کے گلال میں آ گیا بینک لگے گی تہوار روز روز تھوڑا ہی آوے ہے۔

پہاڑن نکٹی اب بن ٹھن کر اپنے چھجے پہ آ کھڑی ہوئی تھی۔ کسی جلے تن کے نے پچھلے برس اس کی بے مروتی سے بھن کر دن دہاڑے دانتوں سے اس کی ناک کاٹ لی تھی۔ یوں اس کے سیاہ چہرے کی پھبن تو ضرور بگڑ گئی تھی مگر اس سے نہ تو اس کی قہر بھری گات کا جادو زائل ہوا تھا اور نہ اس کے ٹھسے میں فرق پڑا تھا۔ شبراتی نے اسے دیکھ کر زور سے انگڑائی لی اور اونچی لے میں گانے لگا۔

’’یا رب نگاہِ ناز پہ لائسنس کیوں نہیں؟‘‘ بنو کو یہ فائدہ تھا کہ خانصابنی کی دیوار سے اس کی دیوار ملی ہوئی تھی بلکہ اس مشترک دیوار میں باہمی سمجھوتے سے ایک الٹی سیدھی کھڑکی بھی چھوڑی گئی تھی۔آج یہ کھڑکی بنو کے بہت کام آئی۔آنسوؤں کا غلبہ جب بھی کم ہوا اور طبیعت رونے سے جب بھی ذرا اُچاٹ ہوئی بنو اس کھڑکی سے نکل کر اپنے گھر پہنچ گئی۔

حلیمہ بوا نے تو اُلٹتے وقت اپنے ننھے نواسے کا خیال ہی نہیں کیا تھا۔اب اس نے بھوک بھوک کا غل مچانا شروع کیا۔ جنازہ اٹھنے کے بعد وہ بھی اس کھڑکی سے نکل بنو کے گھر جا پہنچیں۔ان کا مقصد تو صرف اتنا تھا کہ بنو کے گھر رات کا کوئی ٹکڑا نوالہ بچا ہو تو نواسے کو کھلا کر اس کا حلق بند کر دیں۔وہاں وہ بنو سے باتوں میں لگ گئیں۔حلیمہ بوا کی آنکھوں میں ہاشم خاں کی تصویر بار بار پھر جاتی تھی۔خانصاحبنی کی بدنصیبی کا خیال بھی انہیں رہ رہ کر آ رہا تھا۔بنو پر بھی تقریباً کچھ یہی عالم گزر رہا تھا۔چنانچہ جب حلیمہ بوا نے یہ کہا۔

’’ڈوبی خانصاحبنی تو جیتے جی مر گئی۔تو بنو کی آواز میں بھی درد پیدا ہو گیا بولی۔

’’بدنصیب کی کوکھ اجڑ گئی۔دو پوت تھے دونوں ختم ہو گئے۔آنگن میں جھاڑو سی دل گئی۔‘‘

حلیمہ بوا کچھ دیر چپ رہیں پھر کھوئے کھوئے سے انداز میں بولیں۔

''حضوں کی قسمت ہی ایسی ہووے ہے۔ خانصاحبنی کمبخت کو عہدے راس نہیں آئے۔ یاد نہیں جب خانصاحب کو مجسٹریٹی ملی تھی تو کیسے کھٹیا پہ پڑے تھے۔''

''ہاں آ! حاکم ہوتے موئے مرض کی بھینٹ چڑھ گیا عہدہ۔''

حلیمہ بوا کو خانصاحبنی کے بڑے بیٹے کا واقعہ یاد آ گیا۔ ''اس کا بڑا پوت بھی ایسے ہی جوانی کی بھری بہار میں گیا۔ اے بی بی یہ سمجھو کہ چاند کی پہلی کو تحصیلداری کا خط آیا اور ستائیسویں کو اس غریب کا تار آ گیا۔ وہ بھی آناً فاناً گیا۔ خانصاحبی کی ساری موتیں ایسے ہی ہوئیں۔''

بنو کسی اور عالم میں کھوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں اور ان آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ چند لمحے بالکل چپ رہی پھر ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔ پالیں پوسیں چھاتی پہ سلا سلا کے بڑا کریں اور پھر قبر میں سلا آئیں، غضب ہے۔''

بنو پھر اس عالم میں کھوگئی۔ حلیمہ بوا بھی کچھ متاثر ہوئیں اب وہ بھی چپ تھیں۔ حلیمہ بوا کو پھر کچھ یاد آیا۔ بولیں

''کمبخت ہاتھوں میں دل رکھتی تھی پوت کا۔ اس عید پہ اس کے لیے وہ بھاری اچکن بنوائی کہ کیا کوئی بیاہ میں بنوائے گا۔ بنو اسی کھوئے کھوئے انداز میں پھر بولی

''رزق برق پوشاکیں سب رکھی رہ جاویں ہیں۔ چاند کے سے ٹکڑوں پہ دم کے دم میں سینکڑوں من مٹی پڑ جاوے ہے۔'' بنو چپ ہوگئی تھی۔ حلیمہ بوا گم متھان بنی بیٹھی تھی۔

بنو ایک ساتھ پھر چونکی اور حلیمہ بوا سے مخاطب ہوئی۔

''حلیمہ بوا یہ خدا کا کیا انصاف ہے جسے اولاد دے گا، دیئے چلا جاوے گا جس سے چھینے گا وس کا گھر اجاڑ کر رکھ دے گا۔''

حلیمہ بوا بولیں۔

''اری میا شکایت کیا ہے اس کی چیز تھی اس نے لے لی۔'' بنو نے اک ذرا تلخی سے جواب دیا۔

''اجی اولاد نہ ہو تو صبر ہے کہ بھئی تقدیر میں اولاد نہ تھی نہ ہوئی مگر کلیجے کے ٹکڑے یوں مٹی میں ملانے کے لیے کہاں سے جگر آوے۔''

حلیمہ بوا کو کوئی جواب بن نہ آیا تو وہ خاموش ہوگئیں لیکن پھر جلد ہی ان کی سمجھ میں بات آ گئی بولیں۔

''اجی سب اپنے اپنے اعمال ہووے ہیں۔'' انہوں نے اک ذرا تامل کیا اور پھر کہنے لگیں۔ ''بی بی! ہم نے تو کسی لڑنے والی کو پھلتے نہ دیکھا۔ کمبخت دانتا کِل کِل کوئی اچھی بات تھوڑا ہی ہے۔ کلثوم بات



بات پہ اس کے بیٹے کو یاد کرتی تھی۔ آخر بیٹا بدنصیب ختم ہوگیا۔'' اس سلسلے میں حلیمہ بوا بھی کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن ان کے لاڈلے نواسے نے پھر وہی رٹ لگانی شروع کر دی کہ ''بوا جی بھوک لگی ہے۔'' حلیمہ بوا نے اسے بہت بہلایا پھسلایا۔ مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔ حلیمہ بوا کو خود بھی اس کی بھوک کا احساس تھا۔ بنو سے کہنے لگیں ''میرا بچہ آج بھوک سے ہلکان ہوگیا۔'' بنو کو بھی دبی دبی شکایت پیدا ہوئی۔

''اجی ابھی تو میت گئی ہے کب لوگ واپس آئیں اور کب روٹی ملے۔''

حلیمہ بوا کو یکا یک ایک سوال یاد آیا۔

''اری روٹی کس کی طرف سے ہے؟''

''صوبیدارنی دے رہی ہے۔''

''پھر تو اچھی روٹی دے گی۔''

بنو تنگ آ کر بولی۔

''اجی ہاں ہاں اچھی روٹی دے گی۔ قبولی پک رہی ہے۔''

''قبولی؟'' حلیمہ بوا کو بڑا تعجب ہوا۔

''ڈوبا یہ الغاروں پیسہ جو ہے وہ کیا چھاتی پہ دھر کے قبر میں لے جاویگی۔'' بنو کہنے لگی۔

''حلیمہ بوا! یہ تو سب دل کی بات ہووے ہے۔ ہمارے باپ کی کیا حیثیت تھی مگر تمہیں تو یاد ہوگا ہماری ساس کے مرنے پہ گوشت روٹی دی تھی۔'' حلیمہ بوا تائیدی لہجے میں بولیں۔

''ارے بھئی! برادری کا تو لحاظ کرنا ہی پڑے ہے اور قبولی؟ قبولی تو بڈھوں ٹھڈوں کے مرنے میں دی جاوے ہے۔''

قبر تیار ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ علی ریاض، تجمل، باقر بھائی اور چھنوں میاں قبرستان سے نکل کر کربلا کی طرف ہو لیے۔ یہ کربلا ایسی لمبی چوڑی عمارت تو نہیں تھی۔ بس ایک بڑے رقبہ میں پکی چار دیواری کھینچی ہوئی تھی۔ شاید دانستہ یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ اس میں درخت نہیں ہونے چاہیں۔ پھر بھی ایک کونے میں نیم کے دو گھنے درخت نظر آتے تھے۔ اس کے عقب میں آموں کا ایک گھنا باغ تھا۔ بائیں سمت صرف بیریاں ہی نہیں بلکہ اس سے پرے املی کے بلند و بالا درخت بھی نظر آتے تھے۔ ایسے ماحول میں یہ کربلا لق و دق صحرا کا تاثر بھلا کیا پیش کرتی مگر اس کی فضا ایک گہری اداسی کا رنگ لیے ہوئے ضرور تھی۔ یہ چار دیواری تو پست ہی تھی لیکن اس کے پھاٹک کا آہنی کٹہرہ خاصا بلند تھا اور اس سے ایک ایسا وقار ٹپکتا تھا جو اس قسم کی عمارتوں کے دروازوں سے مخصوص ہے۔ مگر یہ آہنی کٹہرہ عمارت کی سب سے بلند چیز نہیں تھی۔ اس دروازے میں دو مینار بھی تو شامل تھے جو آہنی کٹہرے سے کہیں بلند تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کھلی فضا میں وہ دور سے پست ہی نظر آتے تھے۔ اس کھلی فضا میں ایک وسیع و عریض

چار دیواری کے ساتھ ان دو میناروں کو دیکھ کر کچھ اس قسم کی کیفیت گزرتی تھی جسے بعض لوگ کوئی صحیح لفظ موجود نہ ہونے کی وجہ سے احساس تنہائی کہنے لگے۔ آہنی دروازے کے عین سامنے ایک پکی قبر تھی جو زمین کی سطح سے بالکل ہموار تھی۔ باقر بھائی کو آج ہی نہیں اس سے پہلے بھی اکثر مرتبہ اس قبر پر شک ہوا تھا کہ ہر سال دلدل کی ناپیں اور ماتمیوں کے قدم دونوں اسے مس کرتے ہیں۔ یہ تو خیر سب جانتے تھے کہ یہ قبر مولانا حیدر امام کی تھی اور ان کے زہد کا احترام کرتے ہوئے ہی انہیں مناسب مقام پر دفن کیا گیا تھا۔ مگر علی ریاض اس شعر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس قبر پر نقش تھا۔ پہلا مصرعہ تو صاف تھا۔ بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ! لیکن دوسرے مصرعہ کے آخری لفظ بالکل مٹ گئے تھے۔ ہمیں سو گئے داستاں...... علی ریاض نے بہت بہت سر مارا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر باقر بھائی نے اس معمے کو حل کیا۔ کچھ تو انہیں مٹے ہوئے لفظ پڑھنے کی اٹکل تھی، پھر یوں بھی انہوں نے مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا وقت شاعری کے مطالعے پر بھی صرف کیا تھا۔ آخر بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے دوسرا مصرعہ پڑھا۔ ہمیں سو گئے داستان سنتے سنتے۔ علی ریاض نے ہی نہیں تجمل اور چھنوں میاں نے بھی شعر کی داد دی۔ علی ریاض نے بڑے اہتمام سے اپنے لہجے میں افسردگی کا رنگ پیدا کیا اور شعر پڑھنے لگا:

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستان ’سنتے سنتے‘

’’واہ!‘‘ چھنوں میاں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ’’کس کا شعر ہے؟‘‘

علی ریاض تھوڑا سا چکرایا پھر سوچتے ہوئے بولا۔

’’انیس کا معلوم ہوتا ہے؟ کیوں باقر بھائی؟‘‘

باقر بھائی نے جواب دیا۔ ’’بھئی شعر تو منہ سے بول رہا ہے کہ میں میر انیس کا ہوں۔‘‘

’’واہ واہ میر انیس بھی کیا کیا شعر کہہ گئے ہیں۔‘‘ چھنوں میاں نے پھر داد دی۔

’’باقر بھائی......‘‘ علی ریاض کا لہجہ یکایکی بدلا۔ ’’سنتے ہیں کہ میر انیس شعر خود نہیں کہتے تھے۔‘‘

چھنوں میاں کا چہرہ سرخ پڑ گیا تڑخ کر بولے۔

’’پھر کیا جنید خاں لکھ کے دے جاتے تھے؟‘‘

علی ریاض نے جلدی سے اپنی بات کی تشریح کی۔

’’اجی، ہم نے تو یہ سنا ہے کہ محرم کے دنوں میں میر انیس جب سو کے اٹھتے تھے تو ان کے سرہانے امام حسین علیہ السلام کا لکھا ہوا مرثیہ رکھا ہوتا تھا۔‘‘

چھنوں میاں کے چہرے پہ سرخی جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے غائب ہو گئی۔ ہاں اسی تیزی کے ساتھ ان کی آنکھوں میں حیرت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ’’اچھا؟‘‘



تجمل نے براہ راست باقر بھائی سے سوال کیا۔

’’کیوں بھائی، سچ ہے یہ؟‘‘

باقر بھائی نامعلوم کس قماش کی آدمی تھے، کسی بات کی نہ تو زور شور سے تائید کرتے تھے اور نہ زور شور سے تردید کرتے تھے۔ ان کے جواب میں ہاں اور نہیں دونوں پہلو شامل ہوتے تھے۔ کہنے لگے۔

’’ہاں، لکھنؤ جا کے کسی سے پوچھ لو اور یہ واقعہ تو لکھنؤ کے بچے بچے کی زبان پہ ہے۔‘‘ تجمل نے بے صبرے پن سے پوچھا۔ ’’کیا واقعہ؟‘‘

’’یہی کہ ایک دفعہ میر انیس اور مرزا دبیر میں بحث ہو گئی کہ دیکھیں مولا کو کس کا مرثیہ پسند ہے۔ دونوں نے مرثیہ لکھا اور اپنا اپنا مرثیہ بڑے امام باڑے میں عالموں کے پاس رکھ آئے۔ صبح کو جو جا کے دیکھیں ہیں تو میر انیس کا مرثیہ تو ویسا ہی لکھا ہے اور مرزا دبیر کے مرثیے پہ پنجے کا نشان۔‘‘

’’پنجے کا نشان؟‘‘ تجمل اور چھنوں میاں دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

علی ریاض نے بڑے اعتماد سے کہا۔

’’ہاں پنجے کا نشان۔ بس جناب میر انیس کا تو برا حال ہوا سمجھے کہ مولا کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی۔ پھر رات ہوئی۔ ذرا آنکھ جھپکی ہو گی کہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ میر انیس چونک پڑے......‘‘ علی ریاض رکا اور تجمل اور چھنوں میاں دونوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے باری باری دیکھا۔ تجمل اور چھنوں میاں دونوں حیرت سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے تھے۔ اور تو اور باقر بھائی کی بے نیازی میں بھی فرق آ چلا تھا۔ علی ریاض پھر بولا۔

’’گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز پاس آتی گئی۔ بس سمجھو کہ سارا امام باڑہ گونجنے لگا۔ میر انیس کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سفید گھوڑا ہے۔ اس پہ ایک بزرگ سوار ہیں۔ چہرے پہ سیاہ نقاب پڑی ہوئی، کمر میں تلوار۔ میر انیس کے برابر آئے اور ان کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولے کہ انیس تو میری اولاد ہے۔ دبیر میرا عاشق ہے، اس کا دل ٹوٹ جاتا۔ میر انیس کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ آنکھ کھلی تو نہ گھوڑا نہ گھوڑا سوار۔ تڑکا نکل آیا تھا۔ مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔‘‘

علی ریاض کی داستان ختم ہو چکی تھی۔ تجمل اور چھنوں میاں ایک ڈیڑھ منٹ تک علی ریاض کو تکتے رہے، پھر ان کی نگاہیں باقر بھائی پہ جم گئیں۔ باقر بھائی نے اک ذرا لاپرواہی سے کھنکار کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس داستان سے کچھ ایسے زیادہ متاثر نہیں ہیں۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگے۔

’’مگر اس روایت سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ انیس خود مرثیہ لکھتے تھے۔‘‘

’’مگر صاحب......! باقر بھائی اب قینچی کے اشارے کے بغیر چل رہے تھے۔

’’انیس کی شاعری واقعی انسانی کلام نہیں ہے معجزہ ہے۔‘‘ باقر بھائی چند لمحوں کے لیے بالکل

خاموش رہے اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے۔

گودی ہے کبھی ماں کی، کبھی قبر کی آغوش
سرگرمِ سخن ہے کبھی انسان، کبھی خاموش
گل پیرہن اکثر نظر آئے ہیں کفن پوش
گہہ سخت ہے اور گاہ جنازہ بہ سر دوش

باقر بھائی اک ذرا رکے۔ ان کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔ ''ہا کیا شعر ہے۔''

اک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مسن کو
شب کو تو چھپر کھٹ میں ہیں تابوت میں دن کو

باقر بھائی چپ ہو گئے۔ اب وہ پھر بت بن گئے تھے۔ علی ریاض، تجمل اور چھنوں میاں پہ بھی سکتہ چھا گیا تھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ آس پاس کے نیم اور املی کے درختوں میں دھیما دھیما شور ضرور برپا تھا۔ ہوا بہت تیز تو نہیں تھی۔ اسے موسم کا اثر کہیے کہ ہوا کا کوئی جھونکا اگر دبے پاؤں بھی آتا تو زرد پتوں کو بہانہ مل جاتا اور ٹہنیوں سے بچھڑ کر فضا میں تیرنے لگتے۔ بہتی ہوئی ریت کے ریلے میں نیم کے بہت سے ننھے ننھے زرد پتے بھی آ گئے تھے اور قبر پہ بڑے قرینے سے بچھ گئے تھے۔

اس نیم بیدار نیم خوابیدہ فضا میں نیم کے درختوں سے لے کر کربلا کی دیواروں کی منڈیروں تک ہر چیز کچھ اجڑی اجڑی سے نظر آ رہی تھی اور علی ریاض، تجمل، چھنوں میاں گم متھان بنے بیٹھے تھے اور باقر بھائی پر مراقبہ کی کیفیت طاری تھی۔

آخر چھنوں میاں نے اس سکوت کو توڑا۔ انہوں نے بڑے مرے ہوئے انداز میں انگڑائی لی۔

''بھئی دھوپ میں چٹخی آ گئی۔ یہاں سے اٹھو۔''

چھنوں میاں کھڑے ہوئے۔ دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چھنوں میاں نے اس سلسلے میں مشورے یا اطلاع کی ضرورت نہیں سمجھی۔ شاید نادانستہ طور پر ان کے قدم بیریوں کی طرف اٹھ گئے تھے۔ یہ بیریاں اس سال اللہ دیے نے لے رکھی تھیں۔ اس نے اس برگزیدہ قافلہ کو بیریوں کی طرف آتے دیکھا تو بے تحاشا لپکا ہوا آیا۔ قریب پہنچ کر اس نے چھوٹتے ہی سلام کیا۔ ''میاں سلام۔''

''سلام!'' صرف چھنوں میاں نے سلام کا جواب دینا ضروری سمجھا۔

بیریوں میں داخل ہوتے ہوئے چھنوں میاں کہنے لگے۔ ''صاب! موسم اب بدل ہی گیا۔ دھوپ میں اچھی خاصی تیزی آ گئی ہے۔''

''ہاں!'' تجمل بولا۔ ''جاڑے تو اب گئے ہی سمجھو۔ میں ہولی کے انتظار میں ہوں۔ ہولی جلی اور



میں نے باہر سونا شروع کیا۔''

چھنوں میاں اللہ دیے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ابے اللہ دیے کب جل رہی ہے ہولی؟''

''اگلے شکر کو جل جاوے گی جی۔ بس چھنوں میاں بیر بھی اگلے شکر تک کے ہیں۔ ہولی کے بعد ان میں کنڈار پڑ جاوے گی۔'' پھر ذرا رک کر بولا۔ ''میاں بیر کھا لو۔''

چھنوں میاں بیزار ہو کر بولے۔

''میرے یار! دم تو لینے دے۔''

اللہ دیا چپ ہو گیا۔ اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی اور پیچھے تجمل کے برابر برابر ہو لیا۔ کچھ دیر وہ خاموش چلتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''تجمل میاں! کتنی دیر ہے دفن ہونے میں؟''

''آدھ گھنٹے سے کم کیا لگے گا۔''

اللہ دیا خاموش چلتا رہا پھر ذرا ہچکچا کر بولا۔

''تجمل میاں جو ہونی ہووے ہے وے ہو کے ہی رہووے ہے۔ میرا ماتھا وسی وخت ٹھنکا تھا۔ میں نے ہاشم میاں کو منع بھی کیا پر ونہوں نے میری سنی نہیں۔''

علی ریاض چپ چاپ پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ان فقروں پر ان کے کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے چال تیز کر دی اور پاس آ کر بولے۔ ''کیا بات؟''

''اجی میں دس روز اکے شکار کی بات کر رہا ہوں۔'' اللہ دیے کی آواز اب ذرا بلند ہو گئی تھی۔

''چھنوں میاں تو ساتھ تھا۔ پوچھ لو میں نے منع کیا تھا یا نہیں۔ سالا نیل کنٹھ رستہ کاٹ گیا۔ میں نے کہا کہ ہاشم میاں لوٹ چل۔ پھر ونہوں نے مجھے ڈپٹ دیا۔ جب ہرنی اٹھی تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔'' اللہ دیا چپ ہوا اور جب وہ پھر بولا تو اس کی آواز نے تقریباً سرگوشی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

''اجی دس کے ہرن کو پچھلے مہینے ہاشم میاں نے مارا تھا۔ میرا دل اندر سے یو کیوے کہ اللہ دیے آج کچھ ہووے گا۔ میں نے کہا کہ ہاشم میاں گولی مت چلاؤ۔ پر جی ونہوں نے مجھے پھر جھڑک دیا۔''

اللہ دیا چپ ہو گیا۔ بیریوں کے پتے خاموش تھے، ہوا شاید بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ صرف قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اللہ دیے کی جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سب لوگ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اللہ دیے نے حقہ بھی تازہ کر کے رکھ دیا تھا۔ چھنوں میاں نے دو گھونٹ خاموشی سے لیے۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگے۔

''بھئی اب کچھ ہی کہہ لو مگر ہم تو بچپن سے شکار کھیلتے آ رہے ہیں۔ ہم نے تو کبھی شگن وگن کی پروا نہیں کی۔''

علی ریاض بولے۔ ’’بھائی یہ نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ آج ہم کہتے ہیں کہ صاحب بڑے بوڑھے لوگ بڑے دقیانوسی تھے، تو ہم پرست تھے مگر صاحب ان کا کہا ہوا آج بھی پتھر کی لکیر ہے۔‘‘ تجمل نے بے ساختہ ٹکڑا لگایا۔ ’’یہ واقعہ ہے۔‘‘

علی ریاض کی بات جاندار تھی۔ چھنوں میاں کو مجبوراً باقر بھائی سے رجوع کرنا پڑا

’’باقر بھائی آپ کا کیا خیال ہے؟‘‘ باقر بھائی پھر اپنے اسی مذبذب سے لہجے میں بولے۔

’’اللہ بہتر جانتا ہے کیا بھید ہے۔ ویسے ہم نے بہت سی رسمیں ہندوؤں سے لی ہیں۔ اسلام تو شگون وگون کا قائل ہے ہی نہیں۔‘‘

چھنوں میاں کی بات کی تائید ہوئی تھی۔ پھر بھی انہوں اس جواب پہ کچھ بے اطمینانی سی محسوس کی۔ علی ریاض چند لمحوں تک بالکل گم سم رہا پھر بڑبڑانے لگا۔

’’اس کے بھید وہی جانے۔ عجب طلسمات ہے یہ دنیا۔‘‘ باقر بھائی کی نیت جواب دینے کی نہیں تھی بس یونہی بیٹھے بیٹھے کہنے لگے۔

’’میاں ہم تو یہ جانتے ہیں کہ تقدیر میں جو لکھ گیا وہ مٹ نہیں سکتا۔‘‘

باقر بھائی پھر کسی دوسری دنیا میں جا پہنچے، علی ریاض، تجمل اور چھنوں میاں گم متھان بنے بیٹھے تھے۔ ہوا کا تنفس بہت دھیما ہو گیا تھا مگر بیریوں کے پتوں میں ایک دبا دبا سا شور تھا۔ کچھ ایسا شور کہ بچے چوری چھپے کچھ کتر کتر کر کھا رہے ہیں۔ اللہ دیے نے جلدی سے گوپھیا اٹھائی اور اس میں اینٹ رکھ کر آگے چلا بیریوں کے بیچوں بیچ۔ درختوں کے گھنے سائے میں پہنچ کر اس نے گوپیا گھمائی اور ساتھ میں حلق سے للکارنے کی آواز بھی نکالی۔ بیریوں کے پتوں میں یکایک ایک ہنگامہ پیدا ہوا اور طوطوں کی ایک ڈار چیختی چلاتی تیزی سے پتوں کی تہہ سے اٹھی اور فضا میں ایک الٹی سیدھی سبز دھاری بن کر پھیل گئی۔ گوپیا نے دوہرا طلسم پیدا کیا۔ اس کے اشارے سے سبز طوطے آسمان کی طرف اٹھے اور سبز سرخ بیر زمین پہ گرے۔ اللہ دیے نے سرخ سرخ بیریوں سے گود بھری اور اسے مہمانوں کے سامنے جا کر خالی کر دیا۔ کہنے لگا۔

’’میاں پونڈا بیر ہے پکے پکے بین کے لایا ہوں۔ ذرا یوں چکھ کے دیکھو۔‘‘

باقر بھائی نے کسی قسم کا اظہارِ خیال نہیں کیا۔ ہاں علی ریاض نے ان کی کھٹ مٹھے ہونے کی تعریف کی۔ چھنوں میاں کا خیال تھا اگر پسا ہوا نمک ہوتا تو لطف آ جاتا۔ تجمل بیر کھاتے کھاتے پوچھنے لگا۔

’’ابے اللہ دیے! بیریوں سے تو تو نے اچھا کما لیا ہوگا؟‘‘

اللہ دیا بڑے افسردہ سے لہجے میں بولا۔

’’اجی تجمل میاں! ان بیروں سے کیا بینک لگے گی۔ اب کی برس بڑا گھاٹا آیا ہے۔ آموں کی فصل



سوکھی نکل گئی۔ ساری رقم ڈوب گئی۔ سنگھاڑوں کی بیل لی تھی، دسے جونک لگ گئی۔ تجمل میاں بس اپنی تو بدھیا بیٹھ گئی۔‘‘ سنگھاڑوں کی بیل سے اللہ دیا کا ذہن کسی اور طرف منتقل ہو گیا۔ اس کا رخ چھنوں میاں کی طرف ہو گیا۔

’’اجی چھنوں میاں! وے پوکھر تھی نہیں اپنی دس پہ آج کل مرغابی بہت گر رئی اے۔‘‘

چھنوں میاں چونکے۔

’’اچھا!‘‘

’’ہاں میاں!‘‘

’’دیکھ لیں کسی دن۔‘‘

اللہ دیا بولا۔

’’تو چھنوں میاں، اس سالے جانور کا بھروسہ نہیں اے۔ بس چلنا ہے تو جلدی چلے چلو۔ کسی دن پوہ پھٹنے سے پہلے تاروں کی چھاؤں میں چلو۔ تڑکے تڑکے گھر پہ آن لگیں گے۔‘‘

چھنوں میاں جواب دینے ہی والے تھے کہ علی ریاض بیچ میں بول اٹھا۔ اس کی آنکھیں دور قبرستان کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا۔

’’یار لوگ تو واپس جا رہے ہیں۔ حد ہو گئی، ہم یہی بیٹھے رہ گئے۔‘‘

چھنوں میاں، علی ریاض، تجمل، باقر بھائی چاروں اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیریوں سے باہر نکلتے ہوئے اللہ دیے نے پھر چھنوں میاں کو ٹوکا۔

’’تو چھنوں میاں کب چل رئے او؟‘‘

چھنوں میاں دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے بولے۔

’’کل؟ کل نہیں پرسوں نتیجہ ہے۔ ہاں ترسوں آ جائیو۔ مگر دن چڑھے سے پہلے پہلے واپس آنا ہے۔‘‘

اللہ دیا گرما کر بولا۔

’’دن چڑھے؟ کیا کہہ رئے او چھنوں میاں۔ اجی۔ فجر کی نماز مسجد میں آ کے پڑھیں گے۔‘‘

◄◄ ● ►►

نام کتاب : تقلید سے پرے (فکشن کی تنقید)
مصنف : ابوبکر عباد
قیمت : ۲۰۰؍روپے
ملنے کا پتہ : بک کارپوریشن، دہلی

نام کتاب: نہ یہ بستی ہماری نہ وہ صحرا ہمارا
مصنف : عالم خورشید
قیمت : ۳۰۰؍روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، دہلی

## ● عتیق رحمٰن

# تحفہ

شیطان سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں مسجد الحرام سے باہر نکل رہا تھا۔ مجھے اس وقت وہ ایک بدصورت بڈھے کے روپ میں دکھائی دیا۔ گول، کالا بھجنگ، جیسے کسی گٹر کا ڈھکن کھلا رہ گیا ہو۔ منہ کے گرداگرد گندے مٹیالے بال۔ جیسے گٹر اُبل بھی چکا ہو۔ اس کے ایک کاندھے پر عمروعیار جیسی زنبیل تھی۔ اس کے وزن سے وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ میں طواف کے بعد تھکا ہوا تھا لیکن مسرور اور مطمئن تھا۔ وہ میری طرف بڑھا تو میں رک گیا۔

''شیطان ہونا؟'' میں نے پُرتجسس آواز میں پوچھا۔

''آج کیسے پہچان لیا؟'' اس کی آواز میں حیرت تھی۔ پھر پیلے میلے چیکٹ دانت دکھا کر ہنسنے لگا۔

''ہاں یاد آیا۔ اب تو تم ایک نیک روح ہو۔'' میں چپ رہا تو بولا۔

''خیر ادھر آؤ۔ کچھ کہنا ہے تم سے۔''

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ بڑی مشکل سے زنبیل سنبھالے ہوئے تھا۔

''یہ بوجھ میں اٹھالوں؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''اٹھاتے رہنا......ابھی رہنے دو۔'' وہ ہانپتا ہوا بولا۔

ایک عمارت کے سائے میں رک کر اس نے زنبیل زمین پر رکھی پھر ایک بازو سے ماتھے پر اترا ہوا پسینہ صاف کرنے لگا۔

''پھُرر......'' اس نے ہونٹ تھرتھرا کر کہا۔ ''اتنی گرمی۔ اللہ کی پناہ!''

''اللہ کی؟'' میں نے بھنوئیں اُچکائیں اور خود بھی اُچک کر ایک تھڑے پر بیٹھ گیا۔

شیطان نے پھر پیلے دانت دکھا دیئے۔ ''غلطی سے کہہ گیا۔''

''اوہ ہاں۔ غلطی بھی تو شیطان سے ہی ہوتی ہے نا۔'' میں نے محاورے کی ٹانگ توڑ کر اسے کچھ یاد کرایا۔



''وہ بڑا شیطان تھا۔ میں معمولی سا چیلا ہوں بس۔'' اس نے بُرا مانے بغیر کہا۔

''خیر! مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔''

''تم سے کام نہیں پڑا......تمہارے کام آنا چاہتا ہوں۔''

''واہ جی واہ......کیسے؟''

''میرے پاس تمہارے لیے ایک کارآمد تحفہ ہے۔'' وہ زنبیل کے منہ پر بندھی ڈوری کھولنے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ زنبیل کے اندر ڈالے اور موم میں لپٹا ہوا ایک بھاری بھرکم پارسل باہر نکال لیا۔

میں آگے جھک کر زنبیل کے اندر جھانکنے لگا تو اس نے فوراً پاؤں سے اسے پرے کھسکاتے ہوئے پارسل میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''یہ ہے کیا؟'' میں نے پارسل نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔ خاصا وزنی تھا۔ دس بارہ کلو سے کیا ہی کم ہوگا۔

''یہ ہوور بورڈ ہے......الیکٹرک سکوٹر بھی کہتے ہیں اسے۔''

''ہوور بورڈ''۔ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''وہی فولادی تختہ جس کے نیچے پہیئے لگے ہوتے ہیں اور جس پر چڑھ کر لڑکے بالے فرش پر اسکیٹنگ کرتے نظر آتے ہیں؟''

''ہاں وہی۔ بیٹری سے چلتا ہے۔ دس بارہ گھنٹے تک مزے سے چلاؤ، پھر چارج کرلو۔''

''میں اسے اپنے ساتھ شارجہ تو لے جاؤں گا لیکن قراۃ العین تو ابھی چھوٹی ہے۔ چار پانچ برس کی اور میری دوسری بیٹی لیزا۔ وہ تو اور بھی کم عمر ہے۔ اسے چلائے گا کون؟''

''یہ تمہارے اپنے لیے ہے۔ رکھ لو۔ یہاں عمرے پر کام آئے گا۔''

میں اتنی دیر میں پارسل کے اوپر سے موم جامہ اتار چکا تھا۔ اندر اتنا ہی بڑا گتے کا ایک ڈبہ تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ واقعی ہوور بورڈ ہی تھا۔ پلاسٹک کے دو بڑے پہیئے اور ان کے اوپر میٹل کی لمبی سی پلیٹ۔ کروم شدہ۔ چمکدار رنگ سورج کی روشنی میں جگر جگر کر رہا تھا۔

''خوبصورت تو بہت ہے۔'' میں بس یہی کہہ سکا۔

''یہ تمہارا عمرہ آسان کردے گا۔'' اس نے پھر دانت دکھائے۔

مجھے اس بار وہ پہلے سے کم میلے دکھائی دیئے۔

'لیکن تم تو شیطان ہو......پھر......پھر......''

اس نے منہ بند کیا۔ پہلے اپنا۔ پھر زنبیل کا......اس کے بعد چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کر کے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ اب میں شیطان نہیں رہا۔ بدل چکا ہوں۔''

''آہا......!''

''میں اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لیے ہی تو نیکی کے کام میں تمہاری مدد کر رہا ہوں۔''

''بہت اچھے! بڑے شیطان کو پتا چلے گا تو وہ کیا سوچے گا۔''

''چل جائے پتا۔'' وہ بےفکری سے بولا۔''اس نے بھی تو اپنے باس سے بغاوت کی تھی۔''

''اور باس نے اسے شیطان بنا دیا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''میں پہلے ہی شیطان ہوں۔'' اس نے نکتہ سنجی کی۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے باتوں میں اس سے ہار مانتے ہوئے کہا۔''لیکن یہ تبدیلی آئی کیسے؟''

''کوئی لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے۔ میری ڈیوٹی وہاں اندر لوگوں کو اپنی راہ پر لانے پر لگی تھی۔'' اس نے مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''ڈیوٹی تو لگ گئی، لیکن ظاہر ہے میں کسی انسان کے اندر داخل ہوئے بنا کیسے اس مسجد کے اندر جا سکتا تھا۔ کئی دن باہر دروازے پر ہی کھڑا رہا اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک دن تم نظر آ گئے اور میں تمہارے ذریعے مسجد کے اندر پہنچ گیا۔''

''کیا!''

میں بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے اندر کا پنجابی مرد ڈانگ پکڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

''فِٹے منہ تیرا بے غیرتا۔ لعنت تیری جمن آلی تے......خبیث اِنسا......شیطان!''

''ارے ارے سنو تو۔'' اس نے ہاتھ اوپر کر کے کہا جیسے خود کو بچا رہا ہو۔"

''بکو۔'' میں نے ڈانگ مارنے کے انداز میں تانے رکھی۔

''تب تک میں شیطان تھا لیکن یہ تم ہی تھے جس کی وجہ سے میری کایا پلٹ گئی۔''

''وہ کیسے۔'' میں نے ڈانگ پر گرفت ذرا ڈھیلی کرتے ہوئے پوچھا۔

''جب تم اندر جا رہے تھے تو دنیا دار تھے۔ سو میں تمہارے سہارے اندر چلا گیا اور تم مجھے پہچان تک نہ سکے۔ خانہ خدا میں بیٹھ کر تم پر جو رقت طاری ہوئی اور جس جس طرح تم نے رو دھو کر اپنا من صاف کرا لیا وہ میرے لیے چشم کشا تھا۔ تم نے اپنے سارے گناہ میرے کھاتے میں ڈلوا کر اپنی خلاصی کروالی۔ خود نہا دھو کر پوتر ہو گئے اور سارا کیچڑ میرے منہ پر مل دیا۔ مجھ سے بچنے کی دعائیں الگ مانگتے رہے۔ سو جب تمہاری دعا قبول ہو گئی تو آنے والا آیا اور مجھے یک بینی و دو گوش......کان سے پکڑ کر دوبارہ باہر پھینک دیا گیا۔''

شیطان نے جس انداز میں بات کی تھی اس پر میں مسکرا دیا۔ پنجابی مرد کچھ دیر تذبذب کی سی



کیفیت میں کبھی مجھے اور کبھی شیطان کو دیکھتا رہا پھر اس نے کندھے اچکائے اور بڑبڑاتا ہوا ڈانگ سمیت دوبارہ منجے پر جا بیٹھا۔

''تب سے میں دروازے پر ہی کھڑا رہا۔'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔''لیکن اب مجھ میں کچھ تبدیلی آ چکی تھی۔ میں خود کو ساری برائیوں کی جڑ سمجھنے لگا تھا۔ خود سے کراہت ہونے لگی تھی۔''

اس نے منہ کے اندر ہی تھوک کا ایک گولہ سا بنایا اور، شاید اپنی بات کے ثبوت میں، کراہت سے باہر اگل دیا۔ چھینٹے میرے پیروں پر بھی پڑے۔ مجھے کچھ ایسی کراہت محسوس نہیں ہوئی۔

''اچھا پھر؟''

''پھر کیا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ میری کایا پلٹ گئی۔ میں باغی ہو گیا۔ سوچا کس طرح اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کروں۔ میں شیطان ہوں خود تو کچھ ثواب کمانے سے رہا لیکن کم از کم میں کسی انسان کو ثواب کمانے میں مدد تو دے ہی سکتا تھا۔ پھر جب دیکھا کہ تم رات دن طواف پر طواف کیے جا رہے ہو، تھک کر چور ہو جاتے ہو لیکن پھر بھی باز نہیں آتے تو میرے ذہن میں ترکیب آ گئی۔ میں کل رات ایک بڑی دکان پر گیا اور وہاں سے یہ ہوور بورڈ اُٹھا......خرید کر......لے آیا......بس یہ ہے کُل کہانی۔''

''ہونہہ!'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔''اس ہوور بورڈ کا میرے عمرے سے کیا تعلق؟''

''وہاں جا کر دیکھنا۔'' اس نے مسجد کی بالائی منزل کی طرف اشارہ کیا۔''وہاں تمہیں بے شمار لوگ وہیل چیئرز پر طواف کرتے ملیں گے۔ تم بھی اس سکوٹر پر وہیں طواف کرو گے۔ پہلے جتنی دیر میں تم خانہ خدا کا ایک چکر لگاتے تھے اب اتنی دیر میں دس چکر لگیں گے۔ وہ بھی بغیر تھکے ہوئے یعنی ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ بھی چوکھا آوے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا اس کی اجازت ہے وہاں؟''

میں سکیورٹی والوں سے پوچھ چکا ہوں۔ اجازت ہے۔''

''ہونہہ!'' میں نے پھر ہنکارا بھرا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔''مجھے افسوس ہے میں نے تمہیں غلط سمجھا۔''

اس کی آواز میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا۔ بڑے ہی رقت آمیز انداز میں بولا۔''ہمارے راستے جدا جدا ہو سکتے ہیں لیکن اب ہماری منزل ایک ہی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مزید کچھ کہے بنا زنبیل اٹھا کر مسجد کے دروازے کی طرف چل پڑا۔

میرے شاگرد مجھے استاد اور عالم فاضل سمجھتے ہیں۔ آپ میری جہالت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ میں شیطان کا دیا ہوا تحفہ دیکھنے میں اس قدر مگن تھا کہ اس کے آخری الفاظ غور سے نہ سن سکا اور اگر

سنے بھی تو ان کا مطلب نہیں سمجھا۔

پھر جب سمجھ آئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

رات کو ہوٹل کے کمرے میں آتے ہی میں نے ہوور بورڈ پر سواری کی مشق شروع کر دی۔ اس کی نچلی طرف ایک بٹن لگا تھا۔ اسے دبانے سے نیلگوں روشنی جل پڑتی۔ اصولاً تو یہ اس لیے تھی کہ اگر بندہ رات کو ہوور بورڈ پر نکلے تو یہ روشنی سامنے راستہ دکھائے گی لیکن یہ اس قدر مدھم تھی کہ مجھے لگا اندھیرے میں اس روشنی کو دیکھنے کے لیے بھی مجھے الگ سے کسی روشنی کی ضرورت پڑے گی۔

ایک دو بار گرنے کے بعد مجھے سمجھ آ گئی کہ توازن کیسے برقرار رکھنا ہے۔ یہ ایجاد جائرو سینسر کے اصول پر کام کرتی تھی۔ میں دیوار کے سہارے اس پر کھڑا ہو جاتا پھر ذرا آگے جھکتا تو یہ آگے کو حرکت شروع کر دیتا۔ روکنے کے لیے جسم کو پیچھے کی طرف جھکانا پڑتا تھا۔ اچھی طرح مشق کر لینے کے بعد میں نے اسے دوبارہ چارجنگ پر لگا دیا اور اگلے دن کے لئے نیک ارادے باندھ کر سو گیا۔

اگلے روز ہوور بورڈ پر طواف کرنے کا آغاز ہوا۔ ابتدا کافی بہتر تھی۔ میری رات کی مشق بہت کام آئی۔ میرے لیے جو اصل مشکل یا الجھن تھی وہ جسمانی سے زیادہ نفسیاتی تھی۔ میرے خیال میں یہ نوجوانوں کا کھلونا تھا اور میں نے صرف ہپی نما لڑکوں کو ہی شارجہ کے بحیرہ کارنش پر اس طرح کے سکوٹروں کو دوڑاتے اور پھر راستے کے اطراف بیٹھی لڑکیوں کی گود میں جا گرتے دیکھا تھا۔ میری عمر میں یہ کم از کم مجھے تو بہت عجیب لگ رہا تھا۔ یوں تو وہاں وہیل چیئرز پر بہت لوگ طواف کر رہے تھے لیکن اس طرح کا سکوٹر ایک آدھ ہی نظر آیا۔ میری اس وقت وہی کیفیت تھی جو پطرس بخاری کی اپنی مرحومہ سائیکل پر سواری کے وقت ہو گی۔ میں جب ہٹو بچو کی آواز لگاتا، چیونٹی کی رفتار سے چلتا ہوا اپنی آمد کا اعلان کرتا تو لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھنا شروع کر دیتے۔ کچھ تو زیر لب مسکرا بھی دیتے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ اس محاورے کی دم میں خدا جانے کیسا ڈنک بھرا ہے کہ ذہن میں آتے ہی میرے رخسار کانوں تک سرخ ہو گئے۔ پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ میں نے ایک بازو اوپر اٹھایا اور چاہا کہ ماتھا صاف کر لوں۔ ساتھ ہی توازن بگڑا اور میں رکتے رکتے بھی ایک بڑھیا کی وہیل چیئر سے جا ٹکرایا۔ اس کے بعد کافی دیر تک چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

میں ایک کونے میں ڈبکا بیٹھا رہا حتیٰ کہ وہ سب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے جنہوں نے فال آف دی رومن ایمپائر کا وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میرے پاس سے گذرتے ہوئے وہ منہ سے تو کچھ نہ کہتے لیکن ان کی چمکتی آنکھیں سب بتا دیتیں۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے حلقہ ارباب ذوق میں اپنی شاعری تنقید کے لیے پیش کر دی ہو اور اب مجھے ضوابط کے مطابق چپ ہو کر بیٹھے رہنا ہے، جو بھی کہنا ہے وہ



سامنے بیٹھے تنقید نگاروں نے کہنا ہے۔ حلقہ میں نقادوں کی عالمانہ گفتگو سہنے کی مشق اس روز بہت کام آئی اور میں ایک ہی دن میں اس سلوک کا عادی ہو گیا۔ چنانچہ اگلے ہی دن میں بڑے سکون سے اپنے طواف کے چکر مکمل کر رہا تھا۔ جو لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے تھے اب میں ان کے پاس سے گولی کی سی رفتار سے گزر جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ طنزیہ نظروں کی جگہ توصیفی نگاہوں نے لے لی۔ اب نہ صرف لوگ مجھے دیکھ کر محظوظ ہوتے بلکہ انتظار کرتے کہ کب میں اپنا چکر مکمل کر کے دوبارہ ان کو اوورٹیک کروں گا۔ مجھے بھی اب اس کام میں مزا آنے لگا تھا۔ کہاں وہ وقت جب میں ایک دن میں مشکل سے ایک آدھ طواف کرتا اور اس کے بعد رات کو اپنے پاؤں نیم گرم پانی میں رکھ کر سہلایا کرتا اور کہاں یہ دن کہ میں خانہ خدا کا چکر پر چکر لگا رہا ہوتا اور تھکاوٹ کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ثواب کی ان گنت گٹھریاں تھیں جو میں اپنے سر پر لاد کر یہاں سے واپس لے جانے والا تھا۔

جب اس مقدس شہر میں میرے قیام کے بس آخری دو دن باقی رہ گئے اور میرے ٹریول ایجنٹ نے فون کر کے مجھے ٹکٹ کنفرم ہونے کی اطلاع دے دی تو میں نے سوچا مجھے شارجہ فون کر کے صائمہ کو اور بچوں کو اپنی خیریت سے مطلع کرنا چاہیئے۔ ایک سوچ تو یہ آئی کہ جتنا وقت میں فون کرنے پر برباد کروں گا اتنی دیر میں ایک آدھ طواف اور ہو جائے گا۔ یعنی ثواب کا ایک اور گٹھر۔ پھر خیال آیا کہ بات ہے تو نیکی کی اور میری نیت بھی نیک ہے لیکن اب اتنی بھی کیا خودغرضی۔ جنت کے لیے جتنا ثواب چاہیے تھا وہ تو میں ہوور بورڈ کی بدولت کب کا کما چکا تھا۔ اب تو ساری کمائی بونس میں تھی۔ ثواب کی دولت پر باقی مسلمانوں کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا کہ میرا۔ اپنے ارد گرد جمع گنہگار مسلمانوں کا خیال اگر میں نہ رکھوں گا تو اور کون رکھے گا۔

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

یہ سب سوچ کر میں نے دل کو تسلی دی، حسرت بھری نظروں سے ایک بار ہوور بورڈ کو اور پھر باہر خانہ خدا کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد جی کڑا کر کے موبائل اٹھایا اور گھر کا نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف صائمہ ہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ’’کیسی ہو؟‘‘

صائمہ بولی۔ ’’شکر ہے اللہ کا۔ آپ بتائیں نا کیسے ہیں اور عمرہ کیسا جا رہا ہے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’تمہیں یہ جان کر از حد خوشی ہوگی کہ تم نے جس مقصد سے مجھے یہاں بھیجا تھا وہ بخیر وخوبی پورا ہو گیا، الحمدُ للہ۔‘‘

’’تفصیل سے بتائیں نا پلیز۔‘‘

’’میں نے یہاں زیادہ سے زیادہ عبادت کی ہے۔ پندرہ دن میں اتنا ثواب کما لیا ہے کہ ہماری دو

نسلیں بھی اس کو گھر بیٹھ کر خرچ کریں تو کچھ بچ رہے گا۔ ایک ایک دن میں خانہ خدا کے بیسیوں چکر لگائے ہیں۔

صائمہ بولی۔ ''ناممکن!''

میں نے کہا۔ ''تمہیں کیا لگتا ہے میں یہاں بیٹھ کر اب تم سے جھوٹ بولوں گا۔''

''لیکن کیسے؟''

''یہ سب شیط......این......ایک نیک بندے کے سبب ممکن ہوا۔''

اس کے بعد میں نے اسے تفصیل سے ہوور بورڈ پر اپنے طوافوں کے بارے بتایا۔ شیطان کا ذکر احتیاطاً گول کر گیا۔

وہ سن کر چپ ہوگئی۔

''کیوں پھر؟ ہوگئی نا جیلس......''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''پھر چپ کیوں ہو؟''

''کچھ سوچ رہی تھی۔''

''یہی سوچ رہی تھی نا کہ میں جنت میں جاتے ہوئے تمہیں بھول تو نہیں جاؤں گا۔ فکر نہ کرو میں حوروں والا آپشن استعمال نہیں کروں گا۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے، ہم نے ساری عمر نبھائی اپنی پہلی مجبوری۔''

''بکواس نہ کریں، سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہوسکتا ہے جو آپ کو ملا تھا، جس نے وہ سکوٹر آپ کو دیا۔''

''سچ بتا دوں؟''

''بتائیں۔''

''وہ کوئی نیک بندہ نہیں تھا۔ شیطان تھا۔''

پھر میں نے اسے ساری تفصیل بتائی۔

''آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''

''کیوں کہ تم عورتیں کٹ حجتی بہت کرتی ہو۔ اب یہی دیکھ لو جتنی دیر بات تمہیں سمجھانے میں لگ گئی اتنی دیر میں میں نے ایک دو چکر لگا لینے تھے۔''

''آپ چکر ہی لگاتے ہیں یا طواف بھی کیا۔'' اس نے نئی کہی۔

''اف......اف......!! جی چاہتا ہے اپنے بال نوچ لوں۔''

''نوچیں گے تو تب نا جب بال ہوں گے۔''



''اب تم ذاتیات پر اتر آئی ہو۔''

''آپ نے بتایا نہیں۔''

''کیا بتاؤں میں۔ چکر لگا لیے تو ظاہر ہے طواف کر لیا۔ فرق تھوڑا ہی ہے ان میں۔''

''فرق ہے تو سہی۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''او کے، پھر تم ہی بتا دو۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ساتھ ہی گھڑی کی جانب دیکھا۔

''آپ کو کوئی فرق محسوس نہیں ہوا، چکر اور طواف میں۔''

''نہیں تو۔''

''سچ؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔

میں محتاط ہو گیا۔ آگے دلدلی زمین تھی۔

''آپ واپس آجائیں۔'' اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

''واپس آجاؤں!'' میں چلا اٹھا۔ ''اور جو باقی دو دن میں ثواب کما سکتا ہوں اس کا کیا کروں۔ کنویں میں ڈال آؤں سب؟''

''مجھے نہیں پتا، آپ واپس آجائیں یا پھر دو دن کے لیے جدہ چلے جائیں۔ عطیہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوگی۔''

''لیکن......سنو تو۔'' میں نے مسکین سی آواز میں کہا، ''ایک آخری طواف تو کر ہی سکتا ہوں نا میں، طواف وداع سمجھ لو۔''

''ہوں، ٹھیک ہے۔ لیکن ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط؟''

''پہلے قسم کھائیں کہ بات مانیں گے۔''

''تمہاری قسم۔''

''او کے، شرط یہ ہے کہ آپ ایک اور طواف کر لیں......لیکن اس بار آپ سکوٹر استعمال نہیں کریں گے۔''

میں نے فون بند کر دیا۔

میرا ایک ہاتھ بے اختیار پاؤں کو سہلانے لگا تھا۔

اس دو پہر گرمی پہلے سے زیادہ تھی۔ مسجد میں معمول سے کچھ کم لوگ تھے۔ میں نے سوچا خانہ خدا کو الوداع کہنے سے پہلے ایک نظر مسجد پر ڈال لوں۔ بعد میں جانے یہ خوش کن نظارے کب نصیب ہوں۔

زیادہ تر لوگ نوافل ادا کر رہے تھے۔ایک کونے میں ایک پاکیزہ صورت اور سفید سُچی ریش والے درویش کے گرد کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ان کو کچھ درس دے رہا تھا۔ میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا۔ درویش جذب و مستی کے تمام مراحل پار کرنے کے علاوہ دنیوی علوم پر بھی حاوی معلوم ہوتا تھا۔اس وقت شائد وہ فزکس کا کوئی اصول بیان کر رہا تھا۔وہ کہہ رہا تھا۔

''ہاں تو میں نے پوچھا تھا کہ پانی میں تیرتے ہوئے آپ گوگلز کیوں پہنتے ہیں۔'' کسی نے جواب دیا تا کہ پانی آنکھوں میں نہ چلا جائے۔کوئی دور کی کوڑی لایا کہ اس سے دیکھنے والوں کو پتا چل جاتا ہے کہ بندہ پروفیشنل تیراک ہے اور واقعی تیر ہی رہا ہے ڈوب نہیں رہا۔''

''اصل بات یہ ہے کہ ہم گوگلز اس لیے پہنتے ہیں تا کہ ہمیں پانی کے اندر کی چیزیں زیادہ بہتر نظر آسکیں۔''

''لیکن بزرگو!'' مجھ سے رہا نہ گیا تو میں بول اٹھا۔''گوگلز تو صرف عام سا پلاسٹک ہوتا ہے۔کوئی عینک تو نہیں ہوتی، اس سے بھلا ہمیں کیسے بہتر نظر آئے گا۔''

درویش نے ایک تاسف بھری نظر مجھ سمیت سب پر ڈالی اور پھر گویا ہوا۔

''ایک چیز ہوتی ہے ریفریکٹو انڈیکس۔ یہ کیا ہوتی ہے۔ یہ جا کر انٹرنیٹ پر دیکھنا۔ابھی اتنا سن لو کہ چیز بہتر نظر آنے کے لیے ضروری ہے کہ جب اس سے ٹکرا کر روشنی ہماری آنکھ تک آئے تو راستے میں جو میڈیم، جیسے ہوا یا پانی، ہو اس کا ریفریکٹو انڈیکس ہمارے آنکھ میں موجود پانی کے انڈیکس سے مختلف ہو۔ اب اگر کوئی جسم پانی میں ہو تو اس سے جب روشنی ٹکرا کر ہماری آنکھ تک آئے گی تو راستے میں سمندر یا دریا کے پانی سے گذرے گی۔ پانی اور ہماری آنکھ کا انڈیکس قریب قریب ایک جیسا ہے۔سو وہ چیز ہمیں دھندلی نظر آئے گی۔ جب ہم گوگلز استعمال کرتے ہیں تو ہوا ہماری آنکھ اور گوگلز کے بیچ میں ٹریپ ہو جاتی ہے۔نتیجہ یہ کہ جسم سے آنے والی روشنی آنکھ میں داخل ہونے سے پہلے ہوا سے گزرے گی جس کا انڈیکس آنکھ سے بہت مختلف ہے، پس ہمیں وہ شے بہت واضح ہو کر نظر آئے گی۔''

حاضرین وجد میں آنے لگے تو درویش نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا اور بولا۔

'' کہنے کا مطلب یہ تھا کہ شیطان گناہ کا پُتلا ہے، جب ہم گناہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تو ہمای باطنی آنکھ کا اور شیطان کا انڈیکس بھی ایک ہو جاتا ہے، پھر وہ ہمیں نظر نہیں آتا، نظر آ بھی جائے تو ہم اسے پہچان نہیں پاتے۔''

''سبحان اللہ! سبحان اللہ!!'' کی آوازیں بلند ہوئیں۔ میں وہاں بیٹھا رہا۔ بہت دیر بعد جب درویش کے نہ نہ کرنے کے باوجود حاضرین کے بار بار اصرار پر بیعت لینے کا مرحلہ شروع ہوا تو میں بھی اس



قطار میں شامل تھا۔میری باری آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ اذان شروع ہو گی اور درویش نے اعلان کر دیا کہ باقی لوگوں سے بیعت نماز کے بعد لی جائے گی۔اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، اپنا تھیلا اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور چل پڑا۔

مجھے وہ تھیلا بہت جانا پہچانا نظر آیا۔

اس رات جب ہوٹل میں سب سو گئے اور کھڑکی سے آنے والی ٹریفک کی آواز بھی کم ہو گئی تو میں ہوور بورڈ کو کاندھے پر اٹھایا اور باہر نکل آیا لیکن آج میرا رخ خانہ خدا کی طرف نہیں تھا۔ بہت دیر بعد میں چلتے چلتے اس مقام پر پہنچ گیا جہاں شیطان کا علامتی مجسمہ بنایا گیا ہے اور جہاں حج کے زمانے میں غصے سے بھرے ہوئے حاجی لوگ جی بھر شیطان کو پتھر مارتے ہیں۔اور صلواتیں سناتے ہیں۔میں اتنے غصے کے عالم میں تھا کہ یہ دیکھے بنا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے یا نہیں، میں نے ہوور بورڈ دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر بلند کیا اور تاک کر شیطان کی طرف دے مارا۔

میں مُڑ کر جانے لگا تو مجھے لگا جیسے میرے پیچھے کسی نے دبی دبی آواز میں قہقہہ لگایا ہو۔میں دوبارہ مُڑا اور غور سے شیطان والے احاطے کی طرف دیکھنے لگا۔وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے کچھ سوچا، پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ باہر نکالا۔ یہ میری شارجہ واپسی کا ٹکٹ تھا۔ میں نے اسے پھاڑ کر اس کے کئی پُرزے کیے، پھر ان کو منہ میں ڈال کر چبا چبا کر گول گول شکل دی۔اس کے بعد میں نے انہیں بھی شیطان کے احاطے کی طرف اچھال دیا۔

کاغذ کی یہ کنکریاں کچھ دیر ہوا میں ڈولتی رہیں۔ پھر جانے کہاں سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کنکریاں تڑ تڑ کر کے شیطان کے جسم پر جا لگیں۔

میں تب تک وہاں سے جانے کے لئے مُڑ چکا تھا۔شائد میرا وہم تھا، مجھے اپنے پیچھے کسی کے سسکی بھرنے کی آواز آئی تھی، لیکن میں چلتا رہا۔

جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھ لیا تو پتھر کا ہو کر اسی پہاڑی پر رہ جاؤں گا اور لوگ آئندہ مجھے اٹھا اٹھا کر شیطان پر مارا کریں گے۔

◀◀ ● ▶▶

501.A block. Almajid towers..
Buhaira carnishe near sharjah Hilton hotel.... Sharjah .UAE
Phone No....00971 555 699 170.....
P.Box..... 48196...
Dubai...UAE

## ● عطاء الرحمن خاکی

# کچھ حقیقت، کچھ فسانہ

۱۹۶۴ء کی جون یا جولائی کے گرمی اور حبس آلود دنوں کی بات ہے جب لالوکھیت، لیاقت آباد نہیں ہوا تھا، رام باغ بھی ہنوز رام باغ ہی تھا آرام باغ کا چوغہ نہ پہنا تھا، ان دنوں میں فارغ گھومتا تھا، سارا دن پلنگ پر لیٹ کر ریڈیو پاکستان کی نشریات سنتا رہتا یا پھر اپنے دوست کے ساتھ تاش کی بازی لگا لیتا جو دن ڈھلے چلتی رہتی، شام پڑتی تو کراچی کی سڑکوں پر ہم آوارہ گردی کرنے نکل جاتے تو اس شام بھی ہم لوگ سڑکوں پر مٹر گشتی کرنے نکلے تھے جب دوست کہنے لگا آؤ تمھیں آج کسی سے ملواتے ہیں۔

میں نے پوچھا کون ہیں؟ تو کہنے لگا ایک بزرگ ہیں ان کے بارے میں لوگوں میں عجیب وغریب قسم کی باتیں مشہور ہیں جیسے یہی ایک بات لے لو کہ ان کی اصل عمر ۱۵۰ سال ہے اور ان کے دانت دوبارہ اگنے اور بال واپس کالے ہونا شروع ہو گئے ہیں، یہ سن کر میں تو ہنس پڑا، تو دوست پانسو پچپن کی سگریٹ کو شعلہ دکھاتے ہوئے کہنے لگا کہ ان کی عمر کا تو مجھے بھی صحیح سے اندازہ نہیں پر میرے حساب سے نوے کے پیٹے میں تو ضرور ہوں گے پھر اس نے دو گہرے کش لگائے اور دھوئیں کو ناک سے اگلتے ہوئے کہنے لگا۔

''وہ اپنی گلی کے نکڑ والا بنو حلوائی تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ان کے قبضے میں جن ہیں جس کے ذریعے وہ لوگوں کے کام کر دیتے ہیں، خیر میری واقفیت ان سے کچھ دنوں پہلے ہی ہوئی ہے بہت دلچسپ اور معصوم انسان ہیں، باقی اوپر والا جانے۔''

پہلی ملاقات ہوئی تو دیکھا ایک پتلا دبلے پتلے بانس سی کاٹھی کے ضعیف سے شخص ہیں، چہرے پر گھنی سی سفید ڈاڑھی، کشادہ پیشانی، رنگ سانولا، آنکھیں بڑی بڑی اور ان میں سرخ ڈورے...... بوسیدہ پر صاف ستھرے لان کے سفید کرتے، مخمل کی سفید ٹوپی اور چوکور ڈبوں والی تہہ بند میں لپٹے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ کوئی سائل جا کر ان کے کان میں اپنا مسئلہ بتاتا ہے.. اور وہ اسے ہاتھ کے ہاتھ اپنے سامنے رکھی میز پر ایک پرچی پر کچھ لکھ کر موم جامے میں رکھ کر تعویز دے دیتے ہیں۔ وہ علاقے میں سب کے ''میاں صاب'' تھے۔ کسی کا بچہ بیمار ہو، یا کسی پر آسیب کا سایہ، میاں بیوی میں ناچاقی ہو یا کسی کو نظر لگی ہو وہ ان کے ڈیرے پر



چلے آتا۔ ڈیرہ بھی کیا بھلا دو کمروں کا کچا پکا مکان تھا جس کی دیواروں نے زمانوں پہلے چونے کا سفید پانی چکھا ہوگا.. جدھر ہاتھ پھیرو بھربھری ہو کر ہاتھ میں آ جاوے۔ مانگتے کچھ نہیں کوئی کچھ دے جائے تو لے لیتے ہیں، منع نہیں کرتے اور غریبوں کی اس بستی میں بھلا کون سے حاتم طائی اور نوابین رہتے تھے۔ مڈل کلاس بلکہ لوئر کلاس طبقے کہ لوگ، کوئی سبزی فروش ہے تو گدھا گاڑی چلاتا ہے، کوئی اسٹیشن پر مصالحے والے چنے تو کوئی بھیک مانگ کر گزارہ کرتا ہے۔ غرض بدلے میں کوئی دونی تو کوئی چونی دے کر اپنی راہ لے لیتا۔ جب کمرے میں سوائے ہمارے کوئی اور سائل نہیں رہ گیا تو ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ معذرت چاہی کہ میاں آج سائل زیادہ تھے معاف کرنا۔ جھٹ پٹ اٹھ کر ایک طرف بڑھے اور مٹی کے تیل کے چولہے میں چائے بنانے بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بھاپ اڑاتی چائے مٹی کے پیالوں میں ڈال کر ہمارے سامنے رکھ کر خود بھی بیٹھ گئے۔ میرے دوست نے تعارف کرایا تو بہت محبت سے ملے۔ دیر تک ہاتھ پکڑ کے بیٹھے رہے۔ حال احوال پوچھتے رہے۔ تھوری دیر بعد دوست نے فرمائش کر دی کے میاں صاحب کچھ شعروشاعری ہو جائے تو شرمانے لگے، ''نہیں بھئی میں کہاں کا شاعر''، ضد کی تو اپنے پوپلے منہ سے امیر خسرو کا کلام سنانے لگے۔

توری صورت کے بلہاری نجام
سب سکھین میں چندر میری میلی، دیکھ ہنسیں نرناری
اب کے بہار دچندر میری رنگ دے پیار کھ لے لاج ہماری
صدقہ بابا گنجِ شکر کا، رکھ لے لاج ہماری نجام
قطب فرید مل آئے براتی، خسرو راج دلاری نجام
کوؤ ساس کوؤ نند سے جھگڑے، ہمکو آس تمھاری نجام

ان کی آواز میں بلا کا سوز تھا، اشعار اس لحن سے پڑھ رہے تھے کہ اس وقت کے بڑے بڑے گویے سن لیتے تو اسی وقت مرید ہو جاتے۔ میری فطرت میں تجسس بہت ہے طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ بیٹھا

''میاں صاحب کہاں کے ہیں؟''

''اب تو بس اسی کے ہیں۔'' شہادت کی انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

میرا مطلب کہنے کا یہ تھا کہ آباؤ اجداد، رہنے والے کہاں کے ہیں؟''

''میاں! غوری پٹھان ہیں اور کانپور سے ہیں پر سب خاک ہوئے، بھرے پرے خاندان کے ساتھ چلا تھا، سب رستے میں ہی کٹ مر گئے۔ بس ہوش آیا تو مہاجر کیمپ میں پڑا تھا۔ جاننے والا کوئی نہیں۔

بہت رویا پیٹا پر صبر آ گیا، وقت بھی بڑی ظالم چیز ہے۔ چوٹ جتنی بھی مہلک ہو وقت کا مرہم اسے بھر ہی دیتا ہے۔''

اتنے میں عشاء کا وقت ہوا تو اجازت طلب کی کہ میاں ڈیوٹی کا ٹائم ہو گیا۔ حیران ہو کر پوچھا تو بولے کچھ نہیں، پھر انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ ہم دوستوں نے بھی ان کی ڈیوٹی میں حارج ہونا مناسب نہ جانا اور سلام کر کے اٹھ کھڑے ہوئے ہی تھے کے باہر سے شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو کوئی شرابی تھا جو میاں صاحب کو گالیاں دے رہا ہے۔ میاں صاحب جو ہمارے ساتھ ہی باہر آ گئے تھے اس کے سامنے ایسے شرمندہ سے کھڑے ہو گئے تھے جیسے کوئی مجرم، عدالت میں کسی جج کے سامنے کھڑا ہو۔

تم لوگوں کو لوٹتے...... تے ...... تے ہو۔ بے وقو......و......وف بناتے ہو.. تیری ماں کی...... سالے.....کی اولاد۔''

آؤ دیکھا نہ تاؤ میرے دوست نے اس شرابی کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور میں نے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو میاں صاب نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''جانے دو میاں! نشے میں ہے، ابھی اس کو نہیں پتا کیا کہہ رہا ہے۔'' اتنے میں محلے کے اور لوگ آ گئے تو انھوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ پتا چلا کہ میاں صاب کے ڈیرے سے دو گھر چھوڑ کر رہتا ہے اور میاں صاب سے بہت بیر رکھتا ہے۔ خیر اس منہ ماری والے حادثے سے میری طبیعت بہت بیزار ہوئی۔

پھر بہت دن تک میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی اور میں بھی اس قصے کو بھول بھال اپنے بی اے فائنل کے امتحانوں میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دن امتحانوں کی فکر اور اس کی تیاریوں میں گزر گئے۔ جب امتحانوں سے فراغت حاصل ہوئی تو ایک دن کسی کام سے گھر سے نکلا تھا راستے میں مل گئے۔ ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''میاں! اتنے دن ہو گئے ڈیرے پر نہیں آئے۔'' پھر ضد کرنے لگے ابھی چلو۔ اپنے ہاتھ کی تمہیں اچھی سی چائے پلائیں گے۔ بھلا اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ چائے کا رسیا تو بچپن سے تھا۔ جس کام سے نکلا تھا اس کو بھول بھال انہی کے ساتھ چل پڑا۔ ڈیرے پر پہنچ کر انھوں نے جھٹ پٹ چائے بنا کر میرے سامنے رکھ دی اور دوست کے بارے میں پوچھنے لگے۔

''کدھر ہے آج کل، وہ بھی نہیں آتا۔''

''اس کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا ہے۔ بہت جلدی میں گیا۔''



''ہاں میاں! سرکار کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا، سرکاری حکم ہو تو جانا ہی پڑتا ہے۔ حکمِ حاکم مرگ مفاجات۔''

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ بات یاد آئی جو میں اس دن نہیں پوچھ پایا تھا۔

''میاں صاحب! یہ ڈیوٹی والی بات اس دن ادھوری رہ گئی تھے۔ آپ کو خدمتِ خلق پر کس نے مائل کیا؟''

''برخوردار کیا پوچھتے ہو۔'' کہہ کر خیالوں میں کھو گئے۔ ایسا لگتا تھا بس جسم یہیں ہو اور دماغ نجانے ماضی کی کن تکلیف دہ پرتوں کو کھنگال رہا ہو۔

''اگر آپ کو اس سے تکلیف ہو گی تو رہنے ہی دیں۔''

''اب پوچھ ہی لیے ہو تو بتا دیتا ہوں، پر سمجھ نہیں آ رہا کہاں سے شروع کروں۔ خیر سے ہمارا شجرہ نسب سترہویں پشت پر جا کر غیاث الدین غوری سے جا ملتا ہے۔ میرے دادا گلاب خان فوج میں جمعدار کے عہدے پر تھے۔ ان کا حلیہ تو ٹھیک سے یاد نہیں کیونکہ میری عمر اس وقت پانچ یا چھ برس تھی جب وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے، لیکن جب بھی دادا مرحوم کو سوچتا ہوں تو یاد کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں سے ذہن کے کسی کونے میں ایک گورا اور بھاری بھر کم چہرہ، کھڑا ناک نقشہ، چہرے پر اوپر کی طرف تنی ہوئی مونچھیں، چھوٹے چھوٹے قرینے سے کٹے بال جن پر عموماً بادام کا تیل ملا ہوا ہوتا، ململ کے چھتے دار کرتہ، پائجامہ اور سر پر ترکی ٹوپی، حقے کی نے منہ میں دبائے ایک بزرگ آ جاتے ہیں۔ ابا جان کبھی کبھی سناتے تھے کہ تمہارے دادا مرحوم ۱۸۵۷ء کے غدر میں نانا راؤ کے باغیوں میں شامل ہو گئے تھے۔

سنہ ۱۸۵۵ء میں سرکارِ انگلشیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے کانپور کو الہٰ آباد سے ملانے کے لیے جو ریلوے لائن بچھانی شروع کی تھی، اس منصوبے کو باغیوں نے کچھ ہی دن میں خاک میں ملا دیا تھا۔ پلوں کو بموں سے اڑا دیا کرتے اور پٹریوں کو رات کی تاریکی میں وہ لوگ اکھاڑ کر پھینک دیا کرتے تھے۔ ستم یہ ہوا کے بپھرے ہوئے باغیوں نے جب ایک ایک کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انجینئروں، آفیسروں اور نوکروں کو قتل کرنا شروع کیا تو دادا سے یہ ظلم برداشت نہ ہوا دلبرداشتہ ہو کر روپوش ہو گئے۔ جب بغاوت ٹھنڈی پڑی تو خود سے تھانے گئے اور اپنے گناہ قبول کر لیے۔ سرکارِ انگلشیہ نے انہیں موت کی سزا سنائی۔ جب ابا جان کی دادا سے جیل میں آخری ملاقات ہوئی تو ان سے صبر نہ ہو، ارونے لگے۔ دادا جان نے دلاسہ دیا کہ فرزند یہ دنیا تو دو دن کی چاندنی ہے، پھر اندھیری رات ہے اور بندگی کا معیار بھی یہی ہونا ہیے کہ اوپر والا جس حال میں رکھے بندہ شکر ادا کرتا رہے۔ جب ان کو تختہ دار پر لایا گیا مجال ہے جو چہرے سے لگتا ہو کہ موت کا خوف

ہے۔ثابت قدمی سے چل کر آئے اور چہرے پر ایک شکن لائے بغیر راہی عدم گئے۔ابا کبھی کبھی ذکر کرتے تھے کہ دادا مرحوم کا جنازہ قبرستان کی جانب لے کر چلے تو جنازہ اتنا ہلکا تھا جیسے کاغذ کا بنا ہو۔دفنانے والے گواہی دیتے تھے کہ جب دفن کرنے کا وقت آیا تو چاروں طرف مشکِ عنبر جیسی ایک عجیب سی خوشگوار مہک آنے لگی تھی۔ان کی شہادت کے کچھ دنوں بعد ابا کو ایک خواب آیا کہ جنت کا منظر ہے۔عجب قسم کے پیڑ پودے ہیں۔خوش نظر پرندے آسمانوں پر پرواز کررہے ہیں۔دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں اور ایک طرف دادا جان گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر سونے کے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔غرض آنکھ کھلی تو بہت خوش ہوئے۔اسی وقت بازار سے جلیبیاں منگوائیں اور فاتحہ پڑھ کر بچوں میں بانٹ دیں۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔آمین!''

''میاں اکتا تو نہیں گئے؟''انہوں نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں نہیں میاں صاحب!واقعی،آپ کے دادا مرحوم کا قصہ کافی دلچسپ ہے۔''

پھر یوں گویا ہوئے۔

''ہمارا گھر کاغذی محلے میں تھا۔گھر کیا بھلا ایک درمیانے درجے کی حویلی سمجھ لو۔دس کمرے، اس کے ساتھ یہ بڑا سا دالان جس کے ایک طرف نوکروں کے کمرے،ایک طرف باغیچہ سا بنا ہوا تھا۔ابا جان ہمارے حکیم تھے۔ان کا نام تھا رسول خان۔ نام ہی کی طرح اطوار بھی تھے۔درمیانہ قد، سانولے سلونے،قدرے لمبوترا چہرہ،مہین مہین خوبصورت ہونٹ، چہرے پر گھنی داڑھی جو گرمیوں میں مہندی کی سرخی سے رنگی ہوتی۔عموماًان کا لباس لان کے کرتے اور پائجامے پر مشتمل ہوتا تھا۔سردیوں میں عمامہ اور گرمیوں میں مخمل کی چھتے دار ٹوپی ہوتی اور ہر وقت منہ میں پان کا بیڑا۔مزاج کے بہت حلیم اور شفیق تھے۔کیا بڑے کیا چھوٹے سب ان کی عزت کرتے۔قصہ مختصر......انہوں نے گھر کے دالان میں ہی ایک عوامی مطب کھول رکھا تھا۔غریبوں کا مفت علاج کرتے۔سارا دن کمروں میں مٹی کے کونڈوں میں جڑی بوٹیاں پستی رہتیں تو کہیں بڑے بڑے تانبے کے دیگچوں میں معجون کے گھونٹے لگ رہے ہوتے۔فضاء میں جڑی بوٹیوں کی خوشگوار سی مہک رہتی تھی جو مجھ کو اس زمانے میں تو بہت بری معلوم ہوتی تھی پر اب یاد آتی ہے تو دل مچل اٹھتا ہے۔ایک دفعہ ہوا یوں کہ جنرل ہیولک،ارے وہی جس نے کانپور میں باغیوں کا قلع قمع کیا تھا،سخت اسہال میں مبتلا ہو گیا۔بہت علاج کرایا پر ٹھیک نہ ہوا۔ابا کے ایک دوست جو جنرل کے خانساماں تھے اس نے ایک دن جب جنرل کو بہت تکلیف میں دیکھا تو صبر نہ ہوا۔کہنے لگا کہ جنرل صاحب!اگر حکم دیں تو یہ بندہ اپنے ایک دوست کو لے آوے جو جدی پشتی حکیم تو نہیں ہے البتہ قابل ضرور ہے۔جنرل خیر کیا سمجھتا۔اس کی اینگلو



انڈین داشتہ نے اسے انگریزی میں سمجھایا تو گردن کو ذرا سا خم کر ہاں کردی۔ابا مرحوم کو جب دوست نے یہ پیغام پہنچایا تو ابا نے مریض کی کیفیت پوچھی اور اسی وقت کچھ معجون اور سفوف لے کر روانہ ہو گئے۔جنرل انسان تھا بہت شکی...... پہلے معجون ابا جان کو چکھاتا پھر خود کھاتا۔اللہ کی شان کہ ایک ہی خوراک سے آرام آ گیا۔جنرل نے خوش ہو کر ان سے پوچھا کہ بولو کیا چاہتے ہو،اگر زمین کی چاہت ہے تو جتنی چاہیئے ابھی تمہارے نام کردیتے ہیں اور اگر روپے پیسے کی حاجت ہے تو تو بس اشارہ کر دو سرکاری اعزاز کے ساتھ گھر پہنچ جائے گا۔''

ابا پرانے وضع کے سیدھے سادھے سے آدمی تھے۔کہنے لگے کہ دینے والی ذات تو اوپر والے کی ہے۔بس آپ ٹھیک ہو گئے، یہی میری اُجرت ہے اور جنرل کو سلام کر کے گھر آ گئے۔لیکن جنرل بھی کوئی ٹیڑھے ہی دماغ کا تھا۔شام ہوتے ہی ایک گھڑ سوار سپاہی بھیج دیا۔سوار نے گھوڑے سے اُتر سیلوٹ کر کے ابا جان کو ایک لفافہ تھما دیا۔لفافے پر تحریر تھا 'سرکار انگلشیہ کے عظیم سپوت، جانباز اور بہادر جنرل ہیولک کی طرف سے رسول خان کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ'......اندر سے ایک سرکاری سمن نکلا جس کی رو سے موتی جھیل کے آس پاس کی زمین جنرل نے دہلی سے منظوری لے کر ابا جان کے نام کردی تھی۔حکم حاکم مرگِ مفاجات، چار و ناچار وہ سمن رکھ تو لیا پر کچھ دن بعد جنرل کے شہر سے وداع ہوتے ہی وہ سمن کو یہ کہہ کر پھاڑ دیا کہ باز آئے ایسی زمین سے۔

اتنے میں عصر کی آذان کا وقت ہوا تو میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔میں نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔ہم دونوں مسجد کی جانب چل دیئے۔نماز سے فراغت کے بعد واپس ڈیرے پر آئے تو وہی میری بے صبری طبیعت۔''میاں صاحب! آپ کے بزرگوں کا تو سن لیا،آپ کی ڈیوٹی کا ذکر ابھی تک نہیں آیا؟''

مسکرا کر بولے۔''صبر کرو چائے بنا لوں پھر سناتا ہوں باقی قصہ۔'' میں بے صبری سے چائے کے بننے کا انتظار کرتا رہا۔آخر خدا خدا کر کے چائے بن گئی تو پیالہ میرے آگے رکھ کر دیوار کے ساتھ رکھے گاؤ تکیہ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، پھر یوں گویا ہوئے۔

میاں مجھ پر جوانی ایسے آئی تھی جیسے ساون کے موسم میں ہاتھی پگلا جاتا ہے۔میں بھی مست ہاتھی کی طرح جھوم کر چلتا تھا۔کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ایک تو جوانی کی گرمی اوپر سے جیب میں رکھے سرکارِانگلشیہ کے نوٹوں کی گرمی تو بھلا کون کسی کو خاطر میں لاتا ہے۔ایک تو والدین کی اکلوتی اولاد نرینہ، بہنوں کے دلارے، بہت ناز و نعم میں پلے بڑھے۔جوانی کے دنوں میں ہمارا مشغلہ کبوتر بازی کرنا یا پھر شام ہوتے ہی مول گنج کی

تیز طرار طوائفوں کو ان کے چوبارے پر جا کر تنگ کرنا ہوتا تھا۔ مفت میں گانا سنتا۔ جب نذرانے کا وقت آتا تو دیدہ دلیری سے اُٹھ آتا۔ مجال نہ تھی کسی کی جو کوئی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا۔ آنکھ ہی نہ نکال کر ہاتھ میں رکھ دیتے اس کی۔ خیر کچھ اسی طور سے زندگی گزر رہی تھی۔ پھر ایک دن زہرہ نگاہ نام کی طوائف مول گنج کے اس بوسیدہ علاقے میں چودھویں کے چاند کی طرح طلوع ہوئی۔ کانپور کے کسی نو دولتیے رئیس نے اسے آگرہ سے بلوایا تھا اپنے بھائی کی شادی میں رقص وسرور کی محفلیں سجانے کے لیے اور مول گنج میں ہی ایک چوبارہ کرایہ پر لے کر اسے رہائش کے لیے دے دیا تھا کہ جب تک شادی کا جشن موقوف نہیں ہو جاتا وہیں سکون سے رہے۔ وہ اگر چاہتا تو اسے اپنی حویلی میں بھی رکھ سکتا تھا پر اس کی زوجہ لکھنؤ کی سیدانی تھی۔ اس نے صاف صاف بول دیا رئیس کو کہ جو کھیل تماشے کرنے ہیں کرو پر اس گند کو میں اپنی گھر میں نہیں رکھوں گی، خیر اس کی آمد کیا ہوئی ہر کوئی اس کی بات کرتا، کوئی اس کے نین نقش کی قسمیں کھاتا، تو کوئی اس کے نازک بانہوں کو سنگ مر مر سے تشبیہ دیتا تو کوئی اس کی رنگت کو گیندے کے پھول سے تشبیہ دے رہا ہے بس جدھر دیکھو اسی کے قصے۔ مجھے جب اس کا پتا چلا تو رہا نہ گیا، چل پڑا اس کے چوبارے کی طرف۔ رستے میں جو ساتھی سنگی تھے وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ ٹھٹ کا ٹھٹ ہمارے ساتھ چلتا تھا کہ دیکھیں اب یہ لونڈا کیا نیا تماشا کھڑا کرتا ہے۔ اس کے چوبارے پر پہنچ کر سیڑھیاں چڑھ کر بے دھڑک اندر گھس گئے۔ ابھی محفل پوری طور سے سجی نہ تھی۔ سازندے سر تال ملا رہے تھے۔ طبلہ نواز آٹے کے پیڑے کو طبلے پر پھیلا کر دھیرے دھیرے تھپک تھپک کر جما رہا تھا۔ ہارمونیم نواز بھی ہارمونیم کی چابیوں پر ایسے ہاتھ پھیرتا کہ سارے گاما پادانی سا کی سرگم سے آگے کچھ نہیں سمجھ آتا۔ سارنگی نواز سارنگی سے ایسی ایسی آوازیں نکالتا کہ لگتا بہت سارے ہاتھیوں کا جھنڈ چوبارے میں گھس آیا ہو۔ سامنے سفید رنگ کی چاندنی پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھی تھی۔ سانولا تکون چھوٹا سا چہرہ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، کشادہ پیشانی اور سر پر بیچ کی سادی مانگ نکال کر جوڑا بنایا ہوا تھا۔ نہ چمک نہ دھمک نہ روائتی بائیوں جیسا بھڑکتا ہوا پہناوا۔ نہ انداز میں پھکڑ پن بلکہ جسم پر لکھنؤ کی عورتوں کی طرح گھٹنوں سے تھوڑا اوپر تک آتی قمیص اور چوڑی دار پائجامہ جو اس کی پتلی پتلی ٹانگوں پر بہت کھب رہا تھا۔ اور سر اور شانوں سے لپٹا مخمل کا دوپٹہ، میں اس کا حلیہ دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑا۔ پہلے تو ناسمجھی سے میری جانب دیکھتی رہی پھر بھول پن سے پوچھا کون ہو اور کیوں ہنسے جا رہے ہو دیوانے ہو کیا؟

میں نے کہا۔ ''سچ سچ بتا کہ بائی ہو؟ پر تمہیں دیکھ کر تو کہیں سے نہیں لگتا کہ تم بازاری عورت ہو۔ بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے میلاد شریف پڑھنے آئی ہو یا کسی گھریلو عورت کو گھر کی چار دیواری سے اٹھا کر زبردستی یہاں بٹھا دیا گیا ہو۔''



بس اتنا کہنا تھا پسیج گئی اور بولی۔

''آیئے آیئے۔'' اور اپنے برابر رکھے گاؤ تکیہ پر بٹھا کر پاس رکھے پاندان سے پان کی ایک گلوری بنا کر دی جو میں نے بلا حیل وحجت منہ میں رکھ لی۔ پھر پوچھنے لگی کہ کیسے آنا ہوا؟

''آپ کی تعریف بہت سنی تھی سو چلے آئیں۔''

''خیر اوپر کی والے کی مرضی سے حضور نے دیکھ بھی لیا اور پان بھی نوش فرما لیا اور کوئی بات ہے جو رہ گئی۔''

''ہاں، ایک گیت سنا دیتی تو زندگی سنور جاتی۔''

ابھی تو ہم کسی کے مہمان ہیں اور زیب نہیں دیتا کہ ان کے زیر سایہ رہتے ہوئے کسی اجنبی کو گیت سناویں۔ جب ان سے رخصت کا وقت آئے گا تو آجانا گیت سنا دیں گے۔''

پر میں بھی اس دور میں بلا کا حاضر جواب تھا، کہنے لگا کہ ''کون اجنبی؟ ابھی آیا آپ نے دیوانے کا خطاب دیا جو سر آنکھوں پر، اپنے ہاتھوں سے گلوری کھلائی تو گویا آپ ہی آپ میزبان ہو گئیں اور نام خاکسار کا افتخار عالم خان ہے۔ پھر کون اجنبی اور کیسی اجنبیت اور مہمان کی فرمائش اچھے میزبان ٹالا نہیں کرتے۔''

ہماری حاضر جوابی سے مسکرا کر کہنے لگی۔

''ہائے اللہ آپ تو بہت چالاک ہیں، اچھا ابھی تو نواب صاب کے آنے کا وقت ہونے لگا ہے۔ آپ کل دن میں آیئے گا۔ آپ کی خواہش پوری ہو جاوے گی۔''

اب ضد کرنا اچھا نہیں لگا، دوسرا وہ نو دولتیہ رئیس بھی کچھ کم خبطی نہ تھا۔ سوچا فالتو میں سر پھٹول کرنے سے اچھا ہے کہ کل آجاؤ۔ مقصد تو پورا ہو ہی جائے گا۔ چنانچہ خدا حافظ کہہ کر دوسرے دن کا وعدہ کر کے نیچے اتر گیا۔ نیچے پہنچا تو دوست یار بہت مایوس ہوئے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا، کھودا پہاڑ نکلا چوہا یہ تو کچھ بھی نہ ہوا، میں نے ہنس کر ٹال دیا کہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تم لوگ بلا وجہ اس کی اتنی تعریفیں کر رہے تھے، عام سی عورت ہی تو ہے۔ دل بے زار ہو گیا اسے دیکھ کر۔ تم لوگ بھی فالتو میں اتنی سی چیز کو اتنا بڑا کر کے بتاتے ہو۔ یہ کہہ کر میں گھاٹ کی طرف ہو لیا تھا۔ کیونکہ شام کے وقت وہاں گورے لوگ اکثر سورج غروب ہونے کا منظر دیکھنے آتے تھے اور کبھی کبھی ان کے ساتھ ان کی نوعمر گوری بیگمات بھی ہوتی تھیں جو عموماً تو بس یونہی سی ہوتی تھیں پر کوئی کوئی چندے آفتاب اور آتش پارہ ہوتی تھی جس کو دیکھ کر دل بے کار میں تیز تیز دھڑکنے لگ جاتا۔

خیر دوسرے دن بن ٹھن کر خوشبوؤں میں مہکتے ہوئے ٹھیک عصر کے بعد اس کے چوبارے جا

پہنچا۔اس نے میری بہت آؤبھگت کی، حال احوال پوچھنے کے بعد کہنے لگی کیا سنیں گے؟

میں نے کہہ دیا بائی، جو تم دل سے سنانا چاہو۔اس نے سازندوں کو کچھ اشارہ کیا اور ایک ٹھمری شروع کر دی۔ان دنوں مول گنج میں محمد باندی کی ٹھمریاں بڑی مشہور تھیں پر جو اس نے جو سنائی وہ کچھ الگ ہی قسم کی تھی۔اس کے بول تو ٹھیک سے یاد نہیں پر کچھ یوں تھی۔

باجو بند کھل کھل جائے سانوریا نے جادو دارا
جادو کی پڑیا بھر بھر مارا، کا کرے گا وید بیچارہ
بلم تورے جھگڑے میں رین گئیو رے
کہاں گئے چندا کہاں گئے بدرا
کہاں گئے پریت نے
کھل گئی بدرا چٹک رہے تارے
سوئی اب گنتی رہی
اب تو جاگن رہے دنیا والے

بس میاں میں پھر کسی کام کے نہ رہا۔ کچھ رہ گیا تو بس ٹھمری، زہرہ بائی اور میں۔ یہی سلسلہ چلتا رہا۔دن میں وہ اپنے گیتوں سے مجھے مسحور رکھتی اور رات میں وہ نودولتیہ حرامی اپنے یار دوستوں کے ساتھ پہنچ جاتا تو رات گئے تک محفل لگی رہتی۔قصہ مختصر جو جمع پونجی تھی وہ اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔باپ کی بھی جو پس انداز کی ہوئی رقم تھی وہ بھی لٹا کر جب ایک دم قلاش ہو گیا تو ہوش ٹھکانے آئے۔ڈر بھی لگا کہ اگر ابا کو پتا چل جاتا کہ ان کا جمع کیا روپیہ جو انھوں نے حج کی نیت سے چھپا کر رکھا تھا بائی کی ٹھمریوں کی نذر ہو گیا ۔تو بس میاں سمجھو قیامت ہی آ جاتی۔قلاش کیا ہوا بائی نے بھی مجھ کو التفات کی نظر سے دیکھنا تو کجا چوبارے کی سیڑھیاں چڑھنے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔دو مشٹنڈے نودلتیے کو بول کر رکھ لیے تھے جن کو نہ جانے مجھ سے کیوں خدا واسطے کا بیر تھا۔ جہاں مجھے دیکھتے اپنے کسرتی بدن اور بازو کی اُبھری ہوئی مچھلیوں پر ہاتھ پھیر کر گھورنے لگتے۔اپنی بے جگری فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر سوچا تو بہت کہ ان مشٹنڈوں کی وہ ٹھکائی کریں کہ زمانہ دیکھے پر بات ساری یہ تھی کہ فائدہ کچھ نہ تھا، کیونکہ بائی کے لیے تو میں ایک ایسا کھوٹا سکہ ہو گیا تھا جو اس کے چوبارے میں چل نہ سکتا تھا۔

بہت دنوں تک ایسا ہی چلتا رہا۔آخر ایک دن میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ان مسٹنڈوں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ دیکھو بھائیو! میری نوکری تو دہلی میں ہو گئی ہے۔بس آج شام کی ٹرین سے



روانہ ہو جاؤں گا۔اگر اجازت دو تو دو گھڑی بائی کو دیکھ لوں؟ بندہ بشر تھے، دیکھا کہ یہ بلا تو خود ہی کہیں جا رہی ہے تو اجازت دے دی کہ جاؤ اور مل لو پر زیادہ وقت نہ لگانا۔اندھا کیا چاہے دو آنکھوں کے مصداق میں جب اوپر پہنچا تو یاد آیا آج تو جمعرات ہے۔وہ دہلی والے خواجہ صاحب کی بالکی تھی۔جمعرات والے دن نہ تو بائی محفل سجاتی تھی نہ رقص کرتی بلکہ سازندوں کی بھی چھٹی ہوتی تھی۔فاتحہ کا اہتمام کرتی اور نہا دھو کر سادہ قمیص شلوار میں بیٹھ کر پورا دن امیر خسرو کا کلام پڑھتی رہتی۔میں جب کمرہ میں داخل ہوا تو اس وقت بھی وہ اسی مشغلے میں مصروف تھی۔پر اس دن مجھے وہ بہت عجیب لگی ایسے لٹے پٹے انداز میں بیٹھ کر کلام پڑھ رہی تھی کہ دل دیکھ کر پسیجنے لگا۔لگتا تھا دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں۔بس کمرے کے پرلی طرف بنے روشن دان کو دیکھ دیکھ کر یہی بار بار دہرائے جاتی:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

وہ خود میں اتنی مگن تھی کہ اس کو میری آمد کی خبر ہی نہ ہوئی۔دور سے گلا کھنکار کر سلام کیا تو متوجہ ہوئی۔پوچھنے لگی۔''کیسے آنا ہوا؟''

میں نے بھی صاف بول دیا کہ دیکھو بائی اب تو جو کچھ تھا وہ تو تم پر لٹا چکا۔لے دے کر ایک جان بچی ہے وہ دینے آیا ہوں۔وہ بھی لے لو تا کہ اس اذیت سے جان چھوٹے۔

کہنے لگی،''اچھا میرے ساتھ آؤ۔'' پھر پچھلے کمرے میں لائی جہاں لکڑی کا تھوڑا سا فرنیچر، موسیقی کے آلات، کچھ لوہے کے برتن، لکڑی کا ایک صندوق اور ایک گٹھری سی رکھی تھی۔کہنے لگی جتنا بھی مال چاہیے اس گٹھری سے نکال لو اور اپنی راہ لو۔گٹھری جو کھولی تو سرکارِ انگلشیہ کے نوٹوں اور سکوں سے بھری پڑی ہوئی تھی۔اسی وقت میرے دماغ میں ایک بات آئی۔سوچا جو گٹھری میں اتنا مال ہے تو صندوق میں تو ضرور ہیرے جواہرات ہونگے۔چنانچہ آگے کا لائحہ عمل ذہن میں سوچ کر بائی سے ایک گلاس پانی کا مانگا۔بائی جب پانی لینے گئی تو گٹھری تو ویسے کی ویسے ہی رہنے دی اور لکڑی کے صندوق کو اٹھا کر کاندھوں پر رکھا اور بھاگم بھاگ داخلی کمرے والے روشن دان سے صندوق کو باہر پھینک کر جلدی جلدی سیڑھیاں لانگ کر نیچے اتر آیا۔روشن دان کے پرلی طرف ایک پتلی سی گلی تھی جو رات کے وقت نشہ کرنے والوں کی آماجگاہ ہوتی تھی لیکن دن کے وقت عموماً سنسان ہی رہتی۔جب وہاں پہنچ کر صندوق کو واپس اُٹھایا تو روشن دان سے بائی کا چہرہ نظر آیا۔وہ 'افتخار، افتخار' کی آوازیں لگا کر مجھے اس صندوق کو لے جانے سے روک رہی تھی، پر دل پر پتھر رکھ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا گھر کی جانب چل دیا تھا۔اپنے کمرے میں داخل ہونے کے لیے گھر کا پچھلی

طرف کا دروازہ استعمال کیا تاکہ کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور پھر جب اس صندوق کو کھولا تو جانتے ہو اندر سے کیا نکلا؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کہنے لگے۔

''یک مردانہ اچکن کا کرتہ، ایک ٹوپی اور اور اور پائجامہ، بس میاں خود کو دل ہی دل میں بہت گالیاں دیں کہ اچھا خاصا مال واپس مل رہا تھا پر لالچ کا انجام برا ہوا۔ اب کروں تو کیا کروں ۔ دل میں جانے کیا آئی جھٹ پھٹ کرتا پائجامہ پہنا ا۔ب میاں وہ ٹوپی لگائی تو دنیا ہی بدل گئی۔ مجھ میں اضطراب کی لہریں گردش کرنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے پیڑ سے الگ ہوا خزاں رسیدہ پتہ ہوں......نہیں پتہ نہیں وہ درخت تھا جو جھر جھر جھڑے جا رہا تھا یا طوفان کی زد میں آئی بغیر پتوار کی ناؤ...... بیٹھتا تو گھومنے لگتا......گھومے جاتا...... چلتا تو پاؤں میں شرابیوں کی طرح لڑکھڑاہٹ آجاتی بلکہ میں تو کچھ بھی نہ تھا۔ تھوڑا بہت احساسِ خودی تھا پر وہ بھی دھیرے دھیرے جیسے موم بتی جب آخر تک پہنچ جائے تو ٹمٹمانے لگتی ہے پھر بجھ جاتی ہے ایسے ہی جلتا رہا۔ کچھ دیر یہ کیفیت رہی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بس کچھ دھندلا دھندلا یاد ہے کہ جب آنکھ کھلتی تو لگتا کوئی میرا سر دبا رہا ہے تو کوئی بادام کے تیل سے میرے ہاتھ پاؤں کی مالش کر رہا ہے۔ غنودگی کب غفلت اور کب اجالے میں تبدیل ہو جاتی یاد نہیں۔ دو دن غفلت رہی۔ تیسرے دن ہوش آیا تو نقاہت اتنی تھی کہ لگتا تھا کسی طویل بیماری سے اُٹھا ہوں۔ آنکھیں کھولیں تو دھندلاہٹ کے پردے سے چیزیں دھیرے دھیرے روشنی میں آنے لگیں۔ والد صاحب سرہانے بیٹھے آیتیں پڑھ پڑھ کر مجھ پر دم کر رہے ہیں، بہنیں فکرمندی سے میری جانب دیکھ رہی ہیں۔ اسی وقت چھلانگ لگا کر جو اٹھا تو آنکھوں کے سامنے واپس دھندلاہٹ بھرا اندھیرا سا آ گیا۔ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بہنوں نے رونا شروع کر دیا۔ ابا جان نے مجھے واپس لٹانا چاہا تو ان کا ہاتھ جھٹک کر سر جھاڑ منہ پہاڑ گھر سے باہر نکل گیا۔ پھر یاد نہیں اس کے چوبارے کیسے جا پہنچا۔ وہ سب لوگ روانگی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اندر داخل ہوا تو زہرہ نظر آئی۔ اسے دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور اس کے پاؤں کو پکڑ کر رونا شروع کر دیا۔ آس پاس جو سازندے تھے وہ حیرانی سے میری جانب دیکھنے لگے کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے۔ زہرہ نے انہیں نیچے جانے کا اشارہ کیا اور مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''یہ ہمارے مرشد کا جوڑا ہے جو انہوں نے آخر وقت ہمیں دے دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ یہ جس کے لیے ہے وہ بیوقوف تیرے پاس خود پہنچ جاوے گا۔ معافی نہ مانگو۔ یہ نصیب کے کھیل ہیں۔ یہ تمہارے لیے ہی ہے اور تمہیں ایسے ہی ملنا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر سانس لینے رکے۔ ایک تو ضعیفی اوپر سے اتنا لمبا



قصہ۔ میں نے جلدی سے مٹکے سے پانی کا کٹورا بھر کر دیا تو تشکر بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟'' کہنے لگے۔

''بس ہوش آیا تو ہم نہ افتخار نہ عالم نہ زہرہ نہ سازندے، چوبارہ خالی، پھر کسی چیز کی خواہش نہ رہی، اسی چوبارے کو کرائے پر لیا اور دعا تعویز کرنے لگے۔''

اور میں جو سمجھا تھا کہ اس قصہ کا بہت ڈرامیٹک سا آخر ہوگا بہت بے مزہ ہوا۔ ان سے اجازت مانگ کر خود کو کوستا ہوا گھر کی جانب چل دیا کہ میاں ہر چیز میں فینٹیسی نہ ڈھونڈا کرو۔ پھر بہت سارے دن ایسے ہی گزر گئے۔ انہی دنوں مجھے چند ماہ کے لیے کسی دوسرے شہر جانا پڑ گیا۔ واپس لوٹا تو سوچا چلو میاں صاب کی بھی خبر لے لوں۔ ان کے ڈیرہ پر پہنچا تو دیکھا وہی شرابی جو اس دن میاں صاحب کو گالیاں دے رہا تھا ان کی جگہ پر بیٹھ کر تعویز لکھ رہا ہے۔ میرا نمبر آیا تو اس سے میاں صاحب کا پوچھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا کہ ایک روز اچانک میاں صاب کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مجھے جب پتا چلا تو انہیں اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ آخری دم تک ان کی خدمت کی۔ ساری زندگی ان کو گالیاں دیتا رہا تھا، سوچا ان کی خدمت کر کے اپنا گناہ معاف کروالوں۔ ایک دن جب بہت سخت گرمی تھی، ان کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ کہنے لگے لگتا ہے میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ یک صندوق میری کوٹھری میں رکھا ہے وہ تمہاری نذر کیا اور کلمہ پڑھ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کو دفنانے کے بعد میں نے وصیت کے مطابق ان کا صندوق کھولا تو ایک بوسیدہ کرتا، پائجامہ اور ٹوپی نکلی، ساتھ جو لوگ تھے کہنے لگے میاں یہی ریت ہے ایک دفعہ پہن لو پھر واپس رکھ دینا، بس جس دن سے پہنا ہے کسی اور کام کا نہ رہا۔

اور میرے ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا یہ جس کے لئے ہے وہ بیوقوف تیرے پاس خود پہنچ جاوے گا۔ کہیں کسی گھر سے گراموفون پر ٹھمری بج رہی تھی

باجو بند کھل کھل جائے سانوریا نے جادو دارا
جادو کی پڑیا بھر بھر مارا، کا کرے گا وید بیچارہ

◀◀ ● ▶▶

Block 6, House # 666, Liaquatabad Karachi - Pakistan
Postal address: 75900
Cell: 00923072373703

## ● سید کامی شاہ

# غریب آباد

عمران......عمران......عمران......دادی نے کراہتے ہوئے پکارا۔

’’ہائے اللہ! اب تُو اس دنیا سے اٹھا کیوں نہیں لیتا؟ عمران کو متوجہ نہ پا کر دادی شکوہ بھرے لہجے میں کراہتے ہوئے بڑبڑائی۔ پھر لمبی لمبی گاڑھی سانوں کے گھونٹ بھرنے لگی۔ اس کے سینے میں آتی جاتی سانوں کے درمیان خرخراہٹ تھی، جیسے حلق میں کوئی ٹوٹی ہوئی رسی پھنس گئی ہو یا کسی چھپکلی کی کٹی ہوئی دُم جو تیزی سے پھڑک رہی ہو۔

دادی کی آنکھوں میں بڑا سا ہراس پھیلنے لگا اور اس کا لاچار بدن تشنج کی سی کیفیت میں اکڑنے لگا۔ گردن کے پٹھے کھنچنے لگے اور چھپکلی کی کٹی ہوئی دُم کے پھڑکنے میں تیزی آنے لگی۔

’’پتا ہے تُو ناں مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔‘‘ اپنی اوڑھنی کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے اُس نے کہا۔

’’اچھا......کتنا اچھا؟‘‘ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

’’اِتناااا......! اُس نے دونوں بازو پھیلائے اور پھر ہنستے ہوئے چہرہ اوپر اٹھا لیا۔ اس کے چہرے پر سورج طلوع ہونے لگا۔

’’اچھا......!‘‘ کہہ کر اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر چوم بھی لیا۔

’’ہائے اللہ، چھوڑو ناں! کوئی دیکھ لے گا۔‘‘ وہ کسمسائی۔

’’تو کیا......دیکھا کرے......‘‘

’’تجھے تو کسی کی فکر نہیں...... پر میرے باپ کو پتا لگ گیا ناں تو مصیبت آجائے گی۔‘‘ اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور ذرا سا پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

’’تم اتنا ڈرتی کیوں ہو؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’تجھے تو کوئی روکنے ٹوکنے والا ہے نہیں...... پر میرے باپ کا تجھے نہیں پتا، بڑا کمینہ ہے وہ۔‘‘ اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔



’’تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اس سے آزاد کرا لوں گا۔‘‘ اس نے تسلی دی۔

’’کب کرائے گا؟‘‘ وہ اس کی آنکھوں کے راستے اندر اترنے لگی۔

’’بہت جلدی......تم فکر مت کرو۔‘‘

’’پتا ہے...... مجھے ناں بڑا ڈر لگتا ہے...... میرا باپ مجھے قادر خان کو بیچ دے گا۔ اس نے پیسے بھی لے لیے ہیں اس سے۔‘‘ وہ افسردہ ہونے لگی۔

’’کون ہے یہ قادر خان؟‘‘

’’جوئے کا اڈا چلاتا ہے، ہیروئن اور اسلحہ بھی بیچتا ہے۔ میرا باپ جاتا ہے وہاں جوا کھیلنے۔‘‘

’’ہوں......‘‘ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

’’بڑا خطرناک ہے وہ...... اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں...... بڑا پیسے والا ہے۔ سونے کی انگوٹھیاں پہنتا ہے...... وہ نہیں چھوڑے گا مجھے...... اس نے غنڈے پالے ہوئے ہیں لوگوں کو مارنے کے لیے۔‘‘ وہ سسکنے لگی۔

’’تم پریشان کیوں ہوتی ہو، میں بہت جلدی لے جاؤں گا تمہیں یہاں سے، پھر ہم وہاں رہیں گے جہاں سب اچھا اچھا ہو۔‘‘ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر ہچکیاں لینے لگی۔

’’مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ یہ دیکھو، میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے۔‘‘ اس نے عمران کا ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا۔ اسے جیسے کرنٹ لگ گیا اور اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

’’کیا ہُوا؟‘‘ اس نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں دھیمے دھیمے سے شعلے جل رہے تھے۔

’’کچھ نہیں۔‘‘ اس نے سینے میں بے ترتیب ہوتی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

’’میری ماں نے میرے باپ کی منت کر کے مجھے ایک سال کے لیے روکا ہے یہاں، وہ تو پہلے ہی لے جا رہا تھا۔‘‘

’’کب؟‘‘

’’پچھلے سال......عید پہ جب میں تیرہ سال کی تھی۔‘‘

’’اب تم کتنے کی ہو؟‘‘

’’تین مہینے بعد چودہ کی ہو جاؤں گی...... پھر وہ لے جائے گا مجھے۔ لیکن مجھے نہیں جانا اُس کے ساتھ۔‘‘ وہ سختی سے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ اس کے سینے سے لپٹ کر روتی رہی اور اس کے ذہن میں خدشات منڈلاتے رہے...... قادر خان، لمبے ہاتھ، جوئے کا اڈا، کرائے کے غنڈے......

’’اچھا، اب میں چلتا ہوں۔‘‘ اس نے آہستگی سے اسے خود سے الگ کیا۔ ’’کل ملیں گے۔‘‘ پھر وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر جانے لگا۔ وہ پہلے تو حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آوازیں دینے لگی۔

’’عمران......عمران......عمران......‘‘

قدرے نیچی چھت پر بالکل دادی کے چہرے کے عین اوپر ایک چھپکلی آ کر ٹھہر گئی تھی اور اب اپنی ساکت آنکھوں سے دادی کو گھورے جا رہی تھی۔ دادی کو اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ اسی ڈر نے اسے اپنے واحد مددگار کو پکارنے پر مجبور کیا۔ عمران نے ان کی آواز پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ دیوار کے اُس طرف کہیں تھا جو دادی کے سر کی پچھلی جانب تھی اور وہ پوری طرح گھوم کر ادھر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ دادی کو نہیں معلوم تھا کہ عمران اُدھر کیا کر رہا ہے، سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اسے کچھ علم نہیں تھا۔ دادی آواز میں زور پیدا کر کے ایک بار پھر اسے پکارنے لگی۔

’’عمران...... ادھر آ بیٹا اور اس منحوس کو بھگا...... ہائے...... عمران تُو میری بات سن رہا ہے یا نہیں......؟

’’عمران......! عمران......!! عمران......!!!‘‘

گھٹنوں میں سر دے کر اونگھتے ہوئے عمران کو ایسا لگا جیسے وہ کسی صحرا میں چلا جا رہا ہے اور کسی عورت کی آواز اس کی طرف تیزی سے بھاگتی آ رہی ہے۔ پھر وہ آواز پھیلنے لگی اور سارے کو اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے سر اٹھایا۔ وہ کولہے زمین پر ٹکا کر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا، سر اٹھاتے ہوئے اسے لگا وہ کسی جھولے میں بیٹھا ہے جو سبک رفتاری سے آگے پیچھے جھول رہا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ دادی کی آواز میں خوف کی شدت آ گئی تھی۔ وہ بدقت تمام اٹھا اور دیوار کا سہارا لے کر باہر کی طرف چلنے لگا۔

’’کیا ہے......؟ کیوں چلا رہی ہو......؟؟‘‘ اس کے لہجے میں سخت بیزاری تھی۔ اس کی دادی اپاہج تھی اور چل پھر نہیں سکتی تھی۔ چند سال پہلے گھر کا سودا سلف لاتے ہوئے ایک موٹر سائیکل سوار نے اسے ٹکر دے ماری جس سے کولہے کی ہڈی چکنا چُور ہو گئی اور دادی عمر بھر کے لیے چلنے پھر سے معذور ہو گئی۔ اس دنیا میں دونوں تنہا تھے۔ عمران کے ذہن میں اپنے ماں باپ کے مٹیالے سے نقوش تھے۔ عمران کو دادی نے ہی پالا تھا۔ یہ گھر اس کے دادا نے خریدا تھا۔ وہ برسوں سے یہیں رہ رہے تھے۔ دادی کے اپاہج ہو جانے کے بعد عمران نہ یہاں سے کہیں جا سکتا تھا اور نہ دادی کو چھوڑ سکتا تھا۔ دادی طویل عرصے سے چارپائی پر لیٹے لیٹے اسی کا حصہ لگنے لگی تھی۔ اس کے لیے وقت کسی گرہ میں بندھ گیا تھا۔ وہ سارا وقت ایسے ہی پڑی چھت کو



گھورتی رہتی۔ کبھی کبھی عمران اس کی کمر کے نیچے دو ایک تکیے لگا کر اسے سہارے سے بٹھا دیتا اور وہ ٹیڑھے سے مضحکہ خیز انداز میں پڑی رہتی مگر تکلیف کے باعث وہ اس عالم میں بھی زیادہ دیر نہ رہ پاتی اور پھر سے لیٹ جاتی۔ وہاں چھپکلیوں اور لال بیگوں کی بہتات تھی۔ فرش پر چلتے لال بیگ نظر آتے تو چھت اور دیواروں پر چھپکلیاں رینگتی رہتیں۔ عمران جو ساری دنیا پر لعنت بھیج کر اپنا کمرہ اوڑھے پڑا ہوتا دادی کی اذیت ناک آوازیں سن کر واپس آتا اور کسی نہ کسی طرح دادی کی تکلیف یا خوف رفع کرنے کی کوشش کرتا۔ کبھی تو چھت پر سچ مچ کوئی چھپکلی نظر آتی اور کبھی صرف دادی کی آنکھوں میں۔

’’ہائے بیٹا! اس کم بخت کو تو بھگا۔ اس نے تو میری جان ہی نکال دی ہے۔‘‘ دادی نے چھت کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ عمران نے چھت کی طرف دیکھا ایک موٹی سی زرد چھپکلی چھت سے چپکی ہوئی تھی اور اپنی ساکت آنکھوں سے اسے گھورے جا رہی تھی۔ عمران کی رگوں میں خوف کی لہر سرایت کرنے لگی۔ اسے لگا یہ چھپکلی نہیں بلکہ کوئی بدروح ہے جس نے ان کی زندگی سے سارے رنگ نچوڑ کر پیلاہٹ بھر دی ہے۔ وہ چپل اٹھانے کے لیے زمین پر جھکا، اس کی حرکات ایسے عمل میں آ رہی تھیں جیسے سلو موشن میں کسی فلم کا منظر چل رہا ہو۔ وہ جتنی دیر میں چپل اٹھا کر سیدھا ہُوا چھپکلی تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک نیم تاریک کونے کی طرف جا چکی تھی۔

’’بھاگ گئی سالی......!‘‘ اس نے کہا اور دادی کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

’’چھپکلیاں چھت سے گرتی تھوڑی ہیں۔‘‘ اس نے دادی کو تسلی دی۔ ’’تم خوامخواہ پریشان ہو جاتی ہو۔‘‘

’’وہ منحوس ماری مجھے گھور رہی تھی، کسی بدروح کی طرح۔‘‘ دادی کی آواز میں خوف تھا۔

’’چلو اب تو بھاگ گئی ہے، اب آئی تو میں اسے جھاڑو سے ماروں گا۔ پھر یہ تمہیں تنگ نہیں کرے گی۔‘‘ اس نے دادی کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

مجھے تھوڑا سا پانی پلا دے۔‘‘ دادی نے اس کا ہاتھ چوما۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھا اور چارپائی کے نیچے پڑا گلاس اٹھایا...... گلاس خالی تھا...... وہ قریب پڑے مٹکے کی طرف بڑھ گیا۔ پانی بھرتے ہوئے اسے سامنے دیوار کے رخنے میں ویسی ہی پیلی سی لجلجی چھپکلی نظر آئی۔ وہ اپنی ساکت آنکھوں سے اسی کو گھور رہی تھی۔ اس نے زیرلب موٹی سی گالی دی اور قریب پڑا کسی شے کا ٹوٹا ہوا حصہ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ چھپکلی اسی رخنے کے اندر کہیں واپس چلی گئی۔ رخنہ خاصا گہرا تھا۔ دیوار کے اُس طرف ایک گندی گلی تھی۔ لوگ اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ وہاں پھینک دیا کرتے، چونکہ وہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا تو کبھی کسی نے اس گلی کی صفائی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس علاقے میں ہر گلی کے پیچھے ایسی ہی ایک گندی گلی تھی۔ جو زیادہ تر

نشہ بازوں یا اہلِ محلّہ سے چھپ چھپا کر ملنے والے جوڑوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔

یہ غریب آباد تھا۔ بڑے شہر کا ایک چھوٹا سا، پسماندہ علاقہ......!

پانی کا گلاس لے کر وہ دادی کے پاس آیا اور اسے سہارا دے کر پانی پلانے لگا۔ دو ایک گھونٹ پلا کر اس نے گلاس زمین پر رکھا اور دوائیوں والی تھیلی میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ پھر اس نے ایک پیلی گولیوں کا پتا نکالا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی گولی الگ کر لی۔

''تم فکر نہ کرو...... یہ گولی کھالو...... نیند آ جائے گی۔ میں یہیں ہوں۔ کوئی بات ہو تو مجھے آواز دے لینا۔'' اس نے دادی کو نیند کی گولی کھلائی اور اٹھ کر کمرے کی طرف چل پڑا۔

''یا اللہ...... تیرا ہی آسرا ہے۔'' بڑھیا نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ عمران کمرے میں آ گیا۔ دروازہ وہ کبھی بند نہیں کرتا تھا کہ دادی کسی وقت بھی اسے کسی ضرورت کے تحت بلا لیتی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں چیزیں بے ترتیب بلکہ بکھری پڑی تھیں۔ لوہے کے دو تین صندوق، چند پرانے ادھڑے ہوئے ڈائجسٹ، جن کا نہ کوئی سرِ ورق تھا اور نہ ان کے سن اشاعت کا کچھ پتا چلتا تھا۔ بس کچھ کہانیاں تھیں جو کٹے پھٹے ادھڑے ہوئے اوراق میں بندھی رہ گئی تھیں۔ پانی کی آدھی خالی بوتل، سگریٹوں کے ٹوٹے، جلی ہوئی تیلیاں، ایک گرد آلود سفری بیگ جس کے اصل رنگ کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ایک طرف مسجد سے لائی ہوئی دری بچھی تھی جس پر میلا سا گدا۔ ایک کمر ٹوٹا تکیہ اور میلی سی چادر پڑی تھی۔ یہاں ضرورت کی چیزیں بہت کم تھیں...... دونوں کی ضرورتیں بھی کم ہی تھیں۔ عمران دن کے اوقات میں زیادہ تر باہر رہتا۔ رات کو آتا اور دادی کو کچھ کھلانے پلانے کے بعد درد کم کرنے کی دوا دے کر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ دادی وہیں پڑی کراہتی رہتی۔ کبھی چھت پر کوئی چھپکلی آ جاتی تو وہ عمران کو پکارنے لگتی۔

''عمران...... عمران...... عمران......!''

''عمران نام ہے ناں تمہارا؟'' اس کالے بھجنگ آدمی نے پوچھا تھا جس کی آنکھیں بہت لال تھیں اور دانت بہت پیلے۔ اس کے بال کسی شکاری پرندے کے گھونسلے جیسے چھدرے تھے اور کنپٹیوں پر آ کر خاکستری ہو جاتے تھے۔ اس کے ماتھے کی شکنیں اس کے جہاں دیدہ ہونے کا پتا دیتی تھیں۔

''ہاں......!'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''اپن ظفر ہے...... ظفر بلوچ۔ اِدھر چپڑاسی کا کام کرتا ہے۔ آج سے تم ہمارے ساتھ کام کرے گا۔ آصف ساب نے بتایا تمہارے بارے میں۔'' اس نے کہا۔

''اچھا......!'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔



''کتنے پیسوں پر آئے ہو؟'' ظفر نے پوچھا۔

''چار ہزار۔'' اس نے کہا اور نظریں نیچی کر کے فرش کو دیکھنے لگا۔

دوپہر کو باتھ روم جاتے ہوئے اس نے ظفر کو اندر سے برآمد ہوتے دیکھا، اس کے پیچھے پیچھے چرس کے دھوئیں کا ایک مرغولہ بھی باہر آیا۔ اس نے حیرت سے نارائن کو دیکھا۔

''اپنا تو یہ چلتا ہی رہتا ہے...... ہی ہی ہی ہی......!'' اس نے کھسیانی سی ہنسی فضا میں اچھالی اور اسے حیرت زدہ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

کچن میں صاحب کے لیے چائے بناتے ہوئے ظفر آ گیا۔ اسے یہ آدمی بڑا عجیب سا لگا تھا۔ یوں دن دیہاڑے باتھ روم میں چرس نوشی اس کے لیے حیرت انگیز تھی۔ وہ تھوڑی دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''کیا بات ہے، کیا دیکھ رئے ہو؟'' ظفر نے پوچھا۔

''تم چرس پیتے ہو؟'' اس نے براہ راست سوال کیا۔

''ہاں......! تم بھی پیو گے کیا؟'' اس نے نہ صرف برملا اعتراف کیا بلکہ اسے بھی ایک طرح سے دعوت دے ڈالی۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟'' اس کی آواز میں تجسس تھا۔

''کاہے کا مسئلہ؟'' ظفر نے پوچھا اور خود ہی کہنے لگا۔ ''اپن میں بس یہی ایک خرابی ہے۔ یہ ظالم جان نہیں چھوڑتی۔ ہم رہ نہیں سکتا اس کے بغیر...... ساب لوگ کو بھی پتا ہے۔''

''تو صاحب نے پھر کیا کہا؟'' عمران نے پوچھا۔

''کچھ نہیں کہتا ساب...... بولتا ہے بس احتیاط کرو۔ چھوڑ دو تو اچھا ہے۔ پر اپن سے چھوٹتی نہیں یہ ماں......'' وہ پتیلی میں کھولتی چائے میں پوّ اچھالنے لگا۔ عمران نے ایک اسٹول کھینچا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

''ویسے اپن ہر طرح سے اچھا آدمی ہے۔ روپے پیسے میں ڈنڈی نہیں مارتا، ٹائم پہ آتا ہے، فالتو میں چھٹی نہیں کرتا، ساب لوگ کا خدمت کرتا ہے۔ شکایت نہیں کسی کو ہم سے۔'' وہ جیسے خود کو یقین دہانی کروا رہا تھا۔

''کب سے ہو یہاں پہ؟'' اس نے پوچھا۔

''جب سے یہ فیکٹری بنا ہے...... ہاہاہاہا...... بہت سال ہو گئے...... ہم شروع سے ادھر ہی رہتا ہے، ادھر پیچھے نشاط آباد میں...... ہمارا باپ دادا بھی ادھر ہی رہتا تھا۔'' وہ کپوں میں چائے نکالنے لگا۔ عمران چائے سے اٹھتی بھاپ کو دیکھنے لگا۔

’’تم جاؤ ساب کو چائے دے آؤ ہم تمہارے لیے بناتا ہے سگریٹ۔ تم بھی کیا یاد کرے گا۔‘‘ اس نے چائے کے کپ ٹرے میں رکھے اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔ عمران چائے دے کر واپس آیا تو وہ ایک سگریٹ خالی کر چکا تھا اور دوسری اس کی انگلیوں میں ناچ رہی تھی۔ عمران اسی اسٹول پر اس کے مزید قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ بڑی مہارت سے چل رہے تھے۔ سگریٹ اس کی انگلیوں اور انگوٹھے کے بیچ رقص کر رہی تھی اور اس کی ہتھیلی پر تمباکو کی بارش ہو رہی تھی۔

’’بڑے ماہر ہاتھ ہیں تمہارے استاد۔‘‘ عمران نے کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔

’’ہاہاہاہا......!‘‘ وہ ہنسا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگا۔

’’پتا ہے؟ آدمی نے سارا ترقی اپنے ہاتھوں کی مہارت سے کیا ہے۔ بڑی فنکاری ہوتی ہے ان ہاتھوں میں۔ یہ ہاتھ چاہیں تو کچھ بنا لیں، چاہیں تو بگاڑ دیں۔ سارا کھیل ان ہاتھوں کا ہے۔‘‘ وہ اپنی دھن میں بولتا رہا۔ ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی اپنی مہارت دِکھاتے رہے۔ وہ اپنے پسندیدہ کام میں اتنا منہمک تھا کہ اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

’’آدمی نے سارا ترقی اپنے ہاتھوں کی مہارت سے کیا ہے، یہ ہاتھ بڑے کام کے ہوتے ہیں، ہاتھ میں ہنر ہوگا تو کبھی مار نئیں کھاؤ گے۔‘‘ فیکٹری سے نکلتے وقت اس کے ذہن میں ظفر کی باتیں گونجتی رہیں۔ ’’مگر میرے ہاتھوں میں تو کوئی ہنر نہیں۔‘‘ اس نے سوچا اور چلتے چلتے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی اور اس پر پھیلے لکیروں کے جال کو دیکھنے لگا۔

مسجد کی صف پر ایک سستے سگریٹ کا پیکٹ پڑا تھا۔ پیکٹ کے ساتھ ہی ایک مکمل اور ایک آدھی بجھی ہوئی سگریٹ تھی اور ماچس کی جلی اور ان جلی تیلیاں اور ماچس کی ڈبیا پر ایک چمکدار پنی میں لپٹی ہوئی کوئی چیز۔ عمران نے ادھ جلا ٹوٹا اٹھایا اور سلگانے لگا۔ سگریٹ جلا کر اس نے زور سے کش لیا اور دو ایک لمحے دھویں کو حلق میں رکھنے کے بعد سگریٹ کے جل اٹھنے والے سرے پر دھویں کی پھونک ماری۔ وہ سر ادھنے لگا۔ اس نے اوپر تلے دو تین کش لگائے اور دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے دماغ میں نشے کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جُڑنے لگا۔

غریب آباد اور نشاط آباد کو علاحدہ کرنیوالی سڑک کے پار جہاں سے نشاط آباد شروع ہوتا تھا ایک زیرِ تعمیر عمارت تھی۔ یہ کسی شاپنگ پلازہ کا ادھورا ڈھانچہ تھا۔ سنا تھا ملکیت کے کسی تنازع کے باعث عدالت نے اس کی تعمیر رکوا دی تھی اور کئی برس سے وہ ایسے ہی آدھا ادھورا سا، بے رنگ، بے ڈھب سا ڈھانچہ وہاں کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کے پارکنگ ایریا میں برسوں سے ہیروئنچیوں کا قبضہ تھا جن کی محفل رات کو جمتی اور دیر



گئے تک شور شرابے اور گالم گلوچ کی گونج رہتی۔ کبھی کوئی ٹھیکیدار نما آدمی چند مزدور نما لوگوں کے ساتھ آتا اور ان ہیروئنچیوں کو دھکے اور گالیاں دے کر وہاں سے بھگا دیا جاتا۔ وہ بھی جواباً گالیاں دیتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جاتے اور رات ہوتے ہی پھر وہاں آن ٹپکتے۔ وہ ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر وہیں سے چل پڑتا۔ اس پلاٹ پر جو حصہ تعمیرات کی زد سے بچا ہوا تھا وہاں کئی روز سے بھکاریوں کا ایک گروہ آ کر بس گیا تھا۔ وہ وہیں کھاتے پکاتے اور دیگر امورِ زندگی سرانجام دیتے۔ ان کی تعداد خاصی تھی۔ ان میں عورتیں بچے جوان بوڑھے ہر طرح کے لوگ تھے۔ صبح ہوتے ہی ان کے مرد اور لڑکے کام دھندے کی غرض سے اِدھر اُدھر نکل جاتے۔ پیچھے چھوٹی چھوٹی عارضی جھونپڑیوں میں اِکا دُکا عورتیں بچے سنبھالتی رہ جاتیں۔ انہی میں ایک وہ بھی تھی جو اسے صبح صبح کام پر جاتے ہوئے نظر آئی تھی۔ قدرے صاف ستھری، گڑیا سی، جس کی ٹھوڑی پر تین ہرے ستارے گدے ہوئے تھے۔ وہ کسی بھی طرح اس بھکاری قبیلے کا حصہ نہیں لگتی تھی۔ پھر وہ دانستہ اسے دیکھنے لگا۔ روز صبح کام پر جاتے ہوئے وہ اسے کوئی نہ کوئی کام کرتے یا چھوٹی عمر کے ایک لنگڑے بچے کے پاس بیٹھی دکھائی دیتی جو ممکنہ طور پر اس کا بھائی تھا۔ وہ بانسری بجاتا اور وہ اس کے پاس بیٹھی نجانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی۔ اسے حیرت ہوتی کہ سچ مچ کا لنگڑا سارا دن یہاں بیٹھ کر بانسری بجاتا ہے اور اچھے خاصے ہٹے کٹے لوگ مصنوعی زخم یا معذوریاں پیدا کر کے بھیک مانگتے۔ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی مگر وہ بانسری بہت اچھی بجاتا تھا۔ وہ صبح صبح تین ستاروں والی اس گڑیا سی لڑکی کو دیکھتے ہوئے گزرتا اور جان بوجھ کر اپنی رفتار کم کر لیتا کہ تا دیر اسے دیکھ سکے۔ اس پلاٹ کے آگے جہاں سے گلی شروع ہوتی تھی اس کے سرے پر پان سگریٹ کا ایک کیبن تھا۔ وہ وہاں رک کر سگریٹ خریدتا اور سگریٹ جلا کر وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا۔ فاصلہ کم ہونے کے باعث وہ نہ صرف اسے دیکھ سکتا تھا بلکہ بانسری کی مدھر آواز بھی سن سکتا تھا۔ وہ لنگڑا بچہ اپنی دھن میں بجاتا رہتا اور سارا دن فیکٹری میں اس کے ہونٹوں پر وہ دُھن چڑھی رہتی۔

چار دِناں دا پیار او ربّا...... بڑی لمبی جدائی......لمبی جدائی......

اسے وہ پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی۔ توجہ کی پہلی وجہ تو اس کا اس بھکاری قبیلے سے یکسر مختلف ہونا تھا اور دوسری وجہ اس کا بھی اسے خود کو دیکھتے ہوئے دیکھنا تھا۔ اسے پوری طرح احساس تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے دیکھنے کے لیے کیبن کے پاس رُکتا تھا۔ کبھی وہ براہ راست اسے دیکھ لیتی اور کبھی ایسا ظاہر کرتی جیسے اس کے وجود سے بے خبر ہو۔

ایک دن ایسے ہی کام پر جاتے ہوئے جب وہ کیبن کے پاس رک کر سگریٹ جلا رہا تھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ دیکھ رہی ہے۔ اس نے دیکھا اور اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر ہاتھ کے اشارے سے سلام

کیا۔ وہ مسکرائی اور چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ وہ اس کی دوسری نظر کا منتظر رہا۔ اس نے چہرہ گھمایا اور مسلسل اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اٹھی اور اسی کی طرف چل پڑی۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے قریب سے گزر کر کیبن کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کیبن والے سے اس نے کچھ لیا اور پیسے دے کر ایسے ہی مٹھی بند کیے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ مزید پیچھے ہٹ کر بالکل دیوار سے چپک گیا۔ وہ اس کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا دیکھتے ہو؟'' اس نے آتے ہی سوال داغا۔

''وہ......مم ...... میں......'' وہ گڑبڑا گیا۔ وہ ہنسنے لگی، اور اس کے گالوں میں چھوٹے چھوٹے بھنور کھلنے لگے۔ اس نے پہلی بار اسے اتنا قریب سے دیکھا۔

''تم ادھر رہتے ہونا۔ وہ سامنے اس گلی میں......'' اس نے سڑک کے پار اس کے گھر کی گلی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں......اُدھر غریب آباد میں......'' اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

''ہی ہی ہی ہی ہی......غریب آباد......'' وہ کھلکھلائی۔ ''کیسا عجیب سا نام ہے ناں؟ بھلا غریب بھی کبھی آباد ہوتا ہے؟'' اس نے ہنستے ہنستے کہا اور اپنی مٹھی اس کے سامنے کھول دی۔

''چھالیہ کھاؤ گے؟'' اس کے فقرے پر دھیان کرتے ہوئے اس نے ہتھیلی پر پڑی رنگ برنگی پڑیوں میں سے ایک پڑیا اٹھالی۔

''اور تم جو یہاں رہتی ہو، اس کا کوئی نام پتا ہے؟'' اس نے سر ہلایا اور دلچسپی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ خاصی بے فکر دکھائی دیتی تھی۔

''یہ نشاط آباد ہے۔''

''نشاط آباد کا مطلب پتا ہے؟'' اس نے دانتوں سے چھالیہ کی پڑیا کا کنارہ کاٹا اور اپنے ہاتھ پر چھالیہ انڈیلنے لگا۔

''کک...... مجھے کیا پتا......'' اس نے بے نیازی دکھائی۔

''لو۔'' اس نے ہتھیلی اس کی طرف بڑھائی جس پر چھالیہ کے رسیلے دانے پڑے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ہتھیلی سے چند دانے اٹھائے اور اس کی انگلیوں کا لمس اس کی ہتھیلی سے ہوتا ہوا پورے بدن میں پھیلنے لگا۔ عجیب سی سرسراہٹ تھی جو ہاتھوں اور بازوؤں سے ہوتی ہوئی پاؤں کے تلووں تک پہنچ گئی۔ اس کی سانسیں پہلے ہی بے ترتیب تھیں۔ صبح کا وقت تھا۔ سڑک سے تھوڑی دیر بعد اکا دکا



گاڑیاں گزرتی تھیں۔ اور پھر وہ کیبن والا تھا۔ اسے پتا تھا پان سگریٹ کے کیبن والے ارد گرد کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ اگر کسی نے ٹوک دیا...... کچھ گڑبڑ ہو گئی تو......'' اس کے دل میں اندیشے پھیلنے لگے مگر وہ اس کی صحبت سے محروم بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''کیا مطلب ہے، بتاناں!'' وہ اٹھلائی۔

''ہاں......وہ نشاط آباد کا مطلب ہے خوشی آباد...... جو جگہ خوشی سے آباد ہو۔''

''ہی ہی ہی ہی ہی ہی ہی۔'' وہ ایک بار پھر زور سے ہنس پڑی۔ ''یہ نام رکھنے والے بھی کیسے عجیب لوگ ہوتے ہیں ناں؟'' وہ ہنستی رہی اور اس کے وجود سے پھوٹنے والی مسرت سارے میں پھیلنے لگی۔ اس کے گالوں کے بھنور نیلے پانیوں سے بھرنے لگے۔

''وہ...... ادھر...... غریب آباد ہے جہاں تم رہتے ہو...... اور یہ نشاط آباد...... خوشی آباد...... ہاہاہا......ہی ہی ہی......'' وہ ہنستی رہی اور اس کی ٹھوڑی پر گندے تین ہرے ستارے مسرت کی کرنیں بکھیرتے رہے۔

''یہ......یہ......تمہارا بھائی بہت اچھی بانسری بجاتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں......'' اس نے جواباً اتنا ہی کہا اور دانتوں سے چھالیہ کی پڑیا کا کنارا کترنے لگی۔

''بھائی ہے ناں تمہارا؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں...... دینو...... دینو نام ہے اس کا...... دس سال کا ہے ابھی۔'' اس نے کہا اور چھالیہ کے دانے ہتھیلی پر انڈیلنے لگی۔

''اور تمہارا......مم......مطلب نام؟'' اس نے پوچھا۔

''زینت......زینو کہتے ہیں پیار سے۔'' اس نے کہا اور ہتھیلی اس کے سامنے کر دی۔

''تمہارا نام تو بالکل ٹھیک رکھا ہے جس نے بھی رکھا ہے۔''

''ہی ہی ہی ہی، میری ماں نے رکھا ہے......کیا مطلب ہے اس کا؟''

''اس کا مطلب ہے سجاوٹ، خوبصورتی......''

''تو کیا میں خوبصورت ہوں؟'' اس وقت وہ کوئی چھوٹی لڑکی نہیں لگ رہی تھی پوری عورت دکھائی دے رہی تھی۔''

''ہاں......بہت خوبصورت......'' اس نے اس کی انکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہی ہی ہی ہی ہی......'' وہ ہنستی رہی اور اس کی آنکھوں سے نکلتی روشنیاں اس کے دل میں

اجالے بکھیرتی رہیں۔

''تیرا کیا نام ہے؟''

''میرا نام عمران ہے......اور پیار سے بھی عمران ہی کہتے ہیں۔''اس کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔اس نے چند دانے اٹھائے اور دوبارہ وہی لمس کی سرسراہٹ اس کی انگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی پاؤں کے تلووں تک پھیل گئی۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔کام سے دیر ہو رہی ہے۔''

''باتیں بڑی مزیدار کرتا ہے تُو۔''زینت کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔

''تُو بھی......''اس نے اتنا ہی کہا اور مزید کسی سوال جواب کے بغیر وہاں سے چل پڑا۔وہ وہیں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی اور دھیمے دھیمے مسکراتی رہی۔اس کے گالوں کے گڑھے نیلے پانیوں سے بھر چکے تھے۔اور ٹھوڑی کے تین ہرے ستارے مسرت سے دمک رہے تھے۔سارا دن بانسری کی دھن اس کے اندر گونجتی رہی اور اس کا لمس اس کے وجود میں رقص کرتا رہا۔

''عورت جو ہوتی ہے ناں اسے زندگی کانوں سے اچھی لگتی ہے۔''ظفر بلوچ نے ایسے ہی ایک دن کسی کیفیت میں جھومتے ہوئے کہا تھا۔

''کانوں سے......مطلب......؟''

''عورت کو اچھی باتیں سننا اچھا لگتا ہے۔اس سے اچھی اچھی باتیں کرو تو بہت خوش رہتی ہے۔تم اسے اچھا کہو گے تو وہ اچھی ہو جائے گی،برا کہو گے تو بری ہو جائے گی۔''

''اور مردوں کو......مردوں کو کیا اچھا لگتا ہے؟''اس نے پوچھا۔

''ہو ہو ہو ہو ہو ہو......!''اس نے لمبا کش کھینچا اور اس کی ہنسی اور کھانسی آپس میں خلط ملط ہو گئیں۔کھانسی نما ہنسی اور ہنسی نما کھانسی کے بیچ میں اس نے کہا۔

''مرد کی آنکھ بڑی کافر ہوتی ہے۔کہیں ٹکتی نہیں حرامزادی...... ہر نئی چیز...... ہر نئے رنگ،ہر نئی صورت کے پیچھے بھاگتی ہے۔''

''تو کیا مرد ساری زندگی بھاگتا ہی رہتا ہے۔نئے رنگوں اور نئے چہروں کی تلاش میں؟''

''ہاں......مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں...... پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔''

''آکھوں......آکھوں......آکھوں......!''اس نے کھانسی کو گالی دی اور بولتا رہا۔''میرا باپ سمندر میں جاتا تو مہینوں گھر نہ آتا۔جب آتا تو بڑی بڑی مچھلیاں دکھاتا جو اس نے ماری ہوتیں۔اور



سمندروں کے قصے سناتا جس میں میری ماں کی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔اس کے لیے وہ مچھلیاں تمغے تھے۔اسے کوئی فکر نہ ہوتی کہ ہم نے یہ سارے مہینے کیسے گزارے۔وہ بس اپنی دھن میں رہتا۔میرا دادا بھی ایسا ہی تھا۔نئے پانیوں اور نئی مچھلیوں کی تلاش میں رہتا تھا ہمیشہ۔''

''تم تو ایسے نہیں ہو؟''

''اپن اس لیے ایسا نہیں ہے کہ وہ لوگ ایسا تھا ان کو دیکھ کے ہی تو ہم یہ سب سیکھا ہوں۔''

''ہو ہو ہو ہو ہو ہو......کھوں کھوں کھوں کھوں کھوں کھوں کھوں......!''

''تُو کرتا کیا ہے۔میرا مطلب کام،دھندہ۔''ایک مسرت خیز صبح میں اس نے پوچھا تھا۔

''وہ اُدھر......''اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔''ایک فیکٹری میں چپراسی ہوں۔''اس نے انگلیاں چٹخائیں۔

''تُو مجھے اپنے گھر لے جائے گا؟''اس نے اچانک ایک غیر متوقع سوال داغ دیا۔وہ سٹپٹا گیا۔

''ہیں......میں......میرے گھر......؟''اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔

''رات کو آجاؤں...... جب سب سو رہے ہوں۔''اس نے پوچھا۔

''نئیں......ممم میرا مطلب......گھر میں نہیں......''اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''اچھا میں تجھے اس گلی میں ملوں گی۔جب تُو کام سے آجائے گا......شام کے بعد...... جب اندھیرا ہو جائے گا۔''اس نے اس کے گھر کے ساتھ والی گندی گلی کی طرف اشارہ کیا۔اور مزید کچھ کہے بغیر جھونپڑیوں کی طرف چل دی۔وہ عجیب سی کیفیت لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

فیکٹری میں سارا دن بہت مشکل سے گزرا اور سرِ شام جب ایک ایک کر کے سب کام ختم کر کے جانے لگے تو ظفر نے اسے اشارہ کیا اور کچن کی طرف چل پڑا۔

وہ جب کچن میں داخل ہوا تو ظفر سگریٹ بھر چکا تھا اور اسی کی آمد کا منتظر تھا۔اسے آتے دیکھ کر اس نے سگریٹ جلائی اور دو چار لمبے لمبے کش کھینچنے کے بعد سگریٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

''لو لگاؤ۔''اس نے بغیر کچھ کہے سگریٹ پکڑی اور کش لگانے لگا۔

جب وہ فیکٹری سے نکلا تو شام ہو چکی تھی اور قریبی مساجد میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور ذہن میں زینت تھی۔

اگر وہ سچ مچ آگئی تو......؟اس نے سوچا مگر کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔اس نے سن رکھا تھا کہ یہ بھکاریوں کے گروہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔خاص طور پر اپنی لڑکیوں کے بارے میں۔اور پھر زینت

اسے بتا چکی تھی کہ اس کا باپ کسی قادر خان سے اس کا سودا کر چکا تھا جو منشیات اور اسلحہ بیچتا اور جوئے کا اڈا چلاتا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور وہ سونے کی انگوٹھیاں پہنتا تھا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا، اگر کچھ ہوگیا...... دادی کا کیا ہوگا......؟ بہت ساری باتیں اس کے دماغ میں کلبلا رہی تھیں اور وہ شام کے ملگجی اندھیرے میں اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فیکٹری سے اس کے گھر کا راستہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں تھا وہ پیدل ہی آتا جاتا۔ مگر آج وہ راستہ بہت طویل لگ رہا تھا۔

خیالات اس کے دماغ میں منتشر تھے اور چلتے ہوئے قدم لڑکھڑاتے تھے۔ وہ نشاط آباد میں تھا جہاں شاپنگ سینٹر بننے کی آرزو لیے وہ ادھورا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ اسے سڑک پار کر کے غریب آباد جانا تھا جہاں اس کا گھر تھا اور دادی تھی جو اپاہج تھی۔ اسے دن رات چھپکلیاں ڈراتی تھیں اور اس کے گلے میں ٹوٹی ہوئی رسی خرخراتی تھی۔

''میرا باپ مجھے قادر خان کو دے دے گا۔ پھر بہت دیر ہوجائے گی۔ تُو مجھ سے بیاہ کرلے۔'' اس کی آواز میں اندیشے اور التجا تھی۔

''ابھی نہیں کرسکتا۔'' اس نے انگلیاں چٹخائیں۔ ''ابھی کچھ مسئلے ہیں۔''

''کیا مسئلے ہیں؟ مجھے بتا۔ پیسے چاہئیں؟''

''نہیں، پھر بتاؤں گا۔'' اس نے کہا اور جانے کے لیے قدم آگے بڑھادیئے۔ وہ درد بھری نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔ جب ان کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تو وہ اسے پکارنے لگی۔

''عمران......عمران......عمران......!''

اپنے نام کی بازگشت نے اسے چونکادیا۔ اس نے سر جھٹک کر دیکھا وہ کسی ویرانے میں کھڑا تھا۔ ہوا میں عجیب سے بساندھ بسی ہوئی تھی جیسے کہیں قریب میں کوئی مردہ جلایا جارہا ہو۔ اس نے اوپر دیکھا مگر اسے آسمان نظر نہ آیا۔ اوپر بہت سے کالے پرندے تھے جن کے پر بڑے تھے اور پنجوں کی انگلیاں لوہے سے بنی لگتی تھیں۔

اس کے اندر پیاسے اونٹ ہانپ رہے تھے۔ اس نے گلے پر ہاتھ پھیرا۔ پیاس کی شدت سے اس کا حلق چیخ رہا تھا۔ وہ بغیر کسی سمت کا تعین کیے سامنے کی طرف دوڑنے لگا۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر گر گیا۔ زمین پر موٹی موٹی زرد اور کالی چھپکلیاں رینگ رہی تھیں اور چھپکلیوں کی کٹی ہوئی دمیں پھڑکتی تھیں۔ ہوا کہیں چھپ گئی تھی اور سانس لینا محال تھا۔

وہ کوشش کر کے اٹھا اور پھر بھاگنے لگا۔ کوئی عورت تھی جس کی درد میں ڈوبی آواز مسلسل اسے پکار



رہی تھی اور وہ بھاگتا چلا جارہا تھا۔ آواز کہیں قریب سے ہی آرہی تھی۔ اسے پھر ٹھوکر لگی اور اس نے گرنے سے بچنے کے لیے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ کوئی دیوار تھی جسے لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ نے تھام لیا۔ اس کے گھٹنوں سے ٹکراتی لکڑی کی چارپائی تھی اور اندھیرا شدید ہورہا تھا۔ وہ دادی کی چارپائی کے قریب کھڑا تھا۔ شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ اس نے ٹٹول کر جیب سے ماچس نکالی۔ تیلی جلا کر اس نے دیکھا۔ دادی کی آنکھیں بند تھیں اور منہ سے عجیب سا مادہ بہہ رہا تھا۔ ہوا میں ایسی بساندھ تھی جیسے کہیں قریب ہی کوئی مردہ جلایا جارہا ہو۔ اس نے دادی کے بدن پر لپٹی چادر ہٹائی تو ٹپ ٹپ کر کے بہت سے چھپکلیاں زمین پر گرنے لگیں۔ تیلی آخر تک جل چکی تھی اور اب آگ کی حدت اس کی انگلیوں کو جلاتی تھی۔ اس نے ہاتھ جھٹک کی تیلی کا بچا ہوا حصہ نیچے پھینکا اور دوسری تیلی جلائی۔ اس کے پیروں میں چھپکلیاں رینگ رہی تھیں۔ اور دادی کی چارپائی پر بھی چھپکلیوں کی بہتات تھی۔ اس نے دادی کے بے جان چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا دل حلق میں آگیا اور آنکھیں دھندلی ہونے لگیں۔ اس نے تیلی زمین پر پھینکی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، باہر حبس تھا......اور خاموشی......ایک عجیب سی گھنی اور موت زدہ خاموشی......وہ گلی میں بھاگتا گیا۔ سامنے غریب آباد اور نشاط آباد کو علاحدہ کرنے والی سڑک کے اس پار جہاں سے نشاط آباد شروع ہوتا تھا۔ شاپنگ پلازہ نہ بن سکنے والی عمارت کا ٹیڑھا سا افسردہ ڈھانچہ کھڑا تھا۔ اور زمین پر بکھرے عارضی چولہوں سے دھیما دھیما دھواں اٹھ رہا تھا۔

◄ ● ►

Allah wala House
H number 34-B/4 Near Asna Ashri Masjid
C-1 Area Liaqat Aabad. karachi number 19
postal code 75900


| | |
|---|---|
| نام کتاب : پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں | نام کتاب: پیچھا کرتی آوازیں |
| شاعر : حنیف ترین | مصنف : نعیم بیگ |
| سن اشاعت : ۲۰۱۶ء | سن اشاعت: ۲۰۱۶ء |
| قیمت : ۳۰۰/روپے | قیمت : ۳۴۵/روپے |
| ملنے کا پتہ : کتاب نما، جامعہ نگر نئی دہلی | ملنے کا پتہ: پبلشنگ ہاوس UOM&T لاہور |

## • سلمیٰ جیلانی

# سسکیاں

میں کوئی عام فوٹو گرافر نہیں، جنگ اور اس کی ہولنا کیوں کو تصویر کرنا میرا ہنر ہے۔ جتنا زیادہ دل فگار منظر ہو کیمرے کی آنکھ میں قید کر کے دنیا میں آ گاہی پھیلانے کو اتنی ہی موثر چوٹ لگا تا ہوں۔ میری تصویریں امن کے لئے کام کرنے والی تنظیمیں اپنے بینرز پر سجاتی ہیں۔ایسے ہی ایک مشن پر اپنے شکار کی تلاش میں بھٹکتا ہوا حالیہ خانہ جنگی کے دوران بے گھر ہو جانے والے پناہ گزینوں کے کیمپوں کی طرف آ نکلا تھا۔ چھوٹے بڑے ترپال کے لاتعداد بوسیدہ خیموں کی قطاروں کے درمیان پھٹے حالوں میں کھیلتے ہوئے بچوں میں سے ایک، پانچ چھ برس کی ننھی لڑکی پر میری نگاہ جم گئی۔ میں نے سوچا......ہمم...... یہ بالکل مناسب ہدف ہے۔ میں اپنی ویب سائٹ کے کور پر لگاؤں گا تو دنیا چونک اٹھے گی، لیکن......اس بچی کے چہرے میں جانے ایسا کیا تھا کہ میں اپنی کاروباری سوچ پر خود ہی شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ بچی اتنی چھوٹی تھی کہ اس کی تصویر لینے کے لیے اس کے والدین کی اجازت لینا ضروری تھا جو میرے پروفیشنل طریقہ کار کا لازمی جزو تھا۔ میں نے بچی کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف متوجہ کیا، وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔

''تمہاری ماں کہاں ہے؟'' یہ سننا تھا کہ بچی کا چہرہ یکسر پیلا پڑ گیا اور اس کی آنکھوں میں اتر آنے والی خوف کی پرچھائیوں نے جیسے مجھے لرزا کے رکھ دیا۔ وہ تڑپ کے بولی۔

''کیوں؟؟؟ تم میری ماں کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس کی آواز میں ارتعاش اس بات کا غماز تھا گویا وہ بے اندازہ طور پر ڈر گئی تھی۔ ابھی میں اسے مطمئن کرنے کو مناسب جواب سوچ ہی رہا تھا کہ ساتھ والے خیمے کا پردہ ہٹا اور کسی نے آدھا چہرہ نکال کر جھانکا......وہ شائد اسی بچی کی ماں تھی۔ میں نے جلدی سے اپنا اجازتی کارڈ دکھایا اور پیشہ ورانہ انداز میں اپنے آنے کا مقصد بتا کر اس کے یہاں تک پہنچنے کا احوال پوچھنے لگا۔ درمیانی عمر کی پریشان حال، ملگجے کپڑوں میں ملبوس اڑی ہوئی رنگت والی خاتون جو کبھی گوری چٹی اور خوشحال رہی ہو گی جیسے منتظر ہی تھی کہ کوئی اس کا حال پوچھے۔ اس نے تو کسی توقف کے



بغیر ہی اپنی داستان غم سنانا شروع کر دی۔

''ہمارے شہر میں لڑائی تو کئی سال سے ہو رہی ہے......جانے کس بات پر......وہ پہلے بھی میرے بھائیوں اور چچا کے بیٹوں کے سر کاٹ چکے تھے......میرے چھوٹے بھائی کو تو وہ میری بچی کے سامنے سے گھسیٹتے ہوئے لے کر گئے اور گلی میں لے جا کر اسے بکرے کی طرح ذبح کر ڈالا. تھا......آہ......کیا کیا بتاؤں......وہ کتنے ظالم ہیں۔'' وہ سانس لینے کو رکی اور پھر کسی بریک فیل ہو جانے والی ریل گاڑی کی طرح ٹوٹی پھوٹی پٹڑیوں پر رواں ہو گئی......

''ہم ہر دن ایک ڈر کے عالم میں جی رہے تھے......لیکن اس رات جب ہماری گلی میں بھی بکتر بند گاڑیاں گھس آئیں اور آسمان سے اتنے گولے برسے کہ سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن گیا......ہمارے گھر کی پچھلی چھت بھی گر گئی......میں، میرے دونوں بچے، میرا شوہر اور اس کے بھائی کے گھر والے سب ایک چھوٹے سے کمرے میں ساری رات چھپے بیٹھے رہے...... پھر پوٹلیوں میں تھوڑا کھانا بھر کر ہم جنگلوں میں بھاگ نکلے۔'' وہ اب خلاؤں میں جھانک رہی تھی اور اس کی آنکھوں کی ویرانیاں آدھے لپٹے ہوئے چہرے کے باوجود اپنے اطراف کو ایک عجیب سی اداسی میں مبتلا کر رہی تھیں۔ حالانکہ دن کافی روشن تھا اور سورج ہمارے سروں پر اپنی تمام تر تمازت کے ساتھ براجمان تھا لیکن پھر بھی مجھے ایک دم سے گہرے اندھیرے کا احساس ہوا......میں نے آنکھیں ملیں اور اس کی طرف دیکھا وہ بھی اپنی آنکھوں میں آ جانے والے آنسو پوچھ رہی تھی۔ وہ پھر گویا ہوئی۔

''ہمارے ساتھ اور بھی بہت سارے لوگ تھے جو بھاگ رہے تھے......اندھا دھند......پھر ہم بارڈر کے قریب پہنچ گئے......وہاں لگی خاردار تاروں کی باڑھ میں پہلے ہی سے بنے راستوں کو کشادہ کرنے میں کئی نوجوانوں نے ہمیں وہاں سے نکالنے میں مدد کی......میرے شوہر نے بچوں کو کسی کھلونے کی طرح اچھال کر کھائی کے اس پار میرے دیور کی گرفت میں دے دیا......ایک لمحے کو تو لگا جیسے مریم کھائی میں ہی گر گئی۔'' میں نے نوٹ کیا اس نے پہلی بار بچی کو نام سے پکارا تھا......وہ پھر خواب ناک لہجے میں بولی۔

''میرا دل دہل گیا اور میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ لیکن پھر دیکھا......میرا دیور اسے کندھے پر بٹھائے ہوئے تھا۔'' وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھتی اور خدا کا شکر ادا کرتی جاتی۔

''ہم نے سب سے محفوظ راستہ اپنایا مگر ہمیں وہاں کی پولیس کا بھی ڈر تھا کہیں وہ ہمیں نہ دیکھ لیں ورنہ پکڑ کر واپس وہیں بھیج دیئے جائیں گے جو پہلے ہمارا گھر تھا لیکن اب جلتا ہوا جہنم ہے۔ میری پڑوسن اور اس کے بچے تو کشتی سے نکلے تا کہ پولیس سے بچ سکیں۔ مگر پتا نہیں ان کا کیا ہوا۔ میرے شوہر نے بھی ساری

جمع پونجی کشتی والوں کو تھمادی تھی لیکن ہم میں سے کسی کو بھی تیرنا نہیں آتا۔ میں نے ضد کی اور شکر ہے کہ اس بار مجھ سے بھی کہیں زیادہ ہٹ دھرم آدمی نے میری بات مان لی اور ہم سب کو بچانے کو میلوں پیدل چلنے کا فیصلہ کیا'' وہ اپنی بپتا پوری جزئیات کے ساتھ سنا رہی تھی۔ ''پوٹلیوں میں بچا ہوا کھانا تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ جنگل کی خوف ناک فضاء چاند کی روشنی میں اور بھی پراسرار ہوتی جاتی تھی۔ چھوٹا زویاں میرے کندھے سے اترنے کو ہی تیار نہ تھا۔ میرے بازو شل ہو گئے تھے۔ میرا شوہر مریم کو گود میں اٹھائے ہوئے تھا اور باقی لوگ آگے نکل گئے تھے۔ ہم ان سے کافی پیچھے رہ گئے۔'' اس کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا۔ پھر اس نے جھرجھری لی جیسے کوئی دل دہلانے والی یاد سے پیچھا چھڑا رہی ہو۔ اب اس کے چہرے پر بیک وقت غصے اور اطمینان کے ملے جلے گدلے اور صاف رنگ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ اس کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ میرے لے یہ سب کچھ نیا نہ تھا۔ یہاں آنے والے ہر شخص کے پاس ایسی یا اس سے بھی زیادہ ہولناک کہانیاں تھیں۔ اسی دوران میں نے اس بچی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی بچوں والی جون میں واپس آ چکی تھی اور دوسرے بچوں کے ساتھ زمین پر پڑی ٹھیکریوں کو جوڑ کر کچھ بنانے میں لگی تھی۔ اب وہ کھلکھلا رہی تھی اور اس کی آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ زمین سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی پردے سے لگی ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ماں نے اس کے سر پر ہلکے سے چپت لگائی اور پیار سے اس کے بال سنوارے۔ بچی اب اس کی گردن میں بانہیں ڈالے جھول رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ماں کو اور پھر مجھے دیکھا...... اس کی آنکھوں میں روشن ستارے جگمگا رہے تھے۔

یہ تو میں بتانا ہی بھول گیا وہ بچی اس کی نہیں تھی۔ مریم کی ماں نے اسے جنگل سے گزرتے ہوئے ایک پیڑ کی کھوہ میں سے اٹھایا تھا اور اپنے ساتھ یہاں لے آئی۔ معلوم نہیں اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہو گی۔ مگر...... اس رات جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو میری نظر کے سامنے بچی کا وہی خوف سے ستا ہوا چہرہ تھا اور اس کی آنکھوں میں رگوں میں خون کو منجمد کر دینے والا ڈر تھا جب پہلی بار اس کی ماں کے بارے میں سوال کیا تھا۔

◄◄ ● ►►

147-Whitney Street
Blockhouse
Post Code-0600
Auckland,Newzealand



## ● نسترن احسن فتیحی

# نسل

جدنی محتاط قدموں سے آفیسرز کیمپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سہمی ہوئی نظروں سے وہ چاروں طرف کسی کسی وقت دیکھ لیتا جہاں کے ہر شجر و پتّے، ٹیلے اور میدان، چرند و پرند اس کے جانے پہچانے تھے۔ جہاں کی ہوا اسکی سانسوں کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ جہاں کے پانیوں کی کل کل اس کا آئینہ تھی۔ وہی علاقہ آج اس کے لیے کتنا اجنبی ہو گیا تھا...... بلکہ اجنبی کر دیا گیا تھا۔ یہاں سے تاڑ کے پیڑوں کے جھنڈ کے بیچ بنی اس کی جھونپڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ بائیں طرف ایک ٹیلا اور دائیں طرف کچھ دور تک پھیلا ناہموار میدان...... کچھ لوگوں کی زندگیوں کی طرح جس میں کوئی بھی قدم سیدھا نہیں پڑتا، حالانکہ پہرے پر بیٹھے سپاہیوں نے اسے کئی بار دھتکارا تھا۔

''ادھر بھول سے بھی پیر مت رکھنا...... شکاری سمجھ کر گولی چلا دی تو رونے کا بھی وقت نہیں ملے گا۔''

مگر ضرورتوں کے لاتعداد گھڑیال اپنے خوفناک پیلے دانت دکھا دکھا کر اسے موت کے اسی کنویں کی طرف دھکیلتے تھے۔ شاید اسی کنویں سے اسے ایک چلّو پانی ملنے کی آس تھی۔ آفیسرز کیمپ کے پیچھے سے جنگل شروع ہوتا تھا جسے فی الحال احتیاطی تدابیر کے طور پر خاردار تاروں کی باڑ نصب کر کے محفوظ کیا گیا تھا۔ باڑ کے اس طرف دس بارہ فٹ گہرے گڑھے کھود دیے گئے تھے۔ یہ ساری حفاظتی کارروائی اس شیر اور شیرنی کو جوڑے کے لیے کی گئی تھی جو ایک کمیاب نسل تھی اور یہ نسل ختم ہونے پر آ گئی تھی۔ سب سے پہلے پاس کے گاؤں والوں نے سمڈ یگا سے ذرا دور جہاں جنگل شروع ہوتے تھے اس نسل کے ایک شیر کو مردہ پایا...... سیدھے سادھے گاؤں والوں کو بھی اب ان حیوانوں کی اہمیت کا اندازہ تھا اس لیے انہیں مردہ شیر کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور فکر بھی۔ شیر آخر مرا کیسے؟ یہاں کے باشندے اور جانور کبھی ایک دوسرے کی طرز زندگی میں مخل نہ ہوتے تھے۔ معاملات کی سنگینی کا اندازہ کر کے کچھ گاؤں والوں نے قریب کے تھانے میں خبر کر دی۔ پہلے تو پولیس نے معمولی کاروائی کی پھر نہ جانے کیا ہوا پورے پولیس کے عملے کے ساتھ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پھر اس صوبے کے گورنر سب حرکت میں آ گئے۔ جدنی کو صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ ایک شیر کی موت نے اس گاؤں کی کایا پلٹ دی تھی۔ وہی سڑک، وہی میدان، وہی جنگل، وہی آسمان اور وہی زمین...... مگر حالات یکسر بدل گئے تھے۔ جب سے ان کے چہار طرف بکھرے

قدرتی وسائل پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ جدنی کو لگ رہا تھا کہ زمین ان کے لیے سخت اور آسمان گرم ہو گیا ہے۔ اپنے ہی علاقے میں وہ نظر بند تھے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ جنگل کا بڑا حصّہ خاردار تاروں سے گھیر دیا گیا تھا۔ انہیں ایک کونے میں سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ آزادی سے اب ندی کے کنارے گھوم بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ شک کے گھیرے میں تھے...... کہیں کوئی اس پانی کو زہر آلود نہ کر دے۔ نہ جانے کتنے لوگ ان حالات سے تنگ آ کر یہ علاقہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ برسہا برس سے رہنے والے لوگ اگر جا رہے تھے تو دوسری طرف آفیسرز کیمپ لگائے جا رہے تھے۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ کالے کالے ننگ دھڑنگ وجود کی جگہ، رنگ برنگی پوشاکوں کے لہرانے کا سماں تھا۔ کڑوے کالے دھوئیں کے ساتھ ابلتے ہوئے بھات (چاول) کی جگہ، سرخ شعلوں کے درمیان بھونے جانے والے گوشت کی بو فضاؤں میں بکھر رہی تھی...... ساتھ ہی میوزک، قہقہے، پکنک اور خیرہ چشم زیورات، قیمتی ملبوسات، چہرے سے زیادہ چمکتے ہوئے ہیرے اور کندن کے آویزے...... گویا اسی طرح کی رنگ بھری اور امنگ بھری محفل۔ جدنی کی سمجھ میں کیا آتا...... نہ جانے کون تھے یہ لوگ؟ کیوں آئے تھے......؟ جدنی نے تو کبھی ایسی دنیا نہیں دیکھی تھی۔ اس کی دنیا تو اس کی جھونپڑی میں تھی جس کے لیے وہ اس ناسازگار ماحول کو چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی مہوا جو پیٹ سے تھی...... دو قدم بھی چلنے سے قاصر تھی تو دو کوس کیسے چلتی؟ اس لیے وہ یہیں جما ہوا تھا۔ اور آج آس کی ایک ڈور تھامے اس اجنبی ماحول کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کیوں کہ اتنے دنوں میں اسے سبھاش بابو کا بڑا سہارا ہو گیا تھا۔ وہی سبھاش بابو جو سب لوگوں کے ساتھ شہر سے آئے تھے۔ لیکن اب اسے وہ سب کی طرح بالکل اجنبی نہیں لگتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔

''کیمپ میں آئے ہوئے لوگوں کی چاکری (مزدوری) کر لو گے تو دو جوم (وقت) کے کھانے کا بندوبست ہو جائے گا۔'' اور آج تو مہوا تکلیف میں تھی۔ سبھاش بابو سے سنا تھا اس نے کہ شہر سے دیونا (ڈاکٹر) بھی آیا ہے۔ وہی کوئی دوائی دے تو کچھ آرام مل جائے اس کی مہوا کو۔ مہوا کی تکلیف کا خیال کرتے ہی وہ تیز قدم اٹھانے لگا۔

مہوا نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھ سے تھام کر دیکھا...... آج جیسے سارا بوجھ نیچے سرک گیا ہو۔ اسی لیے پیڑو اس بوجھ سے پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی اندر بیٹھا آری چلا رہا ہو۔ وہ درد کی چبھن سے پریشان ہو کر جھونپڑی کی نم آلود زمین پر بیٹھ گئی اور دیوار کا سہارا پیٹھ کو دیتے ہوئے دونوں پیر پھیلا دیئے۔ اماں تو کہتی تھی کہ جب زچگی کے دن قریب آتے ہیں تو پیٹ لٹک جاتا ہے، مگر ابھی تو اسکا ان گنا مہینہ ہی چل رہا ہے...... پھر...... یہ تکلیف؟ اس نے ہاتھ سے پیٹ کو سہلایا جیسے درد کو اپنے چنگل میں کرنا چاہتی ہو۔ اور دوسرے ہاتھ کے ناخن سے لاشعوری طور پر زمین کی مٹی کریدتی رہی۔ اس کی نظریں بار بار جھونپڑی



کی در کی طرف اٹھ جاتیں۔ جہاں نہ کوئی پردہ تھا نہ کوئی دروازہ۔ بس گھاس اور پھوس کی دیواروں کے بیچ باہر اندر کرنے کے لیے تھوڑی کھلی جگہ چھوڑ دی گئی تھی اور اس کی بے چین نظریں اس طرف بار بار اٹھ رہی تھیں۔ وہ کسے پکارے؟ پانی کے لیے حلق خشک ہو رہا تھا۔ جدنی اسے تسلّی دے کر گیا تھا کہ جلدی لوٹے گا پر ابھی تک...... جبکہ اسے معلوم ہے کہ کاکی بھی چلی گئی...... گاؤں سے لوگوں کا ایک ہجوم روز ہی نکل جاتا ہے۔ سب کو اپنی پڑی ہے۔ سب پولیس اور شہری بابوؤں سے ڈرتے ہیں۔ ارے صاف صاف کہہ دیں ہم نے نہیں مارا شیر کو، بلکہ ہمارے یہاں پر رہنے سے شکاری لوگ ڈرتے ہیں جنگل کا رُخ کرنے سے۔ ہماری وجہ سے تو ان کی اور حفاظت ہوتی ہے...... پر سب ڈرپوک ہیں سالے۔ اب مصیبت میں وہ کیسی نپٹ اکیلی رہ گئی ہے۔ اس نے بے چین ہو کر سر سہلایا۔

''بوہسوتنا، (میرا سر درد کر رہا ہے)۔'' اس کی بڑبڑاہٹ بڑی واضح تھی۔ خود ہی چونک کر ہنس پڑی۔ کسے سنا رہی ہے اپنی تکلیف۔ وہ اٹھی اور پانی کا لوٹا اٹھا کر حلق تر کیا اور جھونپڑی سے باہر نکلی۔ دور دور تک جدنی آتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ وہ کوئی پہلا بچہ تو جننے جا نہیں رہی تھی، یہ تیسرا تھا یہ اور بات ہے کہ اب بھی اس کی عمر اتنی کم ہے کہ شہری لڑکیوں کی شادی اس عمر میں کوئی سوچتا تک نہیں۔ اس کی شادی بھی تو جدنی سے تیرہ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی اور سترہ سال کی عمر میں وہ پہلی بار ماں بن گئی۔ پھر یہ سلسلہ ہر سال چل پڑا۔ صرف انیس سال کی عمر میں وہ تیسری بار ماں بننے جا رہی تھی۔ اب یہ تیسرا بچّہ تھا اس لیے اسے تجربہ تو تھا ہی اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اب یہ تکلیف رکنے والی نہیں۔ اس ہون (بچہ) کو دنیا میں آنے کی بڑی جلدی ہے۔ جیسے اس کے ذات برادری والوں کو بھی ہر بات کی ہمیشہ جلدی رہتی ہے۔ شادی بیاہ کی جلدی...... بوڑھے ہونے کی جلدی...... اسی طرح مرنے کی جلدی۔ اب ایک معمولی سے واقعے پر گاؤں چھوڑنے کی جلدی۔

جدنی کیمپ کے پاس پہنچا تو دیکھا سبھاش بابو کئی لوگوں کی ساتھ کرسیوں پر بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ وہ ایک کنارے کھڑا ہو گیا اور جب سبھاش کی نظر اس پر پڑی تو بڑے احترام سے اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دئے۔ سبھاش نے سر کی جنبش سے جواب دے کر اشارہ کیا کہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرے اور باتوں میں پھر سے لگ گیا۔ جدنی تھوڑے فاصلے پر اکڑوں بیٹھ گیا اور بے دلی سے باتیں سننے لگا۔ دراصل مہوا کا تکلیف سے سیاہ پڑتا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے سبھاش کی طرف دیکھا۔ مگر وہ بہت زور و شور سے کسی بحث میں مصروف تھا اور ساتھ ہی کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا۔ جدنی کو یاد آیا کہ سبھاش بابو نے بتایا تھا کہ وہ کسی اخبار کے دفتر میں کام کرتے ہیں اور آج کل یہاں کی خبروں کی رپورٹ تیار کر کے بھیجتے ہیں۔ اس وقت بھی موضوع بحث وہی شیر تھا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے۔

''یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ان تسکروں کا ساتھ یہاں کے کچھ مقامی لوگ دے رہے تھے کہ نہیں، کیونکہ اب شیر کی کھال کے علاوہ اس کی ہڈی، بون میرو اور چربی اور مختلف حصوں کی بڑھتی مانگ اور قیمتوں کی وجہ سے شیروں کا غیر قانونی شکار بڑھ گیا ہے،اور اگر مقامی لوگوں نے اس کام میں ان کا ساتھ دیا ہے تو ہم ان کے ذریعے ہی تسکروں کے اس گینگ تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔''

''پر اب یہ کام بہت مشکل ہے زیادہ تر لوگ گاؤں چھوڑ کر جا چکے ہیں، کیونکہ یہاں کے مقامی لوگوں کی زندگی کا انحصار اسی جنگل پر ہی تھا جہاں اب ہمارے اینٹی پوچنگ اسکوائیڈ کی تعیناتی کر دی گئی۔اور اس حصّے میں داخل ہونا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔'' سبھاش نے کہا پھر اسے جدنی کا خیال آیا تو اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔اس کے قریب پر آنے پر سبھاش نے کہا۔

''صاحب لوگوں کو اپنا نام بتاؤ۔'' جدنی کی گھبراہٹ بھانپ کر اس نے پھر کہا۔''تُتم تُتم؟ (نام نام)۔''

''جدنی...... صاحب!'' اس نے بہ مشکل کہا۔ پھر سب اس سے تھوڑی دیر تک چند سوالات کرتے رہے اور وہاں سے اٹھ گئے۔صرف سبھاش وہیں جما رہا۔اس نے جدنی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔جدنی نے کندھے پر اپنا انگوچھا برابر کیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔

''سب ٹھیک تو ہے؟'' سبھاش نے نرمی سے پوچھا۔

''نہیں صاحب! مہوا کی پیڑا (تکلیف) بڑھ رہی ہے۔کوئی دوائی کا جوگاڑ (انتظام) ہو جاتا تو...... اب تو ہم جنگل سے جڑی بھی نہیں لا سکتے نا صاحب! اور ہمارے واسطے کونو (کوئی) کام بھی ہو صاحب تو......''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔میں نے بات کر لی ہے۔کچھ تو تم یہاں کا چائے، پانی کا کام دیکھ لینا۔ لیکن تمہارا ایک اہم کام یہ ہے کہ تم جنگل کے چپے چپے سے واقف ہو،اس لیے جب گشت پر نکلنا ہوگا تم ہماری مدد کے لئے ساتھ رہو گے۔''

''بڑی کرپا صاحب۔'' جدنی احساس تشکر کے بار سے دب گیا۔

''اور سنو یہاں ہم اپنے آدمیوں سے تمہاری پہچان کروا دیں گے۔تم بھی نظر رکھنا کہ کوئی باہر کا آدمی ادھر آ کر شیرنی کو نقصان نہ پہنچائے۔اسکو بچہ ہونے والا ہے۔اگر اسے نہ بچایا گیا یہ نسل ختم ہو جائے گی......سمجھ گئے نا؟ اچھا چلو اب تمہاری مہوا کو دیکھ آئیں اور اس کے لیے کچھ دوا بھی میں اپنے دوست سے تمہیں دلوا دیتا ہوں۔'' پھر دونوں مہوا کا حال بتا کر چند دوائیوں کے ساتھ جھونپڑی پر واپس آئے تو دیکھا مہوا کا درد سے برا حال تھا۔جدنی نے جلدی سے اسے درد روکنے کی دوا کھلائی اور سبھاش سے التجا کی۔



''صاحب......! یہاں تو یہ اکیلی یہ مر جائے گی۔جنگل سے ہو کر ایک سیدھا راستہ جاتا ہے جو چھوٹا پڑے گا۔آپ کی کرپا ہو تو ہمیں اس سے جانے کی انومتی دلوا دیں۔پھر میں اسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ کر لوٹ آتا۔'' جدنی کی آنکھوں میں جو بے چارگی تھی اس نے سبھاش کو پگھلا دیا۔اس کی نظر میں یہ ایک مشکل کام تھا مگر اس نے حامی بھر لی اور کہا تھوڑی دیر انتظار کرے،وہ کاروائی پوری کروا کر آتا ہے۔سبھاش کے جانے کے بعد جدنی نے اپنی کمسن بیوی کے سیاہ پڑتے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

''تھوڑا جوم (کھانا) لے گی؟''

''نہ رے......اس دوائی سے تھوڑا چین ملا ہے۔'' مہوا نے کمزور آواز میں کہا۔

''اچھا، اب تھوڑا آرام کر......اماں کے پاس چلنے کے لیے تجھے ہمت کرنا ہے۔ورنہ یہاں اکیلی کیا کرے گی اس گھڑی۔''

''یہ اتّے سارے لوگ یہاں کیا کرنے آئے ہیں رے جدنی۔'' مہوا نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''کیا کرے گی سن کر...... وہی شیر جو مر گیا ہے نا......اس کی نسل بچانے آئے ہیں۔شیرنی گابھن ہے۔تجھے معلوم ہے سبھاش بابو بات کر رہے تھے کہ اس کے ایک بچے کی قیمت سات لاکھ روپیہ ہوگی۔ اگر کوئی چڑیا گھر والا اس کو پوسنے کے لیے لے جائے گا تو سرکار کو سات لاکھ روپیہ دے گا۔''

''سات لاکھ؟ باپ رے......ای سات لاکھ سمجھنے کے لیے تو ہمیں سات جنم لینے پڑیں گے۔ہم تو جانوروں سے بھی برا بھاگ لے کر آئے ہیں رے جدنی!'' مارے غم کے اس کی آنکھوں کے کور بھیگنے لگے۔

''ہاں! جانتی ہے ہم تو تو بتا بھی نہیں سکتے کہ ای ہمرا تیسرا بچہ ہے۔''

''کاہے!''

''سبھاش بابو نے منع کیا ہے بتانے سے...... کہہ رہے تھے کہ قانون بن گیا ہے کہ جس گھر میں تیسرا بچہ جنمے گا اس کو نہ سرکاری کام ملے گا نہ کوئی اور سہولت، نہ دوائی، نہ ڈاکٹر۔اور او ہم کو کام دلوانے کا وعدہ کئے ہیں۔''

صدمے اور حیرانی سے مہوا گنگ رہ گئی۔

◀◀ ● ▶▶

"Lisan"
Road No:5
Iqra Colony
New Sir Syed Nagar
Aligarh(U.P)

## ● نوشابہ خاتون

# خلیج

بچی رورو کر بے حال ہورہی تھی۔

''پاپا! میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ پاپا میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' اس کی بس یہی ایک گردان تھی۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ دل پر ایک بھاری بوجھ لیے، رومال سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے اسے خود سے جدا کرنا پڑا تھا۔ رومانہ نے بھی اپنی آنکھوں میں بے ساختہ اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا اور اسے خدا حافظ کہا۔ بچی کچھ دیر تک تو روتی رہی۔ پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔ لیکن اب بھی اس کی سسکیاں بند نہیں ہوئی تھیں۔

جہاز رن وے سے اُٹھ کر اب ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا اور وہ لمحہ بہ لمحہ اس جگہ سے دور ہوتی جارہی تھی جہاں اس کا محبوب تھا اور جس کے لیے اس نے اپنا تن من سب کچھ ہار دیا تھا۔ بہت ساری یادیں اس کے ذہن میں گڈ مُڈ ہورہی تھیں۔ سات سال قبل اسی ایئر پورٹ پر اس کے جہاز نے لینڈ کیا تھا۔ وہ پُر اشتیاق نظروں سے اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جو کبھی اس کے والدین کا وطن ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب تو اس ملک کو خیر آباد کیے ہوئے بھی برسوں بیت گئے تھے۔ حالانکہ امی کو اپنے وطن سے بہت پیار تھا۔ یہاں کے ذرے ذرے سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ اسی سرزمین پر وہ پل بڑھ کر جوان ہوئی تھیں۔ یہاں سارے اپنے پرائے خوشی اور غم بانٹنے والے موجود تھے۔ اب بھی جب وہ اپنے وطن کو یاد کرتی ہیں تو دل سے بے اختیار ایک آہ سی نکل جاتی ہے اور ان کے چہرے پر حزن وملال چھا جاتا ہے۔ لیکن وہ مجبور تھیں کیونکہ ابا ایک بار جو فیصلہ کر لیتے تھے وہ اپنی جگہ اٹل ہو جاتا۔ اس میں کسی ردو بدل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور آج عرصہ بعد اس پیاری سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے خوشی سے ان کا چہرہ گلنار ہورہا تھا۔ امیگریشن کاؤنٹر سے گزر کر سب لوگ باہر نکلے۔ ڈرائیور انتظار میں کھڑا تھا۔ ساتھ ہی ایک کزن بھی تھا جسے وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ لیکن ان لوگوں کی اتنی تصویریں اس کے البم میں لگی تھیں کہ اسے ان لوگوں کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ خالہ امی کا چھوٹا بیٹا احمر تھا۔ اس سے بڑے ارشد بھائی تھے جن کی شادی میں شرکت کی غرض سے وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ احمر



نے نہایت خندہ پیشانی سے سبھوں کا استقبال کیا۔ سلام ودعا کا تبادلہ ہوا۔ پھر سب منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ سبھوں نے اپنی اپنی سیٹ سنبھالی۔ احمر ڈرائیور کے بغل میں بیٹھا۔ وہ وقفے وقفے سے پلٹ کر امی سے کوئی سوال کرتا اور اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتا۔ گھر پر بھی سب لوگ چشم براہ تھے۔ ان لوگوں کے پہنچتے ہی ملنے ملانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک مدت کے جمع شدہ آنسو تھم ہی نہیں رہے تھے۔ گھر میں شادی کی گہما گہمی شروع ہوگئی تھی۔ روز ہی کوئی نہ کوئی رسم انجام پاتی۔ جب ماموں اور ممانی اور ان کے بچے آجاتے تو رونق اور بھی بڑھ جاتی۔ اسے اس بات نے کافی متاثر کیا کہ یہاں کوئی بھی کسی پر اپنی امارت کی دھونس جمانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ ان کے رویئے میں بہت ہی خلوص، اپنا پن اور سادگی جھلکتی تھی۔ ارشد بھائی تو نہایت خاموش طبع، خود کو لیے دیے رکھنے والے تھے لیکن احمر بہت ہی پُر مذاق، ہنسنے ہنسانے والا زندہ دل انسان تھا۔ لطیفہ گوئی اس کی ہابی تھی۔ وہ کسی کو بھی نہیں بخشتا...... چاہے وہ خالہ جان ہوں یا ممانی جان ...... بھاوج ہوں یا بہنیں۔ اس سے تھوڑا لحاظ کرتا کیونکہ وہ ابھی اس سے کھلی نہیں تھی۔

لیکن کب تک......دل کہاں مانتا ہے۔

''ارے رومانہ! ذرا سنو بھئی!! کبھی اس غریب کو بھی تو لفٹ دیا کرو۔''

''آپ کو لفٹ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ تو خود ہی ہماری محفلوں میں گھسے رہتے ہیں۔''

''لو، اور سنو۔ یہ تو نیکی برباد اور گناہ لازم والی بات ہوگئی۔ یہ نہ کہا کہ آپ ہماری محفل کو گل گلزار بنا دیتے ہیں۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ میرا ملک تمہیں کیسا لگا؟''

''میرا نہیں، ہمارا کہیے جناب! یہ کبھی ہمارا ملک بھی تھا۔''

''تھا ناں، اب تو نہیں رہا۔ ویسے تم چاہو تو اب بھی اسے اپنا ملک بنا سکتی ہو۔''

''نہیں بھائی! میں جہاں ہوں وہیں ٹھیک ہوں۔ اور پھر میں اپنے والدین کو چھوڑ کر یہاں کیوں رہوں؟''

''والدین کو تو ایک نہ ایک دن ہر لڑکی کو چھوڑنا پڑتا ہے۔'' احمر کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''چھوڑیئے ان فضول باتوں کو۔ مجھے جانے دیجئے۔ بہت سارے کام پڑے ہیں۔'' اس نے پیچھا چھڑانے میں ہی عافیت جانی۔

اب تو اکثر جب بھی موقع ملتا احمر اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا۔

''ارے، کہاں بھاگی جارہی ہو، نہ سلام نہ دعا، مجھ سے خفا ہو کیا؟''

''میں آپ سے بلا وجہ کیوں خفا ہونے لگی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ یہاں سے سبھوں کی خوشگوار یادیں لے کر جاؤں۔ سب کے لیے اپنے دل میں نیک جذبہ رکھوں۔''

''کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ کون تمہیں کتنا یاد کرے گا؟''

''انشاءاللہ ہم لوگ جلد ہی ملیں گے۔''

''انشاءاللہ!'' یہ احمر کے دل کی آواز تھی۔

اسے اس بات کا تو اندازہ نہیں تھا کہ اسے کون کتنا یاد کرے گا لیکن اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ احمر کے دل میں اس کے لیے کزن سے ہٹ کر کوئی اور ہی جذبہ پرورش پا رہا تھا۔ اس بات نے اس کے پُرسکون دل میں ہلچل مچا رکھی تھی اور وہ سوچ و فکر کے گرداب میں غوطے لگا رہی تھی۔ جب ان لوگوں سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو ہر آنکھ نم تھی لیکن احمر بالکل خاموش تھا جیسے کوئی اہم مسئلہ حل کر رہا ہو۔ اس نے صرف ایک بار پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔

''مجھے بھول تو نہ جاؤ گی؟'' اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ رومانہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی۔

ان لوگوں کی پاکستان واپسی کے چند روز بعد ہی اس کے لیے احمر کا رشتہ آ گیا۔ لیکن ابو نے صاف انکار کر دیا۔

''مجھے اپنی بیٹی کو دور دیس نہیں بھیجنا ہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ کھڑا ہوگا دونوں ملکوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ سامنے آجائے گی اور ہم تڑپ تڑپ کر رہ جائیں گے۔''

لیکن جوڑے تو آسمانوں میں بنتے ہیں۔ ابو کی زبردست مخالفت کے باوجود یہ رشتہ طے پا گیا۔ ایک ماہ کے ویزا پر وہ لوگ پھر ہندوستان آئے اور یہ شادی بحسن و خوبی انجام پا گئی۔ احمر کو یوں لگ رہا تھا جیسے خدا نے اسے کسی انمول تحفے سے نواز دیا ہے۔ وہ بھی خوش تھی۔ بیس روز یوں گزر گئے کہ پتا بھی نہ چلا۔ اب صرف دس روز باقی رہ گئے تھے۔ وہ اچانک بہت اداس اور خاموش ہو گئی تھی اور احمر حیرت زدہ تھا کہ اچانک اسے یہ کیا ہو گیا۔

''تم اتنی اداس کیوں ہو رومانہ؟ کیا میری محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟''

''نہیں، میں اس لیے اداس ہوں کہ اب ہمارے جدا ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔''

''یہ مہمل خیال تمہارے دماغ میں کیسے آ گیا؟ اب ہمیں کون جدا کر سکتا ہے؟؟ میں نے ویزا بڑھانے کی درخواست دے دی ہے۔ پھر ہملوگ ہنی مون پر چلیں گے۔ بس، اب خوش ہو جاؤ اور اس کی تیاری کرو۔''



وہ بہت پُر امید تھا۔ لیکن ہزار کوششوں کے باوجود ویزا نہ بڑھ سکا اور آخر کار انہیں جدا ہونا پڑا۔ یہ ان کی پہلی شکست تھی۔ انہیں جدا ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا...... نہ اسے ہندوستان کا ویزا ملا نہ احمر کو پاکستان کا۔ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر جب حالات کچھ سازگار ہوئے تو اسے تین ماہ کا ویزا مل گیا۔ احمر نے بلا تاخیر نکاح نامہ اور شہریت کے لیے عرضی دے دی۔ تاریخ پر تاریخ پڑتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہر تین ماہ بعد ویزا بڑھانا پڑتا۔ اس تکلیف دہ صورت حال نے اس کے اندر ایک خلا پیدا کر دیا اور ہر گزرتا ہوا پل اسے یہ احساس دلا کر بے چین کر رہا تھا کہ اس کی زندگی میں کچھ ایسا ہونے والا ہے جو اس کی دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔

کئی سال گزر گئے لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا پھر اچانک رومانہ کو ملک چھوڑ دینے کی نوٹس آ گئی اور تین دنوں کے اندر اندر ایک بار پھر جدائی کی گھڑی آ گئی۔

جہاز اب کراچی ایئر پورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ یادوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

◀◀ ● ▶▶

406- Lochan Enclave
Kankar Bagh, Patna - 800020
Mob: +91 9693347545


| | |
|---|---|
| نام کتاب: نیلیما<br>مصنف: ڈاکٹر شفق سوپوری<br>سن اشاعت: ۲۰۱۶ء<br>قیمت ۲۰۰/روپے<br>ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی | نام کتاب: کچھ محفلِ خوباں کی<br>مصنف: ڈاکٹر منصور خوشتر<br>سن اشاعت: ۲۰۱۵ء<br>قیمت: ۲۰۰/روپے<br>ملنے کا پتہ: دربھنگہ ٹائمس، پرانی منصفی، دربھنگہ |
| نام رسالہ: استفسار (شمارہ ۶۔۷)<br>مدیران: شین کاف نظام۔ عادل رضا منصوری<br>قیمت: ۷۵/روپے<br>صفحات: ۱۶۰<br>مقام اشاعت: جے پور، راجستھان | نام رسالہ: دربھنگہ ٹائمس (افسانہ نمبر)<br>مدیر: ڈاکٹر منصور خوشتر<br>قیمت: ۲۰۰/روپے<br>صفحات: ۳۵۲<br>مقام اشاعت: دربھنگہ، بہار |

## ● فارحہ ارشد

# گرہن گا تھا

سونے کے جھمکوں کی لاٹ جب اس کے رخساروں پہ پڑتی تو اس کے سامنے چاند بھی گہنا جاتا۔ شربتی انکھوں پہ کمان سی بھنویں اور لبِ لعلیں کی ایسی خمدار بناوٹ جیسے ہر وقت مسکراتے ہوں۔ گالوں کے گڑھے اس مسکان کو اور بھی سندرتا بخشتے۔ جوانی کی آخری سیڑھی پہ بھی بدن ایسا کہ میں بھی دیکھ کر شرما جاتی۔ یہ میری پھپھو تھیں ...... دادا کی لاڈلی اور میرے باپ سمیت چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ...... عجیب بھولی بھالی سی ...... ہر حکم پہ آمنا وصدقنا کہنے والی۔ ایسی غیر منطقی بات کرتیں کہ میرا ہنس ہنس کر برا حال ہو جاتا۔ ایک دن بولیں۔

''کرتوت کالے اس لیے ہوتے ہیں کہ یہ بھی کالے شہتوتوں کی طرح لذیذ ہوتے ہیں۔''

دادی جو ہر وقت دادا جی کے پاؤں دھلواتی رہتیں، میرے قہقہہ لگانے پہ سختی سے جھڑکتیں۔ دادا کا سفید صافہ اٹھا کر ان کے اس اونچے چبوترے کی طرف بمشکل ہانپتے ہوئے لپکیں جہاں دادا نے جانے کتنے گھنٹے خود پر ڈونگے بھر بھر پانی ڈال کر خود کو پاک کیا تھا۔

''پھپھو! آپ مانو یا نہ ...... مگر دادا نے ضرور کوئی بڑا جرم کیا ہے۔ علم نفسیات کہتا ہے......''

''چپ کر۔ ساری باتیں کرنے والی نہیں ہوتیں ...... سن ...... برتنوں کی آوازیں سن ......'' اور ان کی ہمیشہ کی طرح کی ایسی غیر منطقی بات سن کر ضبط کے باوجود میرا قہقہہ اڈ پڑا۔ دادی جانے کب سر پہ پہنچیں اور میرا منہ پکڑ کر جھنجھوڑ کر بولیں۔

''کڑیاں ایسے نہیں ہنستیں۔'' یہ روایتی جملہ سن سن کر میرے کان پک جاتے تھے۔

''لیں ...... کڑیاں ایسے نہیں کرتیں، ویسے نہیں کرتیں ...... کڑیاں نہ ہوئیں بھیڑ بکریاں ہو گئیں ...... جس سمت ہانکو، بس سر نیہوڑائے چلتی جائیں۔ دادی اب بس ...... مجھے نہ ٹوکا کریں۔ مجھے پھپھو نہیں بننا۔ اتنی سوہنی بیٹی بوڑھی کر دی مگر......''

''جا، نی ...... آ جاتی ہے سال بعد شہر سے چھٹیاں گذارنے اور اپنی عمر سے وڈی باتیں کرتی ہے۔



ہمارے فیصلوں پہ اعتراض ایسے کرتی ہے جیسے ہم سارے تو عقل کے کورے ہیں۔ خبردار جو اس کے بارے میں بات کی۔''

''کیوں نہ کروں؟ کوئی بات ہے بھلا۔ اتنے رشتے آئے ادھر ایک ہی رٹ ...... اپنی برادری ...... اپنی ذات پات!''

''تو زبان کو لگام دیتی ہے کہ نہیں؟ ہماری بیٹی ہے۔ ہم اس کے ویاہ کا جو بھی فیصلہ کریں اور کبھی تو نے اس کو بھی سنا بات کرتے؟ یا ناک بھوں چڑھاتے؟

''نہیں کہتیں نا! اسی لیے اب ابروؤں کے بال بھی سفید ہونے لگے ہیں ...... حد ہے ...... اس زمانے میں اپنی برادری ...... ذات پات ...... ہونہہ! بس آپ ہی اعلیٰ نسل باقی ...... سارے شہدے اور کمین ...... یہ آپ قدرت سے لڑ رہی یں اور قدرت بڑی سزا دیتی ہے، یاد رکھیں۔''

''ارے بند کر یہ نوگزی زبان ......'' اس سے پہلے کہ میری بات پوری ہوتی دادی کی چپل میرے سر پہ آ لگی۔ میری زبان چاہے نوگزی کہلاتی یا سوگزی، اس بات پہ چٹکی کاٹنے سے میں بھی باز نہ آتی۔

''چل آ میرے ساتھ۔'' پھپھو میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے کمرے میں لے آئیں۔ مجھے پھپھو پہ ڈھیر سارا پیار آ گیا۔ کتنی گہری لگتی ہیں پھپھو۔ میں نے ان کی ڈھلتی عمر والے چاند سے چہرے کو تکتے ہوئے سوچا۔

اس رات چاند گرہن کا لگنا اس حویلی کے باشندوں میں بھونچال لے آیا تھا۔ 'دان پُن داویلا اے۔' دادی کہتی جاتی تھیں اور بوریاں بھر بھر اناج غریبوں کے گھروں میں بھجواتی جا رہی تھیں۔ دادا دریا کا رُخ کر چکے تھے تا کہ چلتے پانی میں کھڑے ہو کر پکڑ میں آئے چاند کا عکس دیکھ کر اس کی مکتی کروا سکیں، ذکر اذکار کر کے اپنے گناہ بھی بخشوا سکیں۔

جوں جوں رات بڑھ رہی تھی ایک عجیب سے خوف کا ہالہ گاؤں سے دور اس تنہا حویلی پر چھاتا جا رہا تھا۔

''دادی یہ 'دان پُن داویلا' کیا ہوتا ہے؟''

''دان یعنی دان کرنا، دینا اور پُن یعنی نیکی ...... دان کرنے کا وقت ...... تُو سوچ اگر چاند جیسی وڈی شے کی پکڑ ہو سکتی ہے تو بھلا بتاؤ انسان کیا چیز ہے۔ آزمائش ہے۔'' دادی توبہ استغفار کرتی جاتی تھیں۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ میں اٹھ کے باہر آئی تو چاند کے ارد گرد 'ڈائمنڈ رنگ' بن چکا تھا اور چاند کی مکتی شروع ہو چکی تھی۔ گھڑونجی پہ پڑا پیتل کا گلاس گھڑے کے ٹھنڈے پانی سے بھر کر ابھی میں نے ایک گھونٹ ہی بھرا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی نے خوفزدہ کر دیا۔ ایک دم مڑ کر دیکھا۔ کتا زبان نکالے کھڑا ہانپ رہا تھا۔ خوف کے مارے میں

نے گلاس اس کو دے مارا۔ وہ بھونکا اور لنگڑاتا ہوا حویلی کی پچھلی جانب چلا گیا۔

''نہ مارو۔ کتا بھی انسان ہوتا ہے۔'' نزدیک آتی پھپھو کی غیر منطقی بات پہ، اس سے پہلے کہ میرا قہقہہ نکلتا، میری نظر ان کے اُلٹے پائنچوں پہ پڑی۔

چاند جیسی...... چاند گرہن...... دان پن داویلا...... دان...... سب کے گناہوں کا دان...... لفظ میرے اردگرد ناچنے لگے۔ میں جو دوبارہ پانی ڈالنے کے لیے گھڑا الٹائے کھڑی تھی۔ جانے کب وہ میرے ہاتھ سے چھوٹا اور زور سے میرے پاؤں پہ آگرا۔ تکلیف کی شدت سے میں بلک بلک کے رونے لگی۔

◀◀ ● ▶▶

19- A , Madina Park ,B Block ,
Sabzazar Lahore Pakistan.
Ph: 0303 8380141


## بزمِ صدف بین الاقوامی ادبی ایوارڈ

■ اردو زبان وادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں ادارۂ بزمِ صدف نے عالمی سطح پر ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے کے دو ایوارڈز بہ نام 'بزمِ صدف بین الاقوامی ادبی ایوارڈ' دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

■ ۴۵ سال سے کم عمر کے ایسے ادبا یا شعرا جنھوں نے ادبی سرگرمیوں سے ابتدائی طور پر اپنی صلاحیتوں کو ثابت کردیا ہے؛ نئی نسل کے ایسے دو لکھنے والوں کو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے اکیاون ہزار روپے کے 'بزمِ صدف نئی نسل ایوارڈ' سے نوازا جائے گا۔

● انتخاب کا دائرۂ کار ہندستان، پاکستان اور خلیجی ممالک کے شامل عالمی ہوگا۔

● 'بزمِ صدف بین الاقوامی ایوارڈ' اور 'بزمِ صدف نئی نسل ایوارڈ' کی تقسیم کا پروگرام ہر سال ستمبر ماہ میں دوحہ، قطر میں منعقد کیا جائے گا۔

● ایوارڈ کے لیے متعلقہ فرد یا کوئی بھی ادب فہم تفصیلی تعارفی خاکے مع ایک ہزار روپے رجسٹریشن فیس Sehmahi Sadaf کے نام پٹنہ میں واجب الادا ڈرافٹ کے ساتھ اپنی نامزدگی بھیج سکتا ہے۔

● 'بزمِ صدف' کی ایوارڈ کمیٹی کا فیصلہ آخری ہوگا۔ غیر ضروری زبانی استفسار اور سفارشات سے ادارے کو محفوظ رکھیں۔ مزید کسی بھی تفصیل کے لیے ای۔میل سے رابطہ قائم کریں۔

صفدر امام قادری
ڈائرکٹر: بزمِ صدف

شہاب الدّین احمد
چیرمین: بزمِ صدف

Email : sehmahisadaf@gmail.com
Contact : Editor-in-Chief, Sehmahi Sadaf,
202, Abu Plaza, NIT More, Ashok Rajpath, Patna-800006




● امکان ۔ ۱

● ہما فلک

# سچا

بظاہر ارحم کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ہر لحاظ سے تندرست تھا۔ بچپن میں اپنا شک دور کرنے کے لیے اس کے والدین نے اس کے جو بھی ٹیسٹ کروائے تھے ان کے مطابق اس کے سننے کی قوت میں کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے بہت دیر سے بولنا شروع کیا۔ جب اسے اسکول بھیجا گیا تو اصل مسئلہ اس وقت درپیش ہوا۔ کیونکہ وہ اسکول میں کبھی ایک لفظ بھی نہ بولتا تھا۔ کوئی ایسا اسکول بھی نزدیک نہیں تھا جو کہ خاص ایسے بچوں کے لیے ہوتا۔ بہت مشکل سے ایک پرائیویٹ اسکول کی پرنسپل کچھ زیادہ فیس لے کر اس بات پر رضا مند ہوئی تھی کہ وہ کلاس میں بیٹھا رہے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے کہ اس طرح دوسرے بچوں کی توجہ بٹتی ہے۔ اب ارحم مستقل گھر رہنے لگا۔

اسے گھر میں کچھ سکھانے کی کوشش کی جاتی لیکن بعض دفعہ گھنٹے بھر کی مغز ماری کے بعد بھی وہ ایک لفظ نہ بولتا۔ اور کبھی ایک دم کچھ ایسا بول دیتا جس پر وہ لوگ حیران رہ جاتے۔

اس سے دس برس بڑے بھائی اکرم نے ایک طوطا پالا ہوا تھا۔ جسے ایک بار ارحم نے طوطو کہا تھا۔ تب سے سب اسے طوطو کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ گھر کے صحن میں امرود کے پیڑ کے ساتھ طوطو کا پنجرہ لٹکا رہتا تھا۔ اکرم اسے بڑے پیار سے چوری کھلاتا اور اسے بولنا سکھاتا تھا۔ وہ جب بھی باہر سے آتا طوطا شور مچانے لگ جاتا...... ''طوطو چوری کھائے گا...... طوطو چوری کھائے گا۔'' کسی اور کے سامنے بالکل نہیں بولتا تھا۔ اور اکرم کے سامنے خوب بولتا۔ کوئی اسے بلوانے کی لاکھ کوشش کرتا وہ نخوت سے منہ پھیرے رکھتا تھا۔ ارحم کا دل بھی اس کے ساتھ بہت لگتا تھا۔ جب طوطا بولتا تو وہ اسے بڑے شوق سے دیکھتا رہتا۔ اکرم جب فارغ ہوتا تو اس کا ایک اور مشغلہ تھا...... ارحم کو پڑھانا۔ وہ اسے لے کر صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور اسے ''الف، بے، پے، یا ایک، دو تین سکھانے لگ جاتا۔ مگر بعض دفعہ گھنٹہ سر کھپانے کے بعد بھی وہ ایک لفظ نہ بولتا۔ اور کبھی اگر کچھ بول دیتا تو اگلی بار بھولا ہوا ہوتا۔ اکرم کو اس پر بہت غصہ آتا تو اس کے منہ پر تھپڑ اور کمر میں گھونسے مارتا اور جب ارحم رونے لگتا تو اسے اور مارتا کہ رونا نہیں ہے۔ ارحم سہم کر چپ کر جاتا تھا۔

اس دن بھی اکرم بیٹھا اسے الف سے انار بے سے بکری پڑھا رہا تھا۔ مگر ارحم کچھ بول ہی نہیں رہا تھا۔

ایسے میں اکرم کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔اس نے دو تین تھپڑ ارحم کے جڑ دیئے اور غصے میں تین چار دفعہ دہرایا......

''بولو الف سے انار، بے سے بکری...... بولو، بولو بولو......!''

پاس لٹکے پنجرے سے طوطو کی آواز آئی......''الف سے انار، بے سے بکری......الف سے انار، بے سے بکری۔''

''او جا......اوئے کھوتے دماغ...... تیرے سے تو اپنا طوطو ہی اچھا ہے۔دیکھ کتنی جلدی سیکھ گیا۔' یہ کہنے کے ساتھ ہی ایک زور کا مکا ارحم کی کمر میں رسید کر دیا۔

ارحم کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

''رونا نہیں......رونا نہیں......سنا تم نے......'' اکرم ڈپٹ کر بولا۔اسے شدید غصے میں دیکھ کر ارحم نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے تھے۔

ان کا باپ اسلم کپڑوں کی ایک چھوٹی سی دکان کا مالک تھا۔دو بچوں کے ساتھ مناسب سی گزر بسر ہو رہی تھی۔اسلم کو بھی بہت شوق تھا کہ دونوں بچے اچھی تعلیم حاصل کریں۔بڑا اکرم کافی ہونہار تھا لیکن ارحم نے باپ کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔کبھی کبھار طیش میں آ کر وہ یہاں تک کہہ دیتا کہ یہ پاگل ہے اسے پاگل خانے بھجوا دو۔ایسے میں ریحانہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی جس نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا۔

ایک دفعہ اس کے ماموں کینیڈا سے آئے ہوئے تھے۔ارحم کو دیکھ کر انہیں کافی دکھ ہوا۔

''باجی اسے کسی اچھے نفسیات کے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔کیوں اتنے پیارے بیٹے کو ضائع کر رہی ہو۔ابھی صرف چھ سات سال کا ہے۔کوئی علاج کیا جا سکتا ہو تو کروا لو۔''

''یہاں قصبے میں کہاں کوئی اچھا ڈاکٹر...... یہاں کے جس ڈاکٹر کو دکھایا تھا اس نے یہی کہا تھا کہ یہ بچہ اپنی عمر سے پیچھے ہے اور ایسے ہی رہے گا۔اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔اس کے لیے تو شہر جانا پڑے گا۔'' ریحانہ کے دل میں بھی بھائی کی بات سے امید کی کرن چمکی۔

''اچھا میں لے کر جاؤں گا تم فکر نہ کرو۔''

شہر کے ڈاکٹر نے تفصیلی معائنہ کے بعد بتایا کہ اس کے سننے اور بولنے کی صلاحیت میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔صرف دماغ تک پیغام کی ترسیل عام انسان کی طرح نہیں ہو پاتی۔لیکن اس کے لاشعور میں کچھ الفاظ یا باتیں جمع ہو جاتی ہیں جنہیں کبھی کبھار وہ اپنی مرضی سے یا بے ساختہ بیان کر دیتا ہے۔مستقل تھراپی سے کچھ بہتری کی امید ہے۔ماموں نے یہ سب جب اپنی بہن کو بتایا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔علاج کے خطیر اخراجات اور شہر آنے جانے کے مستقل چکر، بہت مشکل کام تھا۔ماموں نے قائل کرنے کی کوشش کی مگر بے سود رہا۔

اب ارحم کی تعلیم یا علاج کی طرف سے اس کے ماں باپ مکمل مایوس ہو کر اس کے حال پر اسے چھوڑ



چکے تھے۔وہ اسی طرح کبھی کبھار ایک دو الفاظ، کوئی جملہ بول دیتا......ایک دو بار تو اس نے باقاعدہ تقریر کے انداز میں لمبی چوڑی بات کر دی۔ایسا وہ تب ہی کرتا جب اسے کسی بات پر شدید غصہ ہوتا۔وہ اپنی آنکھوں کو پورا پھیلا لیتا اور ایک انگلی تنبیہی انداز میں کھڑی کر کے تیز تیز بولتا۔کسی کو سمجھ نہ آتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔جب اس نے پہلی بار اکرم کے سامنے ایسا کیا تو اکرم بہت ہنسا اور اس نے اس کا نام اس دن سے طوطو رکھ دیا۔

ارحم جوں جوں بڑا ہو رہا تھا، اکرم کی دلچسپی اس میں بڑھتی جا رہی تھی۔وہ اس کا بغور مشاہدہ کرتا رہتا۔ایک دن ایک واقعے نے تو اکرم کے لیے سوچ کے نئے در وا کر دیئے۔اس دن ان کی چچی ان کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ان کا چھوٹا بیٹا کافی خوش خوراک تھا۔ہر وقت اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز ہوتی جسے لے کر وہ بیٹھا رہتا اور کھاتا رہتا۔وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے قدم اٹھانا بھی محال ہوتا تھا۔اس دن بھی جس طرح جھومتا ہوا وہ کمرے میں داخل ہوا، ارحم اسے دیکھتے ہی بے ساختہ بول اٹھا

''ہاتھی کا بچہ!'' یہ سن کر اکرم تو قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔آٹھ سالہ ارحم اپنی بات کہہ کر پھر سے خود میں مگن ہو چکا تھا جب کہ ان کے کزن نے کمرے میں داخل ہوتی ماں کو دیکھ کر بھاں بھاں رونا شروع کر دیا۔چچی کے کانوں میں بھی ارحم کی بات پڑ چکی تھی اس لیے انہوں نے بے نقط سنانا شروع کر دیا۔

''پاگل کہیں کا......نہ عقل ہے نہ تمیز......''

''او چچی!......کیا ہو گیا...... بچہ ہی ہے نا اور پھر آپ کو تو پتا ہے کہ اسے بولتے ہوئے کسی بات کا پتا نہیں چلتا۔بولتا ہی کب ہے...... بے چارہ!''

''ہاں......ہاں......مردہ بولے تو کفن ہی پھاڑے گا......اللہ کی پناہ......اتنے لاڈ چڑھتے ہیں تو کسی پاگل خانے داخل کروا آؤ۔'' چچی کی قسمت اچھی تھی کہ اس وقت ان کی ماں ہمسائیوں کی طرف گئی ہوئی تھی ورنہ وہاں ٹھیک ٹھاک تو تو، میں میں شروع ہو جاتی۔چچی کا غصہ تو جیسے تیسے ٹھنڈا ہوا۔وہ گئی تو اکرم، ارحم کو باہر لے جا کر چاٹ کھلا کر، چاکلیٹ دلا کر لایا۔

''واہ میرے طوطو! دل خوش کیتا ای......(واہ میرے طوطو دل خوش کر دیا۔)'' چچی سے وہ تب سے خار کھاتا تھا جب سے وہ اس کی نئی نئی جوان ہوتی محبت کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہوئی تھی۔اور اس کا اپنے گھر داخلہ ہی بند کر دیا تھا۔خود دھڑلے سے ان کے گھر آتی مجال ہے، کبھی بیٹی کو بھی ساتھ لے آتی۔آج ارحم نے چچی کو جلا کر اسے کافی سکون پہنچایا تھا۔

اب تو اکرم کو ایک کھیل ہاتھ آ گیا۔جس سے اسے کچھ کہلوانا ہوتا وہ ایک دو بار ارحم سے کہتا۔ارحم بھی اتنا تو سمجھتا تھا کہ ایسا کچھ کہنے کے بعد اس کی خاصی آؤ بھگت ہوتی ہے۔اس لیے اب وہ بھی بھائی کا اشارہ سمجھنے لگا تھا۔

ایک دن ان کے گھر ان کے دور کے رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔ابھی انہیں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ارحم باہر سے آیا اور انہیں دیکھ کے ایک دم زور سے ہنسا اور ان کے سر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

''چاند...... ہاہاہا...... چاند......'' وہ کھسیانے سے ہو گئے کیونکہ گنجے پن کی وجہ سے کئی لوگ اب انہیں چاند کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسلم نے پہلے تو معذرت کی اس کے بعد ارحم کو گھورا۔ جب کہ اکرم اندر ہی اندر خوش ہوتے ہوئے وضاحت دے رہا تھا۔

''انکل! اس کی بات کا برا نا مانیں۔اپنے طوطو میں اور ایک سال کے بچے میں بس جسامت کا ہی فرق ہے۔ورنہ اسے سمجھ بالکل بھی نہیں ہے۔''ان کو جیسے تیسے مطمئن کیا۔مگر بعد میں خوب ہنسا اور ارحم کو شاباش دی۔

''ہم نے تو اسے کبھی ایک لفظ نہیں سکھایا۔اگر ہمارے بتانے پر کچھ سیکھ سکتا تو مسئلہ ہی کیا تھا؟ دس تک گنتی تو ہم اسے آج تک سکھا نہیں پائے۔''

ارحم جب کوئی اس طرح کا لفظ کسی کے سامنے بولتا تو،اس کے شکوہ کرنے پر اکرم ایسی ہی دلیلوں کے ساتھ صفائی پیش کرتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ سب ایک کزن کی شادی میں اکٹھے تھے جہاں گاؤں سے آئی ہوئی ان کے کسی رشتہ دار کی بیٹیاں فیشن میں سب سے آگے تھیں اور اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ارحم پاس بیٹھا انہیں میک اپ کرتے دیکھتا رہا۔پھر ایک دم سے بولا۔

''ہو تو پینڈو (دیہاتی) ہی۔''اس موقع پر اکرم تو وہاں موجود نہیں تھا،لیکن جن لوگوں کے دل کی بات ارحم نے کہہ دی تھی انہوں نے خوب مرچ مصالحہ لگا کر اکرم کو بتائی۔اکرم نے بھی اسے خوب پیار کیا۔

''واہ میرے طوطیا......! کدی کدی بولنا ایں پر ستھرا بولنا ایں۔(واہ میرے طوطے کبھی کبھی بولتے ہو مگر اچھا بولتے ہو)۔''

مگر اب بھی وہ کچھ جملے اپنی مرضی سے ہی ادا کرتا تھا۔ورنہ کچھ بھی کہتے رہو۔نہ بولنا ہوتا تو نہیں بولتا تھا۔اکرم کا انداز وہی تھا۔''سچا پتر ہے میرا شیر۔''

اکرم نے اپنا کاروبار سیٹ کر لیا تو اس کی شادی کر دی گئی۔ماں اور باپ کچھ وقفے سے فوت ہو گئے تو ارحم مکمل طور پر بھائی کے سر پر آ پڑا۔ماں باپ کے فوت ہونے کے بعد ارحم بالکل ہی تنہا ہو کر رہ گیا تھا۔زیادہ تر وہ طوطو کے ساتھ ہی رہتا تھا۔کبھی کبھار وہ ''ماں......یا......بابا'' کہہ کر سسک پڑتا مگر پھر فوراً ہی خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا کہ کہیں اکرم نہ دیکھ لے۔بچپن میں رونے پر مار پڑنے کا خوف آج تک اس کے ذہن سے نہیں نکل سکا تھا جب کہ اب اکرم اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا بلکہ وہ تو اس کے لیے ایسا مہرہ تھا جسے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے آگے کرتا تھا۔اس کی عادت ہنوز وہی تھی......ارحم کے ذریعہ



کسی نہ کسی کا بھری محفل میں مذاق بنوا کر لطف اندوز ہونا۔اس کے لیے ارحم کا پُر اعتماد رہنا بہت ضروری تھا تا کہ وہ اکرم کا اشارہ سمجھ سکے۔

خاندان، ملنے جلنے والوں اور سب دوستوں میں اکرم ایک مثالی شخصیت کے طور پر سامنے آیا تھا۔پڑھا لکھا،کامیاب انسان...... جو گھر،کاروبار بھائی اور ہر قسم کی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو رہا تھا۔اس کی شخصیت کا تاثر کافی مرعوب کن تھا جس میں اس کی اعلیٰ تعلیم اور کامیاب کاروباری حیثیت خاص طور پر کارفرما تھے۔

اس پر اس کی بیوی بہت فعال اور سمجھدار تھی۔اس نے گھریلو معاملات میں اکرم کو بالکل بے فکر کر چھوڑا تھا۔

آج کچھ کاروباری دوست اس کی طرف آرہے تھے اور اکرم مسلسل بیوی کو ہدایتیں دے رہا تھا۔

''بس زرقا......! یہ خیال رہے کوئی کمی نہ رہ جائے۔''

''میں نے کہا نا...... آپ بے فکر ہو جائیں۔میں سب سنبھال لوں گی۔'' زرقا تیاری کے ساتھ ساتھ اکرم کو تسلی بھی دیتی جا رہی تھی۔

''امجد صاحب بس ایک بار خوش ہو جائیں...... بندہ ہے تو ایک نمبر کا فراڈیا......اگر میرا کام نہ پھنسا ہوتا تو کبھی منہ نہ لگاتا۔''

''چلیں، مطلب ہو تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔'' زرقا نے پاس بیٹھے ارحم کو گاجر کا ٹکڑا پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ان پر میرا امیج تو کافی اچھا بنا ہوا ہے۔صرف ایک بار ہامی بھر لیں تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

مہمان آچکے تھے۔اکرم سب انتظام دیکھ کر بہت مطمئن تھا۔آج کا دن اس کے لیے بہت اہم تھا۔ایک بہت بڑا کاروباری سودا تکمیل پانا تھا جس کا سارا دارو مدار امجد صاحب پر تھا۔اکرم ان کے آگے بچھا جا رہا تھا۔خوش ذائقہ کھانا بہت سلیقے سے چنا گیا تھا اور بہت خاموشی سے کھایا جانے لگا۔کمرے میں صرف چمچوں کے پلیٹوں سے ٹکرانے کی ہلکی سی آواز گونج رہی تھی۔

''امجد صاحب! یہ کباب ٹرائی کیجئے نا خاص آپ کے لیے بنوائے ہیں۔''اکرم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کے قدموں میں ہی بیٹھ جاتا۔

''تو یہ ہے امجد......فراڈیا......''

کمرے میں چمچوں کے پلیٹوں سے ٹکرانے کی آواز اچانک رک گئی۔سب چونک کر آواز کی جانب دیکھنے لگے مگر ارحم اپنی بات کہہ کر کمرے سے نکل چکا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Oswald- Hesse Str. 53 70469, Stuttgart
Germany

● امکان ۔ ۲

● احمد عرفان

# سگنل

ٹرین اپنی سست روی کے ساتھ مسلسل سٹی بجاتی چلی جا رہی تھی۔ ہر چھوٹے اسٹیشن پر رکتی اور پھر اسی رفتار سے آگے بڑھ جاتی۔ کمپارٹمنٹ میں موجود مسافر کسی نہ کسی موضوع پر محوِ گفتگو تھے۔ کچھ لوگوں کے بیچ روز افزوں گرانی اور چولا بدلتی سیاست پر بحث و مباحثہ جاری تھا۔ خوانچہ فروشوں کی بھی ریل پیل تھی۔ اس شور وغل کے درمیان میں اپنے خیالوں میں گم تھا۔ نئی جگہ کا سفر، نئے لوگوں سے رابطہ، نیا ماحول، نئی دشواریوں سے سمجھوتہ، غرض کہ ہر نئی چیز کا سامنا مجھے کرنا تھا۔

اس شہر میں تبادلہ ہونے پر میں پہلی بار اپنی ذمہ داریاں یہاں سنبھالنے جا رہا تھا۔ یوں تو یہ شہر اب ضلع بن کر بہار کے نقشہ پر اپنا مقام بنا چکا ہے۔ سنا ہے برسوں پہلے یہ بڑا قصبہ ہوا کرتا تھا۔ پہاڑوں کے درمیان لہلہاتے دھان کے کھیتوں کا علاقہ جہاں اسپتال، تھانہ اور ایک آدھ اسکول کے علاوہ کوئی دوسرا محکمہ نہ تھا۔ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن، ایک چوڑی ریل پٹری جس پر دو یا تین پسنجر ٹرین دیر سویر آ جایا کرتی۔

عمارتیں بن گئیں سڑکیں پختہ ہوگئیں۔ بازار گنجان ہو گئے۔ دکانوں کی چمک دمک بڑھ گئی۔ لوگوں نے یہ بتایا کہ اس ترقی کے باوجود آمد و رفت کے وسائل اور سہولت میں یہ اب بھی قصبہ ہی ہے۔ صرف سرکاری گاڑیوں اور نجی موٹروں میں اضافہ ہوگیا ہے۔

سیٹی بجاتی ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو یہ وہی اسٹیشن تھا جہاں مجھے اترنا تھا۔ اپنا بیگ اٹھا کر ٹرین سے اترنے کی فکر کرنے لگا۔ ڈبہ میں داخل ہونے والوں کا جم غفیر اور اترنے والوں کا بھی ہجوم۔ دونوں طرف سے چڑھنے اور اترنے کی زور آزمائی میں کسی طرح اپنے سامان کے ساتھ پلیٹ فارم پر اتر سکا۔ پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہی گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی پڑی جیسے پاس میں کوئی اصطبل ہو۔ پھر سڑک کے دونوں جانب ٹمٹم کی لمبی قطاریں نظر آئیں۔

''آیئے! بابو! کچہری جانا ہے۔'' کوئی مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں خاموشی کے ساتھ رکشا یا آٹو کی تلاش میں آگے بڑھتا گیا۔ دور دور تک جب کوئی رکشا یا آٹو نظر نہیں آیا تو میں نے ایک صاحب سے



دریافت کیا۔

''بھائی صاحب! یہاں رکشا یا آٹو کہاں پر ملے گا۔''

''جناب یہ شیخپورہ ہے شیخپورہ......شیخوں اور نوابوں کے رہنے کی جگہ۔ نوابوں کے یہاں صرف فٹن ہی چلتی تھی۔ اب نہ نواب رہے نہ نواب زادے۔ وراثت میں فٹن کی جگہ ٹمٹم چھوڑ کر گئے ہیں۔'' اس شخص کے جواب سے اندازہ ہوا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور ظریف طبع بھی۔ اس درمیان آٹھ دس ٹمٹم شہر کے مختلف راستوں پر روانہ ہو چکے تھے۔ بغل سے ایک آواز آئی۔

''بابو جی! آپ کو کہاں جانا ہے؟ کچہری۔'' آواز دینے والا کوئی ٹمٹم والا ہی تھا۔ شکل و شباہت اور لباس سے غربت نمایاں تھیں۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا تم ٹمٹم والے ہو؟''

''جی ہاں حضور!'' اس نے جواب دیا۔ ''چلئے بابو! کچہری پہنچا دیتے ہیں۔ یہاں سے کچہری کا چار روپیہ کرایہ ہے۔ آپ نے دیر کر دی۔ مسافر تو جا چکے ہیں۔ ایک دو سواری اور مل جائے تو کچہری پہنچا دیں۔'' وہ لگاتار بولتا گیا۔

''چلو میں تمہیں پورے ٹمٹم کا کرایہ دے دوں گا۔ کچہری پہنچا دو'' میں نے اس سے کہا۔

مجھے دیر ہو رہی تھی۔ آج جوائن کرنا تھا۔ ٹمٹم والے کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ میں آگے بڑھ کر اس کی ٹمٹم پر بیٹھ گیا۔ چل! ہٹ......ہٹ کہتے ہوئے اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور گھوڑا کچہری کی طرف جانے والی پختہ سڑک پر اپنے پیروں کی ٹاپ کی آواز بکھیرتا ہوا دوڑنے لگا۔ ٹمٹم پر بیٹھنے کے بعد مجھے وہ بات یاد آئی کہ یہ نوابوں کی جگہ ہے۔ میں غیر ارادی طور پر اپنے آپ کو نواب شیخ پورہ تصور کرتے ہوئے پیر پر پیر چڑھا کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں بعد جب میری نظر اس ادھیڑ عمر کے ٹمٹم والے پر پڑی۔ اس کے جسم پر بوسیدہ کپڑے تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھوں میں غربت و عسرت کے گہرے نقوش نمایاں تھے۔ میں نے ٹمٹم والے سے اس کا نام پوچھا۔

''میرا نام غفور ہے بابو۔'' اس نے جواب دیا۔

''کتنے دنوں سے ٹمٹم چلا رہے ہو۔'' میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہنے لگا۔

''جب سے ہوش سنبھالا ہے ٹمٹم ہی چلا رہا ہوں۔ میرے باپ بھی ٹمٹم چلاتے تھے۔''

''اور دادا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرے دادا نواب اسماعیل خاں صاحب کے خاص کوچ بان تھے۔'' اس نے فخریہ انداز سے کہا۔

''غرض دو تین پشتوں سے تمہارا یہ پیشہ چلا آ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

’’ہاں بابو! قریب چار پشتوں سے۔‘‘

’’غفور میاں! روز کتنی کمائی کر لیتے ہو۔ دال روٹی سبزی کھانے کو مل جاتی ہے؟‘‘ میں نے اس سے جاننا چاہا۔

’’بابو! اگر ہم سبزی کھائیں گے تو پھر گھوڑا کیا کھائے گا۔ پچاس ساٹھ روپیہ روزانہ گھوڑے کی خورا کی پر خرچ ہو جاتا ہے۔ گھر میں میری عورت ہے اور چار بچے۔ کسی طرح دال روٹی پر گذر ہو جاتا ہے اور وہ بھی کبھی کبھی ایک ہی وقت نصیب ہوتا ہے۔ اب سواری بھی تو کم ملتی ہے۔ دن بھر میں دو یا تین گاڑی اس لائن سے گذرتی ہے اور ٹم ٹم بھی اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ جیسے ہی گاڑی کے آنے کا سگنل ہوتا ہے سارے ٹم ٹم والے اسٹیشن دوڑ پڑتے ہیں۔ دن بھر میں دو تین ٹرپ سواری مل گئی تو یہی اپنی قسمت سمجھئے۔‘‘ وہ مسلسل اپنے حالات بیان کرتا رہا اور میں سنتا رہا۔ پھر اس نے ٹم ٹم روک کر کہا۔

’’سامنے کچہری ہے بابو!‘‘

ٹم ٹم سے اتر کر میں نے پچاس روپیہ کا ایک نوٹ کرایہ کے عوض میں اسے دیا اور کہا۔

’’کل پھر اسی وقت اسٹیشن آ جانا۔ میں روزانہ اسی ٹرین سے آیا کروں گا۔‘‘

’’ہاں بابو! سگنل ہوتے ہی ٹم ٹم کے ساتھ حاضر رہوں گا۔‘‘ اس نے خوش ہو کر جواب دیا اور میں دفتر کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن جب میں شیخ پورہ اسٹیشن پر اترا تو دیکھا کہ غفور چابک لیے پلیٹ فارم پر میرا انتظار کر رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

’’چلئے بابو! آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔‘‘ وہ خوش ہو کر بولا۔ میں اس کے ٹم ٹم پر بیٹھ گیا۔ غفور کے لہراتے ہوئے چابک کے ساتھ گھوڑا دوڑنے لگا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولنے لگا۔

’’آج صبح سویرے ہی ایک پسنجر گاڑی گئی۔ ہم کو کچھ سواری مل گئی۔‘‘

’’بہت اچھا۔ آج تمہارا دن ٹھیک شروع ہوا۔‘‘ میں نے غفور سے کہا۔

’’ہاں بابو! دن بھر میں دو تین سگنل چیک کر کے سواری اٹھا لیتے ہیں اور گھوڑے کی خورا کی نکل جاتی ہے۔ سگنل کے سہارے تو جیتے ہیں بابو۔ اور اسی طرح چلتے چلتے میری زندگی کا سگنل بھی ایک دن ڈاؤن ہو جائے گا۔‘‘ غفور کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

’’کیوں......؟ ایسا کیا ہے؟ تم تو ابھی ٹھیک ہو۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

’’گھوڑا گاڑی چلاتے چلاتے اب تھک گیا ہوں۔ اندر سے بہت کمزور ہو چکا ہوں۔ بچوں کا کیا



ہوگا؟ اس کی فکر کھائے جاتی ہے۔ بیٹا بھی سیانا نہیں کہ میری جگہ لے لے۔ کھانے پینے کے بعد کچھ پیسہ بچ جاتا تو اپنا نہ سہی بیمار گھر والی کا علاج کرا سکتے۔ بابو! آج کل دواؤں میں بہت پیسے لگتے ہیں اور مولوی اور حافظ سے دعائیں کرانے میں بھی پیسہ چاہئے۔‘‘ غفور کے لہجہ سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ بولتے بولتے وہ افسردہ ہو گیا۔

اس طرح ہر روز میں شیخ پورہ آتا رہا اور غفور مجھے اسٹیشن سے دفتر پہنچاتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس سے میری انسیت بڑھ گئی۔ اگر کبھی اسٹیشن پر اسے نہ دیکھتا تو خیال آتا کہ اسے کچھ ہو تو نہیں گیا ہے۔

ادھر کئی دنوں تک وہ اسٹیشن پر نظر نہیں آیا۔ ہر روز گاڑی سے اتر کر اسٹیشن سے باہر اسے تلاش کرتا۔ آج بھی میری نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں کہ کسی نے بتایا ’’بابو آپ کا ٹم ٹم والا غفور نہیں آ رہا ہے۔ اس کی گھر والی بہت بیمار ہے۔‘‘

’’غفور کو تم جانتے ہو، وہ کہاں رہتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں بابو! ہم دونوں بہت دنوں سے ساتھ ہی ٹم ٹم چلاتے ہیں۔ یہاں سے پچھّم تھوڑی دوری پر پرانی مسجد کے پاس رہتا ہے۔‘‘ عیادت کی غرض سے غفور سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ بتائے ہوئے پتے پر اس کے گھر کی تلاش میں پیدل ہی چل پڑا۔ پرانی مسجد کے پاس ایک کھپڑا پوش کچی دیواروں کا بوسیدہ مکان...... سامنے بندھا ہوا گھوڑا اور پاس میں ٹم ٹم۔ میں سمجھ گیا کہ یہ غفور کا مکان ہے۔ میں نے آواز دی۔ غفور باہر آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

’’غفور! مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تمہاری بیوی بیمار ہے...... گھبراؤ نہیں۔ اللہ صحت دے گا۔ اس پر بھروسہ رکھو۔‘‘ میں غفور کو تسلی دیتا رہا اور وہ خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا۔ پھر سسکتے ہوئے اس نے بتایا۔

’’زندگی بھر تو اسے بھر پیٹ کھانا بھی نہ کھلا سکا اور ابھی دس منٹ پہلے بغیر دوا دعا کے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ یہی ہم غریبوں کا نصیب ہے بابو۔‘‘

میں اس حادثہ پر افسوس کا اظہار کرنے ہی والا تھا کہ غفور کی چھوٹی بیٹی دوڑتی ہوئی آئی اور بولی۔

’’ابا! ابا! گاڑی کا سگنل ہو گیا ہے۔‘‘

’’بیٹا! گاڑی کا سگنل تو کب کا ہو چکا۔ اب تو گاڑی بھی پاس کر گئی۔‘‘ یہ کہہ کر غفور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میں رواں دواں زندگی کی پٹری اور سگنل کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Top Khana Bazar
Munger-811201

● امکان ۔ ۳

● فرحانہ صادق

# الو کا پٹھا

جس خدشے کے ساتھ اس نے فیس بک آن کیا، وہی ہوا۔

اپنی پوسٹ پر سب سے پہلے اسی کا کمنٹ نظر آیا......کاٹ کھاتا ہوا، ہنسی اڑاتا ہوا۔

وہ اپنی تحریر پر بڑی محنت کرتی تھی۔ انہیں اچھے اچھے ڈیزائنز میں سجاتی۔ پھر انہیں اپنے پیج پر پوسٹ کرتی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھیں اور اس کے پیج کی ترویج ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے پاس سینکڑوں لائکس اور کمنٹس آجاتے۔ ہمیشہ اس کے کام کو سراہا گیا......تعریف کی گئی۔ اگر کبھی کسی کمی طرف اشارہ بھی کیا گیا تو اس نے بڑی خوش دلی سے اسے قبول کیا اور شکر گزار ہوئی......مگر اب......جب سے وہ اس کی فرینڈ لسٹ میں ایڈ ہوا تھا......پہلے پہل تو اس نے نوٹس ہی نہیں لیا اور اس کے ہر کمنٹ کا جواب ایک مسکراتے آئکون سے دے دیا اور شاید اسی سے اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے کھل کر اس کی ہر تخلیق میں عیب نکالنا شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ تنقید سے نہیں گھبراتی تھی مگر اس کا لہجہ، اس کے نپے تلے طنزیہ جملے سیدھے دل پر وار کرتے۔ اس کا اپنی تحریر پر سے اعتماد اٹھنے لگتا۔ گو کہ وہ اسے نظر انداز کر کے اپنی پوسٹ پہ ہنسی مذاق کرتی رہتی مگر لاشعوری طور پر اس کے کمنٹ کی منتظر بھی رہتی مگر ہر بار ہی اس کی تضحیک نما تنقید اس کو چڑا دیتی۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ پلٹ کر ایسا جواب دے کہ اس کی طبعیت صاف ہو جائے مگر ساتھ ہی اپنی ساکھ کا بھی خیال آجاتا۔ یہ احساس رہتا کہ فیس بک پر اس کی شخصیت کا تاثر ایک مہذب اور ادبی شخصیت کے طور پر موجود ہے۔ ان باکس کے استعمال میں اس کی اپنی انا آڑے آجاتی کہ اسے یہ کیوں کر احساس دلایا جائے کہ اس کی رائے کی بہت اہمیت ہے۔ آج کا افسانہ تو اس نے پوسٹ کرنے سے پہلے دو معتبر لوگوں کو دکھا کر اصلاح بھی لے لی تھی۔ معمولی سی تصحیح کے بعد دونوں نے ہی اسے بے حد پسند کیا اور شائع کرنے کی سند دے دی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے خامی نکالی۔

''گو کہ پوری کہانی شاندار ہے......بس آخری حصہ یا تو لکھا ہی نہیں جانا چاہیے تھا یا پھر کسی کردار کی انفرادی سوچ کے حوالے سے بیان ہونا چاہیے تھا- کہانی کار کو کہانی میں گھسنے کی کوشش بلاوجہ نہیں کرنی چاہیے۔''

''ہنہ......!'' وہ جھنجھلا گئی۔ اچھا......اگر یہ بات درست بھی ہو کیا ہمیشہ بالکل صحیح تجزیہ کر کے کمنٹ کرنا ضروری ہے؟ کبھی کسی خامی کو نظر انداز بھی تو کیا جا سکتا ہے۔''

کچھ کمنٹس کے بعد اس کے اگلے کمنٹ نے تو آگ ہی لگا دی۔



''ویسے محترمہ سے اتنا اچھا لکھنے کی امید تو نہ تھی، اغلب گمان ہے کہ یہ تحریر مسروقہ تو نہیں......یا کم سے کم چربہ......''

وہ غصے کی شدت سے کپکپا گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے جواب ٹائپ کرنا چاہا مگر وفور جذبات سے آنکھیں بھر آئیں اور اسکرین دھندلا گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے چاروں طرف بہت ساری آوازیں جمع ہو گئی ہوں......آوازیں باہم گونجنے لگیں۔ ''یہ سرقہ تو نہیں، یہ چربہ تو نہیں؟'' ہر کمنٹ چیخ رہا تھا۔ سب کی پروفائل پکچرز اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں اور اشارے کر رہی تھیں......''بتاؤ، بتاؤ، یہ سرقہ تو نہیں، یہ چربہ تو نہیں......؟''

اس نے گھبرا کر لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ اب میز پر ترتیب سے رکھی کتابوں نے ہوا میں رقص کرتے ہوئے پوچھنا شروع کر دیا۔ ''سنو، سنو، یہ سرقہ تو نہیں، یہ چربہ تو نہیں؟'' پھر ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی پرفیوم اور کاسمیٹک کی بوتلیں بھی اس کورس شامل ہو گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرے کی ہر چیز اس کے چاروں طرف طواف کر رہی تھی اور ایک ہی سوال کر رہی تھی۔ ''یہ سرقہ تو نہیں، یہ چربہ تو نہیں؟''

''نہیں! اس نے بے آواز چیختے ہوئے جواب دیا۔'' کمرے میں یکدم سکوت چھا گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ نفرت کی شدت سے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

''ایسا کیا کروں کہ اس کے دل کو بھی ٹھیس پہنچے......'' اس نے انگلیاں تیزی سے چٹخانا شروع کر دیں۔ کچھ سوچ کر اس نے دوبارہ لیپ ٹاپ آن کیا۔ اس کی وال پر پہنچی اور بلاک کا آپشن کلک کر دیا۔ اسکرین پر تصدیق کے لیے لکھا گیا۔

Are you sure you want to block this person?/ This person will no longer able to;//CancelConfirm

کنفرم پر کرسر رکھا تو بے اختیار دل بھر آیا اور جھر جھر آنسو بہنے لگے۔

''الّو کا پٹھا......'' اس نے سسکاری لی۔

''ہاں ہاں......الّو کا پٹھا......؟ قریب رکھے پین ہولڈر نے سرگوشی کی۔ پھر کیا تھا آہستہ آہستہ کمرے کی ہر چیز نے حمایت کر دی۔

''الّو کا پٹھا......الّو کا پٹھا......''

اس نے کینسل پہ کلک کیا اور کھلکھلا کے ہنس پڑی......دل کا سارا غبار چھٹ گیا تھا......

◄◄ ● ►►

R 78 Decent Town
Block 7 Gulistan e Johar Karachi(Pakistan)

● فلیش فکشن

● ڈاکٹر سہیل

# ایلن

زمین کے سینے پر فرضی لکیر،ایک غیر مرئی دیوار،تقسیم کی علامت،اپنوں کی تقسیم،خاندان کی تقسیم،وطن کی تقسیم،وراثتوں کی تقسیم......پھر تباہی و بربادی۔دیواریں تو آہنی سلاخوں اور سیمینٹ سے بنتی ہیں ،مکان اور بستی تو محبت سے آباد ہوتے ہیں۔نفرت سر اُٹھاتی ہے تو گھروں میں دیواریں خود اُٹھ جاتی ہیں۔

توپوں کے خونخوار منھ سے دل خراش آوازوں کے ساتھ نکلے سیاہ زہریلے دھوئیں نے آسمان کو گہری چادر سے ڈھک لیا تھا۔بوڑھے، بچے، جوان مرد اور عورتوں کے چھوٹے بڑے قافلے اماں کی تلاش میں نا معلوم منزلوں کی جانب رواں دواں تھے۔۔زندگی سے مایوس، کچھ دن جی لینے کی تمنا......طاقت کی برتری اور ملک گیری کے شیطانی خمار سے پناہ کی فکر......سروں پہ سیاہ مسموم دھوئیں سے چھپا آسمان اور پیروں کے نیچے گرم ریت کا فرش۔

دن گزرا،شام آئی،رات بڑھی،صبح کی پو پھٹی......سمندر کا ساحل......تھکے ماندے دم لینے بیٹھ گئے۔

سمندر کی سطح پر سلوٹوں پر ڈوبتا اُبھرتا سرخ کپڑوں میں ملبوس کوئی ننھی سی جان ہچکولے لے رہی تھی۔ایسے معصوم بچے کی طرح جسے دن بھر کھیلنے کودنے کے بعد دنیا سے بے پروا اماں کی آغوش میں گہری نیند لے رہا ہو۔چھوٹے چھوٹے ہاتھ مُڑے ہوئے تھے اور چہرہ پانی میں......آفتاب پورے طور پر نمودار ہوا۔روشنی پھیل گئی۔کئی پیر سمندر کے پانی کی طرف بڑھے۔ہاتھوں نے مشقت سے ننھی سی جان کو اُٹھایا۔ایک بچے نے کہا۔

’’پاپا! یہ تو ڈوب کر مرگئی۔‘‘ باپ نے کراہتے ہوئے کہا۔

’’بیٹا! یہ ایلن کردی ہے۔صرف ایلن نہیں اس کے ساتھ انسانیت بھی غرقاب ہوتی نظر آرہی ہے۔‘‘

چہار سو خاموشی ہی خاموشی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

Top Khana Bazar,
Munger-811201



● ناول کا ایک باب

● اقبال حسن خان

# راج سنگھ لاہوریا

’’ہاں۔میں نے طلاق کے فوراً بعد اپنا کام شروع کر دیا تھا۔میں برطانیہ کے تین اخباروں کے لئے یہاں ہندوستان میں کام کرتی ہوں۔‘‘

اب میرا حوصلہ اتنا ہو چکا تھا کہ میں اُس سے مزید سوالات کر سکتا تو میں نے کہا۔

’’تو مسٹر رابرٹ سے شادی ہونے اور طلاق کے وقفے کے دوران آپ نے کبھی شادی کا نہ سوچا؟‘‘

وہ ہنسی تو اُس کے دانتوں میں جیسے میرے سامنے چمکنے والی بجلی سی چمکی۔

’’تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے اس باسٹرڈ سے شادی کر رکھی ہے؟‘‘

میں اُس وقت سگریٹ کا کش لے رہا تھا۔میرا ردعمل اتنا شدید کہ دھواں جیسے میرے گلے میں پھنس گیا اور میں نے کھانسی روک کر کہا۔

’’لیکن یہاں تو سبھی......‘‘

اُس نے میری بات کاٹی۔

’’مجھے پتا ہے لیکن مجھے تصدیق یا تردید کی کیا ضرورت ہے۔عورت کو شدت سے دسراہٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور اُس عورت کو تو بہت ہی ضرورت ہوتی ہے جس نے ایک مرد کے ساتھ تین سال اُس کی بیوی کی حیثیت سے گزارے ہوں۔تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟‘‘

میں نے اُسے بتایا کہ ایسا ہی تھا اور پھر میرے شیطانی دماغ میں ایک اور سوال اُبھرا اور میں نے مناسب جانا کہ لگے ہاتھوں یہ بھی پوچھ ہی لوں۔ویسے یہ سوال کرتے وقت مجھے یہ ڈر ضرور تھا کہ وہ کہیں میری بات کا برا نہ مان جائے۔میں نے بات ذرا گھما پھرا کر کی۔

’’طلاق اور مسٹر رابرٹ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرنے کے بیچ تو کتنے ہی سال گزر گئے ہوں گے، ہے نا؟‘‘

میرا سوال سن کر اُس نے چند لمحوں تک میری آنکھوں میں دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

’’تم بڑے بدمعاش ہو۔تم یہ پوچھنا چاہ رہے ہو کہ ان سالوں تک میں کیا کرتی رہی؟ دو چار دوستیاں کیں میں نے لیکن زیادہ وقت میں تنہا ہی رہتی رہی۔میرا فلیٹ اب بھی دلی میں خالی پڑا ہے۔جب کبھی دلی جاتی ہوں وہیں ٹھہرتی ہوں۔‘‘

نیاز محمد برامدے میں آیا۔وہ اور کیٹی شاید اشاروں میں باتیں کرتے تھے۔وہ کسی قسم کا اشارہ ہی تھا جب نیاز محمد نے چائے کے برتن اُٹھائے۔مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی کیونکہ میں نے چائے کے ساتھ آنے والے لوازمات سے خوب انصاف کیا تھا۔پیشاب البتہ بہت شدت سے محسوس ہو رہا تھا اور اسی لیے میں اُس سے اجازت لینے میں بھی جلدی کرنا چاہتا تھا۔کیٹی نے نجانے کیا سوچ کر اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔

’’تم شراب پیتے ہو؟‘‘

میں گڑبڑا گیا تو میں نے جلدی سے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

’’نہیں نہیں۔بالکل بھی نہیں۔‘‘ کیٹی ہنسی اور بولی۔

’’میں جانتی ہوں ہندوستان میں کسی سے ایسا سوال کرنا اچھی بات نہیں ہے لیکن پھر بھی میرا دل چاہا کہ تم سے پوچھوں۔تو تم نے کبھی بھی شراب نہیں پی؟‘‘ مجھے اس عورت کے سامنے جو مجھ سے ساری شام انتہائی مہربانی سے پیش آتی رہی تھی، جھوٹ بولنا اچھا نہیں لگا۔جب میں ہوسٹل میں رہتا تھا تو ہمارا ایک دوست چوہدری احسان جو لاہور کے قریب کسی گاؤں کے زمیندار کا بیٹا تھا، مہینے میں دو چار مرتبہ کمرے میں شراب پیا کرتا تھا اور اصرار کر کے مجھے اور ہمارے تیسرے ساتھی کو بھی پلا دیا کرتا تھا۔میں نے کہا۔

’’پی ہے۔جب میں ہوسٹل میں رہتا تھا۔‘‘ میرا جواب سن کر کیٹی کے چہرے پر خوشی پھیل گئی اور وہ بولی۔

’’تو کسی دن میں اور تم بھی ایک ساتھ بیٹھ کر پئیں گے۔میں رابرٹ کے ساتھ شراب کا لطف نہیں لے سکتی کیونکہ وہ بہت زیادہ پیتا اور جلدی اول فول بکنے لگتا ہے۔مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینے سے اُلجھن ہوتی ہے۔‘‘

وہ شام اتنی خوبصورت تھی، کیٹی کی باتیں اتنی خوبصورت تھیں اور جب سے وہ اپنا آپ مجھ پر دھیرے دھیرے کھول رہی تھی، مجھے اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ بات کسی اور شام پر نہ جائے۔میں ابھی، اسی وقت اُس کے ساتھ شراب پینے کو تیار تھا لیکن مجھے تھوڑا سا وقفہ چاہئے تھا کیونکہ میرا مثانہ پھٹا جا رہا تھا۔کیٹی کو کسی قسم کی جلدی نہیں تھی تو وہ بولی۔

’’اچھا حامد۔اب میں کچھ کام کروں گی۔تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔میرے خیال میں تمہارے پاس شام کو کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔تم کبھی کبھی مجھ سے ملنے آؤ گے نا؟‘‘ میں یقیناً ایسا ہی کرنے والا تھا تو میں نے کہا۔

’’میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ سے میری ملاقات ہوگئی اور آپ کی وجہ سے میرا وقت اتنا



اچھا گزرا۔میں ضرور ایسا کروں گا۔‘‘

کیٹی کھڑی ہوئی تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔کیٹی نے مسکرا کر میری آنکھوں میں دیکھا اور الوداعی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔میں نے اُس کا ہاتھ تھاما تو یہ ہاتھ برستی بارش میں تھاما جانے والا ہاتھ نہیں تھا، اس سے نرمی کے ساتھ ساتھ ایک ایسی گرمی بھی پھوٹ رہی تھی جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔میں نے کیٹی کا ہاتھ چھوڑا اور تیزی سے برامدے کی سیڑھیاں اُترا۔میں جلد از جلد اپنا مثانہ خالی کر دینا چاہتا تھا۔میں نے میدان کے وسط میں پہنچ کر گھوم کر دیکھا۔کیٹی ابھی تک برامدے میں کھڑی تھی۔اُس نے ہاتھ ہلایا تو میں نے جواب میں ہاتھ ہلایا اور تیزی سے اپنے کوارٹر کی طرف بڑھا۔

نیاز محمد رات کو ہوٹل سے میرا کھانا لے کر آیا تو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر بھی میں نے کچھ نہ کچھ کھا لیا۔نیاز محمد برتن واپس لینے آیا تو بیڑی سلگا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

’’تم نے کیسے واقفی پیدا کر لی رابرٹ صاحب کی لُگائی سے؟ وہ تو کسی کو منہ ہی نہیں لگاتی۔‘‘

یہ بڑا نازک سوال تھا اور اگر میں کہیں بھی چُوک جاتا تو یہ بات کسی اور رنگ میں آس پاس کی کوٹھیوں میں مشہور ہوتے ذرا بھی وقت نہ لیتی۔میں نے ہنس کر کہا۔

’’اوہ، ہاں، اچھا وہ؟ رابرٹ صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میری بیوی اکیلی ہوگی دو چار دن تو اُس کے ساتھ کچھ وقت گزار لینا۔‘‘ نیاز محمد انگریزوں کا پرانا خادم تھا۔وہ ہنسا اور بولا۔

’’اوہ اچھا اچھا۔تو یوں بولو نا کہ میم صاب کو کومپنی دے رہے تھے؟ ہاں مجھے پتا ہے۔ان سالوں کو کومپنی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے، پر تم اپنے بندے ہو تو صاف بات کرتا ہوں۔یہ سالیاں ہوتی بڑی مرد مار ہیں۔مجھے کتنی ہی ایسی شٹوریوں کا پتہ ہے کہ جب بات کومپنی سے بہت آگے چلی گئی۔سری نگر میں ایک بیرہ تھا عزیز۔بڑا تنگڑا جوان تھا۔پتہ نہیں کیسے میم صاحب کو پھانس لیا۔نمک حرامی کرتے تھے دونوں۔ایک دن صاب اُوپر سے آ گیا۔عزیز کو گولی ماردی۔عزیز بچ تو گیا مگر گولی پتہ نہیں کہاں لگی تھی کہ عمر بھر کو اپاہج ہو گیا۔‘‘ میں کسی حرامخور بیرے کے اس ہولناک انجام پر کانپ گیا لیکن چونکہ میں نے کوئی نمک حرامی کی تھی اور نہ ہی ارادہ تھا تو میں نے کہا۔

’’نہیں نہیں۔ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔وہ بڑی ہے مجھ سے عمر میں۔اچھا یہ تو بتاؤ کہ عزیز کو تو گورے صاب نے گولی ماردی تھی، میم صاب کا کیا ہوا؟‘‘

نیاز محمد نے بیڑی کا آخری کش لے کر بیڑی پیر تلے بجھائی اور اُٹھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

’’کیا ہونا تھا سالی کا؟ کچھ بھی نہیں۔پھر وہ سالا بدلی ہو کے جالندھر کینٹ چلا گیا تھا۔پر وہ عورت بڑی حرامزادی تھی۔شاید کسی اور کو گولی مروادی ہو اب تک۔‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلا کر نیاز محمد کو یقین دلایا کہ بدمعاش عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جب میں اُس رات کپڑے بدل کر لیٹا اور کھڑکی سے آنے والی ٹھنڈی ہوا مجھے لوریاں دینے لگی تو میں نے کیٹی کے بارے میں سوچا۔ کسی عورت تھی وہ؟ ایک مرد سے طلاق کے بعد کتنے مردوں سے دوستیاں کر چکی تھی اور اب ایک مرد کے ساتھ بغیر شادی کے رہ رہی تھی؟ میری ہندوستانی ذہنیت یہ سب قبول نہیں کر رہی تھی لیکن دوسری طرف اُس کی باتیں، اُس کا سچ اور مجھ سے پھر کبھی ملنے کے اصرار نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ کیٹی کی ذاتی زندگی میرا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک اچھی عورت تھی۔ شاید اچھی دوست بھی ثابت ہوتی۔ میں یہی سوچتے سوچتے سو گیا۔

حُسینا چاچا کو اکثر مجھ سے یہ گلہ رہتا تھا کہ میں اُن کے پاس کم کم آتا جاتا ہوں اور یہ گلہ شاید اُنہوں نے ابا جی کے نام کسی خط میں بھی کیا تھا۔ میرے ابا جی کو ان معنوں میں نیم خواندہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ پڑھ سکتے تھے، لکھ نہیں سکتے تھے تو ان کا خط جب مجھے ملا تو میں نے یہ تحریر فوراً پہچان لی۔ یہ میرے پھپھی زاد سلطان کی تحریر تھی جسے میں بوجوہ پسند نہیں کرتا تھا۔ سلطان میرا ہم عمر تھا اور ہم اکٹھے کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ سلطان نے پانچویں یا چھٹی جماعت سے تعلیم چھوڑ دی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ، بڑے بازار میں کریانے کی دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔ وہ ابا جی کو اس لئے بہت پسند تھا کہ وہ پہلوان بھی تھا اور دو چار کشتیاں بھی جیت چکا تھا۔ سلطان اپنی پہلوانی کو بدمعاشی کے مقاصد کے لئے بھی استعمال کرتا تھا اور اس کو ناپسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ جب میں ہوسٹل میں رہتا تھا تو مجھے اُسی کی تحریر میں، ابا جی کی طرف سے لکھوائے گئے خطوط ملتے تھے جن کے آخر میں وہ اپنی طرف سے حرمزدگی سے بھرپور کوئی جملہ بھی لکھ دیتا تھا جس سے مجھے بڑی چڑ ہوتی تھی۔ سلطان کا ذکر تو ضمناً آ گیا، میں حُسینا چاچا کی بات کر رہا تھا۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ حُسینا چاچا مسلم لیگی تھے اور جناح صاحب کے انتہائی درجے کے معتقد بھی۔ اُس زمانے میں پنڈی کا اندرون شہر ہندوؤں اور سکھوں سے بھرا پڑا تھا اور مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ ہندو اور سکھ مسلم لیگ یا پاکستان والے مطالبے پر زیادہ چراغ پا بھی نہیں ہوتے تھے۔ شہر میں ہم آہنگی کا عمومی ماحول تھا۔ یہ ماحول کیسے خراب ہوا؟ اس کی ٹھوس وجوہات ہیں اور ان میں سب سے نمایاں وجہ مسلم لیگ کی دوسرے درجے کی قیادت کے وہ احمقانہ بیانات ہیں جنہوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو مجوزہ پاکستان میں 'شریعت' کے نفاذ سے ڈرا دیا تھا۔ ہمارے علماء جب سٹیج پر کھڑے ہو کر پاکستان بننے کے بعد کا نقشہ کھینچا کرتے تھے تو اُن کا تمام زور خطابت 'اسلامی قوانین' کے نفاذ پر ہوتا تھا۔ چوروں، زانیوں اور شرابیوں کے لئے عبرت ناک سزائیں اور نتیجتاً ایک ایسے 'اسلامی' معاشرے کا قیام جہاں، اسلام کے نکتہ نگاہ سے گناہ گاروں کو عبرت کا نشان بنا دینا یقینی تھا۔

جناح صاحب جو مسلم لیگ اور ہندوستانی مسلمانوں کے سرخیل اور پاکستان کے قیام کے سب سے



بڑے داعی تھے، کسی اور طرح سوچتے تھے۔ ان کا زور قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی ترقی پر ہوتا تھا جسے وہ انگریزوں کی رخصتی کے بعد اور ہندو اکثریت والی جمہوری حکومت میں، غلط یا درست، ناممکن سمجھتے تھے۔ اُنہیں خدشہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہاں جو جمہوری حکومت قائم ہوگی وہ ایسے قوانین یا ہندوستانیوں کے جینے کا لائحہ عمل، اپنی اکثریت کی بنا پر ترویج دے سکتی تھی جس میں مسلمان گھاٹے میں رہتے۔ اس پر بحث کی جا سکتی ہے کہ یہ خدشات کس حد تک درست تھے، اس پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد کیسے حالات پیدا کر دیئے گئے اور ہندوستان سے مستقل دشمنی کا بندوبست، ہندوستان اور پاکستان نے کیسے کیا لیکن یہ بات درست ہے کہ جناح صاحب پورا بنگال اور پورا پنجاب مسلمانوں کے لئے لینا چاہتے تھے اور یہ مطالبہ آبادی کی بنیاد پر تھا کیونکہ متذکرہ علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی قریب قریب پینسٹھ فی صد تھی لیکن یہ تقسیم مسلم لیگ کی منشا کے مطابق کیوں نہ ہو سکی، اس کا بڑا سبب ہندوؤں اور سکھوں کا، قیام پاکستان سے پہلے شریعت کے نفاذ والا ڈراوا تھا۔ جب تقسیم ہوئی تو مسلمانوں کے حصے میں وہ کٹا پھٹا پاکستان آیا جس کے ایک سے دوسرے حصے کے درمیان گیارہ سو میل کا فاصلہ تھا اور اس فاصلے کے درمیان وہ قوم آباد تھی کہ جس کے آبائی وطن کو مسلمانوں نے ٹکڑے کر کے اپنے لیے پاکستان حاصل کیا تھا۔ میں پوری ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ اگر مسلم لیگ کی قیادت جناح صاحب کے تصور پاکستان کے مطابق پاکستان کے بارے میں طرز عمل اپناتی تو مسلمانوں کو پورا بنگال اور پورا پنجاب مل سکتا تھا۔ جناح صاحب کو آج جس صحرائی مجاہد کے روپ میں پاکستان میں پیش کیا جاتا ہے، اُن کا اس تصور سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ انگریزی تعلیم سے بہرہ ور، انگریزی انداز میں بمشکل اردو بولنے والے اور انگریزوں کی طرح زندگی جینے والے ایک لیڈر تھے جن کے دل میں بہر حال مسلمانوں کا درد تھا اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ ان کی نیت پر شبہ کرے۔ وہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کو امریکہ اور کینیڈا جیسے تعلقات والے ملک دیکھنا چاہتے تھے لیکن اُن کے بعد آنے والی قیادت وقت کے ساتھ نہ چل سکی۔ ہندوستان سے تعلقات سرد مہری اور بعد ازاں تین جنگوں نے مزید خراب کئے تو پاکستان کو لُوٹ کا مال سمجھنے کی روش نے پاکستان کو اس نہج پر بھی پہنچا دیا، جہاں آج ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔

اتوار والے دن میں نے اپنی کرائے کی سائیکل نکالی اور حُسینا چاچا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں وہاں پہنچا تو اُن کی بیٹھک میں چار چھے لوگ جمع تھے اور موضوع اُن کا پسندیدہ یعنی سیاست تھا۔ ان حاضرین میں مجھے سے زیادہ دلچسپ کردار مختار سنگھ کا لگتا تھا۔ وہ پشتینی رئیس تھا اور ہر اتوار اپنی وسیع جائیداد پر، جو نالہ لئی کے کنارے دُور تک پھیلی ہوئی تھی کبھی کشتیاں اور کبھی گھوڑوں کی ریس کروایا کرتا تھا۔ یہ ریس اُس کا شوق تھا جس پر پنڈی کے جوارئیے شرطیں بدا کرتے اور بعد ازاں خاطر خواہ نتائج نہ ملنے پر ایک دوسرے کے سر پھاڑا کرتے تھے۔ میں نے بھی ایک ایسی ریس دیکھی تھی۔

''میں کہتا ہوں اگر پاکستان بنانا ہی ہے تو پھر ویسے کیوں نہیں بناتے جیسے پہلے بھی ایک دفعہ

بات چلی تھی کہ ہندوستان کے اندر ہی بنالیں۔ یہ دوملکوں والی کونسی تُک ہے؟''

یہ بات سردار مختار سنگھ نے کی تھی۔

اس کا جواب ایک ایسے آدمی نے دیا جو کونے میں قدرے سہما بیٹھا تھا یا کم از کم مجھے سہما ہوا لگ رہا تھا لیکن جب وہ بولا تو میں اُس کی بھاری اور پاٹ دار آواز سن کر حیران رہ گیا۔ اُس نے کہا۔

''یہ بھی کہا تھا جناح صاحب نے پر تمہارے نہرو نے بیچ میں بھانجی ماردی۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان کانگریسیوں کی حرکتیں دیکھ کر لگتا ہے کہ انہیں جناح سے زیادہ پاکستان بنانے کی جلدی ہے۔ کیوں حُسینے؟''

حُسینا چاچا جو اُس وقت نوکر کا تازہ کیے ہوئے حقے کو اپنے سامنے رکھ رہے تھے، کش لگانے سے پہلے مسکرائے اور کھنکھار کر بولے۔

''یہ بات ٹھیک ہے۔ پاکستان بنانے کی ضرورت کبھی پیش نہ آتی اگر یہ ہندو ذرا سے حوصلے سے کام لیتے۔'' ایک ڈھیلی پگڑی اور میلی شلوار والے نے، جس کا نام مجھے بعد میں گردھاری معلوم ہوا، قدرے تلخی سے کہا۔

''ناں۔ کونسے حوصلے کی بات کر رہا ہے۔ ہزار برس سے تمہیں برداشت کر رہے ہیں، اور کونسا حوصلہ چاہئے تمہیں؟''

وہ حسینا چاچا کے دوستوں کی محفل تھی اور کوئی سیاسی جلسہ نہیں تھا تو وہاں کسی تلخی کا ماحول نہیں تھا۔ اس پر مختار سنگھ ہنسا اور گردھاری کو ماں کی گالی دے کر بولا۔

''بات ٹھیک ہے۔ یہ ابھی تم کانگریسیوں کی جو حکومتیں بنی تھیں، تم نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی اچھی تو نہیں کی تھی ماں.........''

گردھاری تڑخ کر بولا۔ ''مطلب اتنی سی بات پہ ملک کے دو ٹوٹے کر دیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

مختار سنگھ اور دوسروں نے اس سوال کا جواب لینے کے لیے حسینا چاچا کی طرف دیکھا جس نے دو تین کش جلدی جلدی لئے اور حقہ اپنے برابر میں بیٹھے ایک سفید پوش اور لمبی مونچھوں والے آدمی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ تم تیس کروڑ ہو اور ہم مشکل سے آٹھ کروڑ۔ ٹھیک ہے اس وقت تم کہہ رہے ہو کہ ہم انڈیا کے دستور میں مسلمانوں کو سبھی حقوق دیں گے، سسٹم جمہوریت کا ہوگا جس میں اکثریت کے بل پر آئین میں کوئی بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ کل اگر تم نے آئین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے مسلمانوں کو ایک طرف کر دیا تو ہم کیا کرلیں گے تمہارا؟ اس لیے جناح صاحب جو کہتے ہیں، ٹھیک کہتے ہیں۔ یار میں تو کہتا ہوں کہ بعد میں جو رولا پڑے گا، اس سے بہتر یہی ہے کہ اسی ٹیم پہ فیصلہ ہو جائے۔''

اس وقت صرف پاکستان، مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے بارے میں سوچا جا رہا تھا۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک اور اس تحریک میں پاکستان والا قصہ چل رہا تھا۔ ہندوستان بٹنے جا رہا



تھا اور چونکہ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا تو لوگوں کے تبصروں میں پاکستان اور آزادی کا جوش تو تھا لیکن اتنا عظیم واقعہ ہو جانے کے بعد پیدا ہونے والے نتائج کے حوالے سے بے خبری بھی۔

پاکستان کا بننا ایک سیاسی واقعہ تھا لیکن اس نے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں پر جو معاشرتی اثرات چھوڑے اُن کا جائزہ لینے بیٹھیں تو تینوں اقوام خسارے میں دکھائی دیتی ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی ہزار سال میں تعمیرہ شدہ یادگاریں چھوڑیں تو سکھوں نے اپنے مغربی پنجاب کے اہم ترین مذہبی مقامات۔ ہندوؤں کو اپنے بڑے بڑے کاروبار اور جائیدادیں ہمیشہ کو تجنا پڑیں۔ چونکہ تقسیم کے فوراً بعد ہی سے دونوں ملکوں نے دشمنی پال لی اور آزادانہ آمدورفت پر بے جا پابندیاں عاید ہوئیں تو پرانے رشتے ناطے اور دوستیاں وقت کی گرد میں چھپتی گئیں اور نئی نسلیں ایک ازلی دشمنی کے زمانے میں جوان ہوئیں۔

سچ تو یہ ہے کہ میں نوجوان ضرور تھا، مسلمان بھی تھا لیکن مجھے سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میری سیاسی طور پر جو بھی تھوڑی بہت معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا وہ پنڈی آنے کے بعد ہوا تھا۔ میں پاکستان اور اس کی تحریک سے ضرور واقف تھا لیکن مجھے پاکستان بننے سے زیادہ دلچسپی ہندوستان کی آزادی سے تھی۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو اس پر کس کی حکومت ہونے سے کس کو فرق پڑے گا؟ نہ ہی میں نے کبھی یہ تصور کیا تھا کہ میرے خاندان کو ایک دن اپنا آبائی شہر چھوڑ کر مغربی پنجاب میں آباد ہونا پڑے گا۔ تقسیم کے وقت ہونے والے خونیں فسادات تو کسی کیسان وگمان میں بھی نہ تھے۔

میری نوکری چل رہی تھی۔ ہر مہینے ٹکی بندھی تنخواہ مل جاتی تھی جو میرے اخراجات سے زیادہ تھی تو میں کچھ پیسے اماں کو بھیج دیا کرتا تھا۔ یہ جان کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ میرے والدین میرے برسرِ روزگار ہونے پر بہت مطمئن تھے۔

جنگ ہو رہی تھی تو مجھے ذاتی طور پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا، جنگ ختم ہوئی تو مجھے زندگی ویسی ہی یکساں رفتار سے چلتی نظر آئی۔ دو بجے میں دفتر سے آجایا کرتا تھا اور میرے لیے وقت کاٹنا مشکل ہوتا تھا۔ میرے گھر سے قریب تین چار سنیما تھے جن میں عموماً انگریزی فلمیں چلتی تھیں، میں ہفتے میں دو تین شامیں یہ فلمیں دیکھنے میں گزارتا تھا لیکن پھر میرا جی اس سے بھی بھر گیا تو میں نے اپنے ابا جی کی طرح، جنہوں نے ہمارے گھر کے آنگن کے ایک حصے کو سبزیاں لگانے کے لیے مختص کیا ہوا تھا، اپنے گھر کے سامنے والے بڑے سے میدان کے کچھ حصے کو ہموار کر کے وہاں موسمی سبزیاں لگانا شروع کر دیں۔ میرا جی اس کام میں لگ گیا اور اب وہی وقت جو مجھے کاٹنے کو دوڑتا تھا، کم لگنے لگا۔ جسمانی مشقت کی وجہ سے مجھے نیند بھی خوب آنے لگی تھی۔ میری لگائی سبزیاں بہت ہی وافر اور عمدہ قسم کی تھیں تو نیاز محمد بیرہ اور خانساماں شریف مجھ سے بہت خوش تھے۔ نیاز محمد کے چونکہ آس پاس کی کوٹھیوں کے تمام ملازمین سے دعا سلام تھی تو وہ اکثر یہ سبزیاں اُن میں بانٹ بھی دیا کرتا تھا۔ خانساماں

شریف اتنا شریف نہیں تھا جتنا میں اُسے سمجھتا تھا۔ وہ رابرٹ کے گھر کے لیے سودا سلف کے پیسے اپنی جیب میں رکھتا اور میرے ’کھیت‘ سے سبزیاں توڑ کر لے جاتا۔ بہر حال مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی میں ٹوکرا بھر سبزیاں حسینا چاچا کے گھر بھی لے جاتا جنہیں اس تحفے کو پا کر بڑی خوشی ہوتی۔

برسات کی اُس بھیگی شام کے بعد میری کیٹی سے ویسی ملاقات پھر نہیں ہوئی تھی جیسے اُس کی چائے کے دعوت کے وقت ہوئی تھی یعنی ہم نے دو ڈھائی گھنٹے تک گفتگو کی تھی اور اب اس واقعے پر بھی کوئی پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ نیاز محمد بیرے سے مجھے البتہ کیٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ وہ کب دلی گئی، کب واپس آئی اور کب اُس کا اور رابرٹ کا جھگڑا ہوا تو رابرٹ نے شراب پی رکھی تھی۔ نیاز محمد بیرا رازدارانہ انداز میں کہا۔

’’میں تو کہتا ہوں کہ میم صاب کو اس کنجر سے طلاق لے لینی چاہئے۔ شریف عورت ہے۔ پتا نہیں کہاں پھنس گئی ہے؟‘‘

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کیونکہ اتنے دنوں میں عین میرے اندازے کے مطابق میں نے نیاز محمد کو اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی اِدھر کرتے سنا تھا۔

’’وہ جی یاراں لمبر والی کوٹھی نئیں؟ جس کے صاب نے بڑے بڑے کتے رکھے ہوئے ہیں؟ وہی جی جس کی میم صاب چڈی باڈی پہن کے دھوپ سینکتی ہے اپنے لان میں؟ اُس کی بڑی لڑکی ایک گورے کے ساتھ بھاگ گئی۔‘‘

نیاز محمد اپنی بات کا ردعمل میرے چہرے پر تلاش کرنے کو رکا تو میں نے اُس کا دل رکھنے کو کہا۔

’’اوہ۔ پھر؟‘‘ نیاز محمد نے عادتاً اِدھر اُدھر دیکھ کر آواز نیچی کی اور بولا۔

’’پر جی عجیب بات ہے۔ ہماری لڑکیوں کی طرح نہیں بھاگتیں ان گوروں کی لڑکیاں۔‘‘

کم بخت ہمیشہ ایسے وقت میں بات ادھوری چھوڑتا کہ میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتا اور میرے اندر یہ جاننے کی خواہش بیدار ہوتی کہ گوروں کی لڑکیاں کیسے بھاگتی ہیں؟

’’کس طرح بھاگتی ہیں گوروں کی لڑکیاں؟‘‘

نیاز محمد نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے اور فارسی ضرب المثل کا پنجابی ترجمہ کیا۔

’’سچ جھوٹ کا عذاب بشیر علی بیرے پر ہے جی۔ وہی کہہ رہا تھا کہ جب چھوکری اُدھر کلکتے میں نوکری کرتی تھی تو اُس کی آنکھ کسی گورے سے لڑ گئی تھی۔ چھٹی پر گھر آئی تو وہ گورا بھی ساتھ تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا کہ یہ میرا دوست ہے۔ خیر دوست والی بات تو یہ انگریز اتنی بری نہیں سمجھتے۔ اور جی قسم اللہ پاک کی وہ



ایک ہی کمرے میں سوتی تھی اپنے دوست کے ساتھ۔ نالت ہے جی ان بے غیرتوں پر۔‘‘

یہاں تک گفتگو مکمل کر کے وہ ڈرامائی تاثر کو دگنا کرنے کی غرض سے بیڑی سلگانے لگا لیکن اُس نے اپنی نگاہیں مجھ سے نہ ہٹنے دیں۔ پھر ایک طویل کش لے کر کچھ دھواں منہ اور کچھ ناک سے نکال کر بولا۔

’’خیر جی۔ اُس دن جب وہ کلکتے واپس جا رہی تھی اُس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ اس گورے سے شادی کرنا چاہ رہی تھی۔ لو جی، گھر میں طوفان نہیں آ گیا؟ بڑی لڑائی ہوئی۔ صاب بار بار اندر جاتا اور باہر نکلتا تھا۔ بڑی مادر فادر کر رہا تھا۔ بعد میں بشیر علی بیرے نے بتایا کہ اُس چھوکری کا یار اصلی انگریز نہیں تھا حالانکہ شکل بالکل انگریزوں والی تھی۔‘‘

یہ بات میری سمجھ سے بالا تھی تو میں نے حیرت سے کہا۔

’’اصلی انگریز نہیں تھا تو کون تھا؟‘‘

اس پر نیاز محمد بیرا یوں مسکرایا کہ میں اُس کے چہرے پر اپنے لیے لفظ چغد بہت واضح دیکھ سکتا تھا۔ پھر وہ بولا۔

’’اُس کی ماں انگریزن تھی اور باپ دیسی ہندوستانی۔ ایسے لوگوں کو ’ایمبلو انڈین‘ کہتے ہیں جی اور یہ جو اصلی والے انگریز ہوتے ہیں نا، انہیں اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔‘‘

اس نے اپنا علمی انکشاف کر کے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

’’اچھا۔ وہ بھاگنے والی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔‘‘

نیاز محمد بیرہ ہنسا اور بولا۔

’’لو جی ماں باپ کے سامنے نکل گئی سسری اور سنا ہے کلکتے جا کر شادی کر لی۔ سالے ٹاپتے ہی رہ گئے۔‘‘

یہ اور اس نوع کی اکثر کہانیاں مجھے نیاز محمد سے سننے کو ملتی تھیں جن سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ کسی کی بات مجھے بتا سکتا تھا، تو میری بات بھی کہیں اور کر سکتا تھا۔

لیکن سرما کی اُس شدید ٹھنڈ والی رات، جب کہ میں نے نیا نیا مطالعہ شروع کیا تھا اور میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا، نیاز محمد میرے کمرے میں آیا تو وہ کوئی پُرلطف حکایت سنانے نہیں آیا تھا، بلکہ میری مدد لینے آیا تھا۔ وہ جہاں سے بھی آیا تھا، بھاگتا ہوا آیا تھا کیونکہ سانس اُس کے سینے میں اچھی طرح نہیں سما رہا تھا۔ میں اُسے اس حال میں دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ بولا۔

’’باؤ جی۔ جلدی کرو۔ میرے ساتھ چلو نہیں تو صاب، میم صاب کو مار دے گا۔‘‘

مجھے علم تھا کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ میں جلدی سے اُٹھا اور میں نے کوٹ پہنتے

ہوئے احمقانہ سوال کیا۔

''کیٹی میم صاب کونا؟''

نیاز محمد کوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں جی اور کونسی میم صاب رہتی ہے وہاں؟''

میں نے جوتے پیروں میں ڈالے اور ہم دونوں نے بھاگتے ہوئے درمیان کا وسیع میدان عبور کیا۔ برامدہ روشن تھا اور داخلے کا دروازہ کھلا ہوا۔ میں اس گھر کے فقط دروازے تک آیا تھا۔ اندر کبھی نہیں گیا تھا تو میں جھجک رہا تھا لیکن نیاز محمد بیرے نے میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹ کے مجھے کمرے میں داخل کر دیا۔ اندر منظر کچھ ایسا تھا کہ میں ٹھٹھک گیا۔ اب تک میں نے نہیں سوچا تھا کہ مجھے اندر جا کر کیا کرنا تھا۔ مجھے فقط اتنا پتہ تھا کہ رابرٹ، کیٹی کو مار دینا چاہتا تھا۔ کیٹی ایک کونے میں دیوار کے ساتھ دبکی کھڑی تھی اور بری طرح کانپ رہی تھی۔ اُس کا شب خوابی کا لباس ادھورا تھا اور وہ شدت کی ٹھنڈ کے باوجود کوئی گرم کپڑا ابھی نہیں پہنے ہوئی تھی۔ رابرٹ نے ایک لامبا گرم کوٹ پہن رکھا تھا اور اُس کا چہرہ معمول سے زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی چھری تھی جسے وہ کیٹی کے چہرے کے قریب لہرا رہا تھا۔ میں اور نیاز محمد فاصلے سے رک گئے۔ (جاری)

◀◀ ● ▶▶

C/o : Dr. Rehana Iqbal
Hazara Road, Hasan Abdal
Dist: Attock 47000 Pakistan

| | |
|---|---|
| نام رسالہ : ہمارا ادب (کرشن چند نمبر)<br>مدیر : محمد اشرف ٹاک<br>قیمت : ۱۰۰/روپے<br>صفحات : ۳۵۸<br>مقام اشاعت: سری نگر (جموکشمیر) | نام رسالہ : ہندوستان زبان<br>مدیر : سید علی عباس<br>قیمت : ۲۰/روپے<br>صفحات : ۸۰<br>مقام اشاعت: ممبئی (انڈیا) |
| نام رسالہ : انتخاب (۳۲)<br>مدیر : علیم اللہ حالی<br>قیمت : ۲۵/روپے<br>صفحات : ۱۰۴ مقام اشاعت: پٹنہ (بہار) | نام رسالہ : ہندی رسالہ شیش<br>مدیر : حسن جمال<br>قیمت : ۲۰/روپے<br>صفحات : ۱۲۸ مقام اشاعت: جودھپور |



# تبصرے

نام کتاب: چمن در چمن (گلدستۂ اشعار)

مولف: ڈاکٹر سید سکندر اعظم

ضخامت: ۴۰۰صفحات

اشاعت: ۲۰۱۵ء

قیمت: ۵۰۰/روپے

ناشر: ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

رابطہ مولف: +13014643579

email:patnacity38@yahoo.com

مبصر: ڈاکٹر منظر اعجاز

جیسا کہ سرنامۂ کتاب سے ظاہر ہے یہ پسندیدہ یا منتخب اشعار کا گلدستہ ہے لیکن اس انتخاب میں مولف کی جدتیں اپنی جھلک دکھلاتی ہیں۔ مولف ڈاکٹر سید سکندر اعظم شاعر نہیں لیکن شاعری، بالخصوص اردو غزل کے عاشق زار ہیں۔ ان کا دل عشق آزار ہے اور وہ کب سے اس آزار عشق میں مبتلا ہیں یہ کہنا فی الحال میرے لیے مشکل ہے لیکن اشعار کی تعداد اور کتاب کے حجم و ضخامت کے اعتبار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کافی عرصے سے اس مرض میں مبتلا ہیں۔ اس کتاب میں ''حرفے چند'' کے عنوان سے اقبال حسن آزاد لکھتے ہیں۔

''اس کتاب کے مولف ڈاکٹر سید سکندر اعظم شاعر نہیں ہیں لیکن شاعری سے انہیں حد درجہ عشق ہے۔ اچھی شاعری پڑھنا اور اپنے پسندیدہ اشعار کو جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ موصوف امریکہ میں مقیم ہیں اور اب سبکدوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔''

مولف کے حال و احوال کے سلسلے میں 'ابتدائیہ' کے عنوان سے ڈاکٹر سید سہیل، کنوینز اردو فورم، مونگیر نے جو مختصر سا تعارف پیش کیا ہے اس سے میں ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

''سکندر اعظم کی پیدائش پٹنہ میں ہوئی۔ یہیں پروان چڑھے، تعلیم حاصل کی۔ مختلف اسکولوں اور کالجوں کا زینہ بہ زینہ کامیابی سے طے کرتے ہوئے تعلیم کی بالائی منزل پر پہنچے۔ جغرافیہ میں اعلیٰ سند حاصل کر

کے درس وتدریس سے منسلک ہوئے۔کئی سالوں تک گیا کالج کے شعبہٗ جغرافیہ میں بحیثیت استاد مصروف رہے۔غیرادبی مضمون کے مدرس ہونے کے باوجود کالج میں ہونے والی ہرادبی تقریب میں ادب کی شمع فروزاں رکھنے والے اردونوازوں کے شانہ بہ شانہ رہے۔پھر وہ ترک وطن کرکے پوری دنیا میں ترقی یافتہ ملکوں کے امام سمجھنے والے ملک امریکہ میں سکونت پذیر ہوگئے اوراب وہیں کے ہوکررہ رہے ہیں۔درس وتدریس سے کنارہ کش ہوکرنوکرشاہ (Bureaucrat) بن گئے اورامریکہ میں جغرافیہ سے متعلق سرکاری محکمہ میں اعلیٰ مناصب پر مامور ہوئے۔ان دنوں ملازمت کی بندشوں سے آزاد ہوکرامریکہ ہی میں آزادزندگی گذاررہے ہیں۔''

محترمہ شاہدہ سہیل نے بھی ایک مختصر مضمون کی صورت میں اپنے چچاجناب سکندراعظم کی مشفقانہ شخصیت پرروشنی ڈالی ہے۔وہ لکھتی ہیں۔

''سکندراعظم صاحب میرے چچاہیں۔والدمرحوم کے اپنے ماموں زاد بھائی۔بچپن سے نام سنتی آئی تھی مگر ملاقات کا موقع کبھی نہ ملا تھا۔اسے حالات کی ستم ظریفی کہوں یا محض اتفاق چچا سے میری پہلی ملاقات مونگیر میں ہوئی جب وہ ۲۰۱۲ء میں خاص کر مجھ سے ملنے مونگیر تشریف لائے۔ان کی شفقت،خلوص اورمحبت نے یہ یقین کرنے پر مجبور کردیا کہ مرحوم باپ کی سرپرستی کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے مگر ایک چچا کا دست شفقت میسر ہے۔امریکہ میں مستقل سکونت اختیار کرلینے، وہاں کی طرز زندگی اپنانے کے باوجودان کے مزاج کی سادگی اورانکساری ہر ملنے والے کوانکا گرویدہ بنادیتی ہے۔اردوادب میں ان کی دلچسپی کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے گلشن سخن سے اپنے پسندیدہ گل بوٹے تلاش کرکے یہ گلدستۂ اشعار تیار کیا ہے۔''

اس لیے سمجھا جا سکتا ہے کہ سبکدوش زندگی کی وقت گذاری کے مشاغل میں اشعار کی ترتیب و طباعت اوراشاعت کوانہوں نے ترجیح دی ہے۔اشعار کی ترتیب میں دوصورتیں اُبھاری گئی ہیں یعنی کتاب کے دوحصے کیے گئے ہیں۔پہلے حصے میں حروف تہجی کے اعتبار سے اشعار شامل کیے گئے ہیں جوصفحہ نمبر ۱۹ سے صفحہ نمبر ۱۱۵ تک پھیلے ہوئے ہیں۔اس میں مختلف عنوانات کے تحت اشعار جمع کیے گئے ہیں۔اس لحاظ سے دوسرا حصہ پہلے حصے کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے۔ہرصفحہ پر پانچ اشعار دیئے گئے ہیں۔البتہ جس صفحہ پر حرف ہجّا یا عنوان دیا گیا ہے اس پر چار ہی اشعار ہیں۔اس اعدادوشمار سے واضح ہے کہ اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار سے کم ہی ہے۔تہجی کے پہلے حرف ''الف'' کے تحت ۵۹ اشعار ہیں۔اشعار کے ساتھ شاعر کا نام نہیں ہے لیکن بعض اشعار اتنے مشہور ہیں کہ ان کے حوالے سے شاعر کا نام خودبخود ذہن میں اُبھرنے لگتا ہے مثلاً یہ اشعار:

ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں　　　اتنی جگہ کہاں ہے دل داغدار میں
(بہادرشاہ ظفر)



اگر کجرو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا　　　مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
(اقبال)

اب کے بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں　　　جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
(احمد فراز)

اس مجموعے میں کلاسیکی اسلوب اور جدید لب و لہجے کے اشعار بھی ہیں اوران میں صوری اورمعنوی اعتبار سے بھی کافی تنوع ہے۔مختلف رنگ وآہنگ نے مشام جاں کومعطر کردینے والی خوشبوبکھیری ہے۔اس لحاظ سے کتاب کاعنوان ''چمن درچمن'' بھی خوب ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں جن عنوانات کے تحت اشعار جمع کیے گئے ہیں وہ ہیں:
آنکھیں،آواز،آئینہ،اداسی،التجا، انتظار،اعتبار،امید بادل، بارش، برسات، بھول، بندگی، بے رضی، پشیمانی،، پھول، پرواز، پیار، پیغام، تمنا،تقدیر،تنہا،تصویر، چھاؤں،خوشبو، درد، دل، دھوپ، دیوار، رخسار، راز، زخم، زلفیں، زندگی،ساغر، ساقی، سانس، سکون، شبنم،شام ،شمع، شہر،صورت،صدا، عادت،عرض،عشق، عمر،عید،غم،غریب، فراق، فریب، قربان/ قربانی،قیامت، کمال، گریبان،گلشن ،گمان، گناہ،لاش،لب،لفظ،ماں،موسم،محبت،منزل،نیند،نگاہ،نصیب،نظر،وفا،وقت،ہجر،یاد،یقین۔

کتاب کے اس حصے میں تقریباً تمام اشعار بڑے ہی عمدہ اور معیاری ہیں۔جن کے حوالے سے مولف کے شعری ذوق اورحسن انتخاب کی بے تحاشہ داددی جاسکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ارباب ذوق کھل کرداددیں گے۔میں یہاں چنداشعار پیش کرتا ہوں...... باب ''یقین'' سے جواس کتاب کا آخری باب ہے:

دعا بھی مانگ رہے ہیں طویل بارش کی　　　یقین بھی نہیں کاغذ کے سائبانوں پر
یقیں نہ آئے تو اک بار پوچھ کر دیکھو　　　جو ہنس رہا ہے وہ زخموں سے چور نکلے گا
وہ مجھ کو چھوڑ گیا تو مجھے یقیں آیا　　　کوئی بھی شخص ضروری نہیں کسی کے لیے

یہاں میں بطور خاص اس پہلو کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں کہ بیت بازی کی مٹتی ہوئی تہذیب کو اس گلدستۂ اشعار سے بڑا سہارا مل سکتا ہے۔جولوگ اردوتہذیب کے زائیدہ و پروردہ ہیں اوراس دورنا پرسانی میں اس تہذیب کو گلے لگائے ہوئے ہیں،ان کے گھروں میں خاص طور سے بچوں میں شعری ذوق کی تربیت کے لیے اس کتاب کا موجود ہونا نہایت ہی سودمند ہوگا۔اور وہ نوعمر بچے جو بیت بازی کا شوق رکھتے ہیں وہ براہ راست چمن درچمن کی گلکاریوں سے استفادہ کریں گے اورمحظوظ بھی ہوں گے۔

☆☆☆

نام کتاب: آواز

مولف: حسین مجروح

مبصر: نعیم بیگ

سقراط نے کہیں کہا تھا کہ ''اگر اس دنیا کے بعد کوئی اور دنیا ہے تو میری روح اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہے کیونکہ دریافت اور جستجو سے بڑھ کر کوئی اور مسرت نہیں، اور اگر موت ابدی نیند کا نام ہے تو اس سے زیادہ سکون بخش نعمت اور کیا ہو سکتی ہے۔''

لیکن یہاں حسین مجروح ابدی نیند سے کہیں زیادہ اس ابدی آواز کو اپنے شعری شعور میں بلند کرتے ہیں جو حیاتِ جاوداں کے روپ میں تہذیبی رشتوں کی دریافت اور انسانی شعور کے لیے آفاقی جستجو سے پیوست ہے۔

حسین مجروح کی یہی ''آواز'' ان کے شعری اسلوب و معنویت کی آگہی کی تازہ دمی مزیں ایک خوشگوار تجربہ ہے۔

مجموعہ کے ابتدا میں کوکتی ہوئی مدھر آواز قاری کو کس طرح اپنے سماجی و تہذیبی شعری شعور کی آگہی سے روشناس کراتی ہے اس کا اظہار ذرا ان کے اپنے الفاظ میں ہی سن لیجئے۔

''پہچانا! یہ میں ہوں حسین مجروح، ہنر کی حرمت کا طلب گار، آپ کے لطف کا امیدوار۔ یادش بخیر ''کشید'' کو روشنائی کا پیرہن کرتے سمے آپ سے کچھ گفتگو رہی تھی، یہی کوئی چودہ برس پہلے، آپ سے کیا پردہ مشرقی شعریات کو چودہ کا سن بہت لبھاتا ہے، اور اس اتفاق کو اشتیاق کی کس پوٹلی میں باندھیے گا کہ ''کشید'' کو آواز ہونے میں بھی یہی عرصہ لگا۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں کہ سخن کی بے توفیقی سے چہرہ دھواں ہوتا ہے، کبھی آنکھ بے آب، خود کو ملامت کرتا ہوں کہ اس بے اعتباری کے آئینہ خانہ میں حاضری کی کیا ضرورت تھی، پلکوں میں سوئیاں کچھ دیر اور چبھی رہتیں، کلیجے میں لہو مزید جمنے دیا ہوتا، ایسا بھی نہیں کہ یہ دلاری دودھ کے دانت جھڑتے ہی مایوں بیٹھا دی گئی ہو لیکن طبیعت کی تمازت کا کیا کروں جو پتھر کے برادے میں بھی کنول تلاشنے کی مدعی ہے۔''

اب آپ دیکھ لیجئے کہ حسین مجروح کا ادبی و علمی و فکری شعور کس قدر الہامی طور پر انسانی اعمال کا پوری طرح جائزہ لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آج کی جگمگاتی زندگی کی حقیقت کے پیچھے سچائی کا مخفی پہلو کون سا ہے؟

یہیں سے انکے مجموعے کی پہلی آواز مدھر موسیقی کی طرح انسانی کانوں میں رس گھولتی ہے اور الفاظ حرمت کے ان جاودِاں لحات میں ساکت ہو جاتے ہیں۔



نیند کی ٹہنی پر

سارے خواب کہاں پھلتے ہیں / اکثر خواب تو
کچی نیند کی ٹہنی پر ہی مرجاتے ہیں / باقی ماندہ
تعبیروں کے پھانسی گھاٹ / اتر جاتے ہیں۔
تھوڑے سے جو بچ رہتے ہیں / دنیا کی ناشکری آنکھ میں
تازہ جگنو بھر جاتے ہیں / لیکن دنیا،
پیتل پر سونے کا رنگ چڑھاتی دنیا!!
خوابوں سے گھبرا جاتی ہے / جگنو بیچ کے کھا جاتی ہے۔

انکے اسی مجموعے کی ایک اور نظم دیکھئے۔

خواب میں دیکھا ہوا دن

(گوہر کے نام)

کاش ایسا ہو / کبھی رات کو جلدی سوئیں
صبح اٹھیں / تو زمین پر
کسی موہوم بشارت کی طرح / اک نیا دن ہو
جسے خوف نہ ہو مرنے کا
جس کی چاہت بھری کرنوں کی سُپرداری میں
فاختاؤں کو کوئی ڈر نہ رہے، ڈرنے کا
جس کی خوشبوئی ہوئی آنکھوں کے نذرانے میں
گھر کھلے چھوڑ کے جائیں میرے جانے والے
جز محبت نہ خریداری ہو بازاروں میں / دھوپ مامور ہو خود اپنی نگرانی پر
جبکہ تنہائی حفاظت پر ہو سناٹے کی / خواب، امید کی توفیق سے بڑھ سکتا ہے
اور نیا دن تو کسی وقت بھی چڑھ سکتا ہے

میرزا غالب نے اپنی ایک غزل میں کہا۔

دل کو نیازِ حسرت دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار ہی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اب دیکھئے حسین مجروح خود کیا کہتے ہیں

''جبر وقدر کے کھٹ راگ سے قطع نظر، شاعری کھنڈر کی دیوار نہیں ہوتی
کہ فقط گر پڑنے کے خوف سے منظر ہوکر رہ جائے، اسے تو پوری زندگی سے معاملہ
ہوتا ہے یعنی وہ جسے ہم بسر کرتے ہیں اور وہ جو ہمیں گذارتی ہے۔ وقت اور کائنات
کی تقویم تو شاعری کا اسمِ اعظم ہے۔''

یوں تو حسین مجروح کی ''آواز'' کی گونج پورے مجموعہ میں بازگشت کے طرح بار بار آ کر قاری کے کانوں سیمانوس سی سرگوشیاں کرتی ہے اور اصرار کرتی ہے کہ جن نئے احساسات وتحیرات کے بیان کو شعری کاوش کے روپ میں ڈھالا گیا ہے اس کی جستجو اور دریافت ہی انسانی شعور کا پہلا قدم ہے۔

حسین مجروح ایک بڑا شاعر ہے جو فرسودہ، استعمال شدہ ''کلیشے'' سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اور اپنے فکرو خیال، لفظوں کے حسنِ جمال، بچھڑنے کے ملال اور کہکشاؤں کے جلال میں بھی سچ کی کسوٹی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔

میں بھلا کس طرح حسین مجروح کی آواز کی اس گُنگناہٹ وغنائیت جو پوری طرح آس وزندگی سے لبریز ہے، رد کردوں کہ وہ صدیوں سے گونجتی ہوئی کھنکتی آوازوں کے سحر سے آشنا ہے اور کائنات میں پھیلی ہوئی مسحور کن جمالیاتی لطافت کا بھی جائزہ لیتا ہے۔

''جز محبت نہ خریداری ہو بازاروں میں / دھوپ مامور ہو خود اپنی نگرانی پر
جبکہ تنہائی حفاظت پر ہو سنّاٹے کی / خواب، امید کی توفیق سے بڑھ سکتا ہے
اور نیا دن تو کسی وقت بھی چڑھ سکتا ہے''

انسانی خمیر میں گندھا ہوا رومانوی اور جمالیاتی رنگ حسین مجروح کے مصرعوں کی شان بن جاتا ہے اور امید وآس کا ایسا منظر نامہ کھولتا ہے جہاں روشنی جگمگاتی ہوئی ا?پ کو نئے احساس سے روشناس کرتی ہے۔ 'خواب میں دیکھا ہوا دن' اسی احساس کا نام ہے۔

علامتوں سے سجی اس آواز میں کئی ایک دیگر آوازیں بھی اس جلترنگ میں شامل ہیں۔ انکی ایک نظم حُسن انتظام کا تیر میں حسین مجروح ایک نئے زاویے سے علامت کا استعمال کرتے ہیں۔

حسنِ انتظام کا تیر

پھر ایک بار صفِ دلبراں سے چُھوٹا ہے / بنام چارہ گری، خُوئے انتقام کا تیر
پھر ایک بار ہوئی ہے قبائے خواب، کفن / پھر ایک چلا حسنِ انتظام کا تیر
کہا گیا ہے کہ بیمار کی شفا کے لئے / بدن کی شاخ سے، سر کاٹنا ضروری ہے



تنِ سوال طلب، بے کسوں کی آہوں سے / برہنہ غم کی طرح ڈھانپنا ضروری ہے
بیاں ہوا ہے یہ نسخہ؟ شفا جس کو / صلائے بے خبری، بے مراد کہتی ہے
ہمارے واسطے وجہ نجات ہے گرچہ / نشہ ہے نیند سا اور موت اس میں رہتی ہے
یہ تیر چارہ گری، اعتبار کا قاتل / ہوس میں ڈوبا ہوا، زہر میں بجھایا ہوا
دلوں کے بیچ لہو کر خلیجنے والا / یہ تیر لگتا ہے پہلے بھی دل پہ کھایا ہوا

علامہ نیاز فتح پوری کہیں لکھتے ہیں۔ ''دنیا اب اخلاق کے مواعظ سے تنگ آ چکی ہے اور اب اسے حقائق کی ضرورت ہے وہ پریوں اور فرشتوں کے تذکرہ سے گھبرا چکی ہے، اب وہ گوشت پوست کے انسانوں کی بات کرنا چاہتی ہے اور زندگی کے حسن کو بھی دیکھنا چاہتی ہے۔''

میں اس نظم کو پڑھتے ہوئے ایک ایسے سحر میں گرفتار ہوا جہاں سے مجھے اسکی بالائی سطح پر نظمیہ لطافت کا گہرا احساس اور زیریں سطح پر دکھوں کی انگنت کہانیاں منکشف ہوئیں۔

فکری افق پر نئے، پیچیدہ سوالات کا انبوہ اور ملکی سطح پر عطا کردہ محرومیاں اس نظم کا باطنی پیغام ہیں۔

حسین مجروح کا ادبی قد کسی بھی بلند پایہ شاعر کے ہم پلہ ہونے کے ناتے اپنے قارئین کو ادبی و فکری سطح پر گہری نظر کے ساتھ ملکی سماجی ومعروضی حالات کو دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں

اس نظم کو پڑھتے ہوئے قاری کو یہ دیکھنا ہوگا کہ حسین مجروح کا مخاطب کون ہے؟

بظاہر ''صفِ دلبراں'' کی ترکیب اس سماجی المیہ کو منکشف کرتی ہے جہاں انسان اپنے سماج میں پوری ثقافت کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہائی محسوس کرتا ہے۔ وہی بات جون۔م۔راشد کہتے تھے کہ ہماری تہذیب کا لبادہ اتنا بوسیدہ ہو چکا ہے کہ اسے کسی میوریم کے سپرد کردینا چاہیئے۔

خود حسین مجروح ''آواز'' کے دیپاچہ میں لکھتے ہیں کہ ''اُدھر موسموں کی عداوت اور خیال کی گھلاوٹ نے بھی وضع دار سوکنوں کی طرح ایک ہی چھت تلے بسرام کی کوڈالی۔'' یہی خیال اس نظم کی روح ہے۔

حسین مجروح کی شاعری، نظمیں، غزلیات سیاسی وسماجی شعور کے کسی فارمولے میں مقید نہیں، جہاں وہ ماضی کی تہذیبی، لسانی اور ادبی ورثہ سے آگاہ ہیں وہیں مستقبل کا انسان ان کی شعری جستجو کے امکانات کو جذب کرتا ہے اور اپنے لسانی لب ولہجہ اور سماجی تشکیل پر غور کرتا ہے۔ مجھے ان کے ہاں لفظوں کی تراکیب، مصروں کی ساخت، اظہار کا نیا پن اور علامتوں کی نئی تشریحات کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ ملتا ہے۔ ان کی تازہ کاوش ''آواز'' کے لئے بہت سی نیک تمنائیں۔

☆☆☆

تصنیف: مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار

مصنف: ارشاد آفاقی

صفحات: ۲۱۲

سنِ اشاعت: ۲۰۱۵ء

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی۔فون 11-23216162

مبصر: ڈاکٹر ریاض توحیدی

اردو کے بلند پایہ اور عظیم مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں کیونکہ ان کی نگارشات میں طنز و مزاح کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔مجتبیٰ حسین صاحب کی مزاحیہ نگاری کے مختلف جہات پر اگرچہ قابلِ قدر تحقیقی کام ہوا ہے تاہم ان کی مزاحیہ خاکہ نگاری پر غالباً یہ پہلی تصنیف ہے جس میں موصوف کی تحریرات کو تحقیقی بنیاد پر موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔یہ تصنیف درجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہے:

مجتبیٰ شناسی (شاہد حنائی)'پیش لفظ (ایاز رسول نازکی)'مزاح'مجتبیٰ اور مرید مجتبیٰ (ڈاکٹر الطاف انجم)'پیش گفتار (ارشاد آفاقی)'ہنسی کی تعریف اور اہمیت'مزاح کیا ہے'طنز کیا ہے'طنز و مزاح کے مابین رشتہ'اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت'مجتبیٰ حسین کی سوانح حیات اور کارنامے'مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار۔

نفسِ موضوع کے تناظر میں پہلے طنز و مزاح کی تعریف و اہمیت اور اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت وغیرہ پر معلومات افزاء روشنی ڈالی گئی ہے۔انسانی زندگی میں طنز و مزاح کی حیثیت نمک اور چینی جیسی ہے۔دونوں کا مناسب استعمال صحت مند زندگی کے لئے مفید ہے۔زندگی کی ناہمواریوں میں مفاہمت کے پیش نظر طنز و مزاح کی توضیح'اہمیت' حدود اور افادیت کا اظہار کرتے ہوئے مقالہ نگار رقمطراز ہے:

''مزاح زندگی' ماحول' سماج اور فرد کی ناہمواریوں اور کمزوریوں کے ہمدردانہ شعور کا نام ہے لیکن طنز حیات، حالات، معاشرے کی بدنظمی اور کجرویوں کا بے رحمانہ اظہار ہے۔مزاح سماج اور زندگی سے ہمدردی'لگاؤ'انس اور مفاہمت کی پیداوار ہے اس کے برعکس طنز زندگی اور ماحول سے برہمی اور بیزاری کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے۔مزاح نگار کے یہاں تفریحی اور دل لگی کا جذبہ ہوتا ہے اور طنز نگار کے یہاں اصلاحی جذبہ۔مزاح میں ہمدردی اور مفاہمت اور طنز میں نشتریت اور نفرت کا عنصر غالب رہتا ہے۔'' (مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار۔ص ۴۳)

طنز و مزاح کا دائرہ کافی وسیع ہے۔اس فن کی آمیزش اردو شعر و ادب میں جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔تصنیف ھذا میں اردو طنز و مزاح کی روایت کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے مضمون نگار لکھتا ہے:

''تاریخِ ادب اردو کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تقریباً ہر اچھے



شاعر اور ادیب نے اپنی تخلیقات کو نہایت دلچسپ' موثر اور شگفتہ بنانے کے لئے طنز و مزاح کا سہارا لیا ہے۔اس لئے ایسے شاعر اور ادیب معدودے ہی ہیں جن کا طرۂ امتیاز خالص طنز یا مزاح ہیں۔انہوں نے اس فن کی وجہ سے نہ صرف اپنا پیغام سماج کے ہر فرد تک پہنچادیا بلکہ انہیں سماج کی ہر کمزوری' ناہمواری اور برائی سے باخبر کر کے بیدار بھی کیا اور ان کا قلع قمع کرنے کی ترغیب بھی دی۔'' (مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ نگار۔ص ۴۸)

مجتبیٰ حسین کی علمی و ادبی خدمات کے کئی پہلو ہیں۔طنز و مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انشائیہ نگار' خاکہ نگار' کالم نویس اور صاحب طرز ادیب وغیرہ بھی ہیں۔عصر حال تک ان کی تقریباً دو درجن تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔زیر نظر کتاب کا ایک باب مجتبیٰ حسین کی حیات اور ادبی کارموں پر مختص ہے۔اس باب میں ان کی سوانح' خاندان' تعلیم' ازدواجی زندگی' دوستانہ مراسم' ملازمت کے علاوہ ادبی سفر' تصانیف' اعزازات' اسفار وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔جس سے ان کی زندگی کا ایک مکمل خاکہ مرتب ہوا۔

مجتبیٰ حسین اپنی تحریرات کے معیار و مقدار کی بنیاد پر مزاحیہ ادب کا حوالہ (Reference) بن چکے ہیں۔ان کے مزاحیہ مضامین میں ظرافت کی جو شوخی نظر آرہی ہے وہ ان کی خاکہ نگاری میں بھی نمایاں ہے۔مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری میں کس نوعیت کا مزاحیہ رنگ و آہنگ موجود ہے'اس پر زیر نظر تصنیف کے مرکزی باب یعنی ''مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار'' میں تحقیقی نقطہ نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ابتداء میں اردو خاکہ نگاری کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور مقالہ نگار صنفِ خاکہ کے فنی لوازمات' ضوابط' اور تکنیکی عناصر پر بات کرتے ہوئے ادبی خاکہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''خاکہ بنیادی طور پر کسی شخصیت کے چیدہ چیدہ واقعات و حالات' نمایاں عادات واطوار اور امتیازی خصوصیات خواہ سیاہ ہوں یا سفید کا عکاس ہوتا ہے اور اس میں اجمال' ابہام' اختصار اور جامعیت کی جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ دیگر سوانحی مضمون میں مفقود ہوتی ہے۔گویا خاکہ نگاری کا آرٹ بصیرت اور بصارت دونوں کا متقاضی ہے۔'' (مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار۔ص ۱۴۷)

اردو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اگرچہ تذکروں' خطوط اور شاعری میں نظر آتے ہیں لیکن تحقیقی طور پر اس صنف کا باضابطہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاتھوں ہوا۔ان کا ایک خاکہ بعنوان ''نذیر احمد کی کہانی' کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی'' (۱۹۲۷ء) شہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔اس صنف کو فروغ دینے میں کئی لوگوں کی ادبی خدمات شامل ہیں جن کا ذکر اس باب بھی ہوا ہے۔اس کے بعد مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کا مفصل جائزے کے علاوہ حسب ضرورت موصوف کی خاکہ نگاری کا موازنہ دوسرے اہم خاکہ

نگاروں کی تحریرات سے بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً:

’’مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ خاکے نہ صرف مرزا فرحت اللہ بیگ کی طرح طویل ہیں اور نہ مولوی عبدالحق یا شوکت تھانوی کی طرح مختصر ہیں، بلکہ ان کے یہاں میانہ روی اور اعتدال پسندی ہے۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں نہ ضرورت سے زیادہ لچکدار رویہ اپنایا ہے اور نہ ہی غیر متوازن حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ ان کے خاکے قصیدے اور ہجا، تعریف اور تنقیص کے درمیان کشید کئے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی کھینچی گئی تصویریں نہ کبھی پیروڈی یا کاٹون بن گئی اور نہ کبھی سپاٹ یا پھیکا پڑ گئی۔ بلکہ جس طرح انہوں نے متعلقہ شخصیات کو دیکھا بھالا اور سمجھا بوجھا ہو بہو اسی طرح صفحہ قرطاس پر اتاری ہیں۔‘‘ (مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار۔ ص ۱۶۱)

کسی بھی ادیب کی منفرد پہچان کے لیے اسلوب نگارش بنیادی وسیلہ ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کے بارے میں مقالہ نگار لکھتا ہے:

’’مجتبیٰ حسین کے انداز بیان میں سادگی، شگفتگی، تازگی اور شوخی ہے، یعنی وہ صاحب طرز خاکہ نگار ہیں۔ ان کا اپنا ایک علاحدہ اور منفرد اسلوب نگارش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غیر معمولی بات کو معمولی اور معمولی بات کو غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں غیر سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لیکن نہ تو انہوں نے اپنے قاری و سامع کو بوجھل پن کا احساس ہونے دیا ہے اور نہ ہی کسی نقاد نے ان کی تحریر کو پھکڑ پن کے زمرے میں شامل کر دیا۔ کیونکہ مجتبیٰ حسین ان تمام حربوں سے واقف ہیں جن کی وجہ سے تحریر میں سنجیدگی اور شوخی برقرار رہتی ہے۔‘‘ (مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار۔ ص ۱۷۱)

مجموعی طور پر زیر نظر تصنیف ’’مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاحیہ خاکہ نگار‘‘ تحقیقی نوعیت کی ایک معیاری کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں نہ صرف تحقیق کے بنیادی لوازمات 'مواد' حوالا جات' کتابیات وغیرہ کی اچھی عکاسی نظر آتی ہے بلکہ مقالہ نگار نے نفس موضوع کی گیرائی اور گہرائی کا تحقیقی بصیرت سے احاطہ کرنے کی احسن کوشش کی ہے۔ جس کے لیے مقالہ نگار مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتاب کا گٹ اپ خوبصورت ہے، کاغذ بھی معیاری ہے اور قیمت بھی مناسب۔ البتہ متن میں کہیں کہیں پر جملوں کی ساخت اور املا کو دوبارہ دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب مجتبیٰ حسین کے مداحوں کے لیے ایک تحفہ ہے اور مجتبیٰ شناسی میں ایک اہم پیش رفت ہے۔



# ’’ثالث‘‘ پر تبصرے

## ● نعیم بیگ

(لاہور)

### زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

تقریباً دو سال پہلے جب اقبال حسن آزاد مدیر اعزازی کی زیر ادارت 'ثالث' جاری ہوا تو مجھے پہلی نظر میں ہی بھا گیا۔ اس دلچسپی کی وجہ اس کا خوبصورت نام تھا۔ اقبال صاحب اکثر انٹرنیٹ کے ایک ادبی فورم پر اس کا تذکرہ کر دیا کرتے تھے تو مجھے اشتیاق پیدا ہوا کہ اس جریدے کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ میں ان کے افسانے و دیگر تحاریر اس ادبی فورم پر پڑھتا رہتا تھا جن میں مجھے نہ صرف زبان کی چاشنی نظر آتی تھی بلکہ اردو ادب سے ان کی گہری محبت، اس کی ترقی و ترویج اور نوجوان نسل کے لیے ان کے ملفوظات اپنی اثر پذیری میں نمایاں دکھائی دیئے۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ’’ثالث‘‘ کا پہلا شمارہ میرے ہاتھ میں تھا۔ کئی ایک دہائیوں کے بعد ایک ہندوستانی ادبی جریدے کو ہاتھوں میں لیے میں پہلے اسے باہر سے دیکھتا رہا، پھر جب اس کے مشمولات دیکھے تو دل خوش ہو گیا۔ یہ جریدہ اقبال حسن آزاد جیسی ادبی شخصیت کی نظری و فکری، جمالیاتی حسن کا نمونہ تھا۔ اس کے بعد تو چل سو چل رہا۔ ثالث روز بروز اپنی ہیئت اور مشمولات کو بہتر کرتا رہا اور آج اس جریدے کو ہم ہندوستان کے اہم ادبی جریدوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں جب بھی ثالث کو ہاتھ میں تھامے دیکھتا ہوں تو مجھے مضامین پڑھنے کے لیے ترجیحاً یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کس مضمون یا تحریر یا افسانے کو پہلے پڑھوں کیونکہ مشمولات کی اہمیت و قدر و منزلت کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر ایک ناممکن سی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ سبھی فوراً ایک ساتھ پڑھ لیے جائیں۔

آج ’’ثالث‘‘ کا شمارہ نمبر سات میرے سامنے ہے۔ سب سے پہلے تو اس کا پرمغز اداریہ پڑھنے کا لطف آ گیا۔ اردو کی تاریخ، دورِ انگلشیہ سے لیکر جدید عصری عہد تک کے تخلیقی و تنقیدی محاضرات، ممکنات و مضمرات کا جس ادبی بصیرت سے محاکمہ کیا گیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔

مضامین میں یوں تو سبھی مضامین اچھے لکھے گئے ہیں لیکن 'زبان کی تخلیقی و تشکیلی جمالیات' از شاہد الرحمٰن اور عظمیٰ سیٹھ کا مضمون 'اردو زبان کے معروف نظریات، اجمالی جائزہ' سرِ فہرست ہیں۔

اس طرح غزلیں سبھی اچھی ہے اور اپنی شعری لطافت میں قاری کو جکڑ لیتی ہیں۔

ادھر جب ہم افسانوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو فرحین جمال، مصاعد قدوائی، شاہین کاظمی کے ساتھ دیگر جید لکھاریوں کے نام نظر آتے ہیں جن کا میں مداح ہوں۔ خاکسار کا افسانہ 'بلیکی' بھی شامل ہے جس کی اشاعت پر میں مدیران کا شکر گزار ہوں۔

اقبال حسن خان کا ''راج سنگھ لاہوریا'' ناول اشاعت سے پہلے میں پڑھ چکا ہوں اور اس پر اپنی رائے بھی دے چکا ہوں۔ اقبال حسن خان کا یہ افسانہ ان کے ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں خیالات کو آشکار کرتا ہے جس میں مکمل طور پر حقیقی حالات کو فکشنلائز کرتے ہوئے انہوں نے معرکۃ الآرا ناول لکھا ہے۔

سلمان باسط کے تاثرات پر مبنی تحریر 'نوسٹیلجیا' کے عنوان سے پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کیا خوبصورت انداز میں انہوں نے واقعاتی رنگوں کو بکھیرا ہے۔

ثالث اور اس کی انتظامیہ کو ایک کریڈٹ مزید دینا پڑتا ہے کہ انکی عقابی اور گہری ادبی نگاہیں پاک و ہند میں عہدِ حاضر میں شائع ہونے والے ادب پر بھی مرکوز ہیں۔ جس کا واضع ثبوت تین کتب کا تفصیلاً تبصرہ اس شمارے میں شامل ہے جس میں سرفراز جہاں کے افسانوی مجموعے از ثالث پبلیکیشنز بہار، باصر سلطان کاظمی کے کلیات از سنگ میل پبلیکیشنز لاہور اور پروگریسو اردو رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام ایک افسانوی انتخاب 'نئی صدی کے افسانے' شامل ہیں۔

اقبال حسن آزاد صاحب، ثالث کی انتظامیہ اور اہلکاران اس کامیاب اجراء پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہاں پاکستان سے ان کے لیے نیک تمنائیں۔

◂◂ ● ▸▸

## ● سلمیٰ جیلانی
(نیوزی لینڈ)

### سہ ماہی ثالث شمارہ ۔۷ ایک مختصر جائزہ

جناب اقبال حسن آزاد کی زیر نگرانی شائع ہونے والا ادبی جریدہ ثالث اپنی ابتدا ہی سے ایک واضح فکری سمت متعین کرتے ہوئے ارتقائی مراحل بخوبی طے کر رہا ہے- آج اس کا ساتواں شمارہ ایک بار پھر ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد مجھ تک پہنچا گویا اقبال صاحب بڑی مستقل مزاجی اور پوری



دیانت داری کے ساتھ مجھ جیسے دور دراز جزیرے کے باسی کو بھی اس علمی اور فکری سفر میں ساتھ لے کر چلنے میں کامیاب ہیں۔

اس شمارے کے معیاری مضامین، افسانے غزلیں اور نظمیں حتیٰ کہ اداریہ تک سنجیدہ لیکن دلچسپ موضوعات سے پر ہیں- اس مرتبہ کا اداریہ ادب میں تنقید کے عمل کی اہمیت سے متعلق ہے۔ کسی بھی تخلیق کی خوبیوں اور خامیوں کو جانچنے کے ضمن میں تنقید جتنی بے لاگ اور غیر جانب دار ہوگی یہ عمل اتنا ہی شفاف ہو گا۔ افلاطون جیسے تعقل پسند فلسفی کے الفاظ میں فن عطیہ خداوندی ہے جس کی کئی جہات ہیں اور کسی بھی مخصوص نظریے کی روشنی میں فن کے کسی پہلو کا مطالعہ جزوی ہی کہلائے گا جو کہ کل پر منطبق نہیں کیا جا سکتا-

اداریئے کے بعد سید انور جاوید ہاشمی صاحب کی خوب صورت اور دل گداز حمد و نعت ہیں۔ خاص بات ان کا ایک ہی قافیہ اور بحر ہونا ہے۔ اس سال کے میلاد میں پڑھنے کے لیے مواد بھی مل گیا......اس بات کی بھی خوشی ہے۔

اب آتی ہوں مضامین کی طرف جو تمام ہی ادب کے طالب علموں کو سنجیدہ مطالعہ کی دعوت دے رہے ہیں، جیسے عارف اشتیاق کا مضمون شاعر انقلاب حبیب جالب نہ صرف ان کی آمریت کے خلاف جدو جہد اور معاشرے میں موجود ناانصافیوں پر بے باک تنقید جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے بلکہ ان کے نمائندہ اشعار کی روشنی میں اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی جبر، اور ادیبوں اور قلم کاروں کی رویوں پر بھی سیر حاصل تجزیہ فراہم کرتا ہے، خواتین کے متعلق رجعت پسند رویہ کی مذمت کو ان کی نظم عورت کا حوالہ ہی کافی ہے جس کے مطابق ہر جگہ اور ہر مقام پر عورت کو چپ رہنے کی تلقین ہی وہ رجعت پسندانہ رویہ ہے جس کی مذمت انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہمیشہ کی یہ شعر ملاحظہ کیجیے ؎

تائید ستم گر ہے چپ رہ کے ستم سہنا　　　تقدیر کے قدموں پر سر رکھ کے پڑے رہنا

عظمیٰ سیٹھی کا تفصیلی مضمون اردو زبان کے معروف نظریات کا اجمالی جائزہ بھی اردو ادب کے طالب علموں کے لئے خاصا مفید مواد فراہم کرتا ہے، ایک اور مضمون جس کے عنوان ہی نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اشرف لون کا تحریر کردہ ہے 'ادب لطیف کے افسانوں میں عورت' کے نام سے لکھا گیا ہے۔ انگریزی میں مستعمل لائٹ لٹریچر کی اردو اصطلاح ہے جس کے مطابق یہ ادیب ایسے موضوعات کو قلم بند کرتے ہیں جن میں تلاش حسن مقصد ہو جسے وہ نہایت نفیس و لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت حسن کا بڑا مظہر ہے جسے وہ آدرش وادی نقطہ نظر اپناتے ہوئے تخیلاتی روپ میں پیش کرتے ہیں، پورا مضمون تو ثالث میں ہی پڑھا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ صابر حسن رئیس اور شاذیہ مجید ملک کے تحقیقی مضامین بھی قابل توجہ ہیں۔ مختصر طور پر

اس شمارے میں مضامین کی تعداد افسانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے جو ادب کے سنجیدہ قاری کی سنجیدگی میں خوب اضافہ کرنے میں کامیاب ہے۔

یادِ رفتگاں کے بینر تلے منیر احمد فردوس کے مضمون جو انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان کے تازہ فکر شاعر نور احمد ناز کی ناگہاں موت سے متاثر ہو کر لکھا ہے، دل کو جکڑ لیتا ہے۔غربت کی دلدل میں پھنسے ہونے کے باوجود اس حوصلہ مند شاعر نے ہمت نہیں ہاری اور حالات سے لڑتے ہوئی اپنی الگ ادبی شناخت بنالی۔ مجھے بھی فیس بک کے حوالے سے نور احمد ناز کو تھوڑا بہت پڑھنے کا موقع ملا تھا مگر ان کے نامساعد حالات اور بیماری کی تگ ودو کے بارے میں جان کر دلی صدمہ ہوا۔زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں جانے کتنے ہی نور ناز قبل از وقت خاک کے پیوند ہوئے جاتے ہیں۔عرفان ستار صاحب کی معیاری غزلیں، اور کئی دوسری نظمیں خاص کر صدیق عالم کی طویل نظم ''جس دن شاعر کا مزار بنا'' نے کافی متاثر کیا۔

افسانہ سیکشن میں نعیم بیگ صاحب کے نیم علامتی افسانے ''بلیکی'' نے بے ساختہ سوچ کے در کھولے۔امین بھایانی کے افسانے ہمیشہ زندگی کی سچائیوں کو موضوعِ قلم بناتے ہیں، سو یہ بھی ایسا ہی ہے۔سلیم سرفراز کے افسانے ''بددعا کرنے والے'' نے دل کو چھولیا۔معظم شاہ کا افسانہ ''گشتی'' بھی خوب رہا۔سیمیں درانی نے اپنے افسانے ''چھام چھاپ'' میں بچوں پر ہونے والے جنسی تشدد کو موثر انداز میں موضوع بنایا ہے۔انہوں نے غربت کی نچلی سطح پر رہنے والے گھرانے کی ایسی تصویر کشی کی ہے اور اتنی سفاکی سے سماج کے کھوکھلے پن پر نشتر چلایا کہ یقین نہیں آتا یہ نرم و نازک سیمیں کے ہاتھوں سے بنا گیا افسانہ ہے۔فرحین جمال کا افسانہ ''آنگن''، شاہین کاظمی کا افسانہ ''گڈی'' اور ثمینہ سید کا افسانہ ''ہے تو یہیں کہیں'' بھی بہت ہی خوب ہیں۔

کلاسیکی ادب سے انتخاب قاضی عبدالستار کا ''پیتل کا گھنٹہ'' نہایت ہی شاندار ہے۔ بار بار پڑھے جانے کے قابل۔اقبال حسن خان صاحب کا ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا دوسرا باب پڑھ لیا۔اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔سلمان باسط صاحب کے ناسٹلجیائی مضامین کا جواب نہیں۔اسے پڑھتے ہوئی بار بار خود بھی ناسٹلجیائی کیفیت میں ڈوب جاتی ہوں۔ثالث کا اختتام تبصروں اور مکتوبات پر ہوتا ہے جو تمام ہی نہایت خلوص اور ادبی دیانت کی روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ ثالث ٹیم نے اس مجلّہ کو نہایت انہماک اور جانفشانی سے ادب کے قاری تک پہنچایا اور سرورق پر لکھی ہوئی عبارت یعنی زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان ثابت کیا۔تمام شرکاء اور تخلیق کاروں کو بے حد داد اور دعائیں۔

◀◀ ● ▶▶



## ● عین تابش

(گیا)

فی الوقت ''ثالث'' شمارہ نمبر۔۷ مطالعے کی گرفت میں ہے یا میرا شوق مطالعہ ثالث کی گرفت میں ہے۔اور ظاہر ہے کہ ثالث کی ضرورت کس کو نہیں اور اب ثالثی کے بغیر کام کہاں چلتا ہے۔گویا آپ کا اور ہمارا ثالث، بیک وقت ادب العالیہ اور ادب جدید کے درمیان ,بیشۂ تنقید اور نخلستانِ تخلیق کے درمیان رجدلیات اور جمالیات کے درمیان اور ماحصل یہ کہ متن اور قاری کے درمیان ثالثی کو آمادۂ کار کھڑا ہے اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے۔آپ کی محنت اور سلیقے سے؟ آپ کے مرعوب کن اداریے سے؟ یا ان مشمولات سے جو آپ کی نگاہ انتخاب کی سند بنتی ہیں؟

اب مسئلہ یہاں یہ کھڑا ہے کہ اداریے کے پہلے جملے نے میرا دامن پکڑ لیا ہے کہ بات تو یہیں سے شروع ہوگی۔نظریات خرد کے مضمرات و ممکنات پر مشتمل ہوتے ہیں......اس اعلان نے مجھے حیران و پریشان کر دیا ہے.......... بابا اب ہمارے جنوں کا کیا ہوگا جو ہم بے عقلوں کے لیے سرچشمۂ نظر و نظریہ ہے......اور وہ نظریہ جس کا مخزن تخلیقیت اور جمالیات ہے؟ تو کیا نظریات کو ناقدین اور محققین کے اصطبل میں باندھ دیا جائے اور ہم اپنی نظر کے سہارے آگے بڑھ جائیں؟ اللہ بھلا کرے، آپ نے خود آگے چل کر میری مشکل کو آسان کر دیا.......... ''تخلیق کار کی جولان گاہ حیات و کائنات کے ممکنات و مضمرات تک پھیلی ہوئی ہے، لیکن تنقید کی جولان گاہ فن پارے کے ممکنات و مضمرات تک محدود ہوتی ہے۔'' شکریہ، اگر آپ اس گفتگو کو آئندہ شمارے میں اگے بڑھائیں تو ہم جیسوں کی رہنمائی ہوگی۔

بات گفتگو کی نکلی تو دل کی بات زبان تک پہنچنا چاہتی ہے کہ ثالث کا ہر شمارہ اگر کسی ایک ادبی گفتگو کے ذریعہ نئے سوالات اٹھانے اور موجودہ ادبی (تخلیقی رتنقیدی) صورت حال رمنظر نامے کے مضمرات و ممکنات کو آگے بڑھانے کا راستہ نکالے تو ایک طرح سے رسالے کی اشاعت ثمر آور ہو جائے۔ ہر شمارے میں شامل مضامین کے انتخاب کو اس گفتگو سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔

شمارہ۔۷ انتہائی پرکشش، دیدہ زیب اور دل پسند ہے۔اداریے میں نظریات و رجحانات اور تخلیقی و تنقیدی معاملات کے حوالے سے آپ نے بھرپور گفتگو کی ہے......اور یہ دیدہ وری و دانشوری کی مارکیٹنگ ...... بڑی خطرناک اور عبرتناک صورت حال کی طرف آپ نے اشارہ کر دیا ہے۔نظریات کے زوال کی بات بھی آپ نے بروقت اٹھائی ہے۔تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں لیکن مجھے شاہد الرحمٰن اور صابر حسن رئیس کے مضامین خصوصی طور پر پسند آئے۔صابر صاحب نے مخمور سعیدی مرحوم پر ایسے وقت میں گفتگو

کی ہے جب مدتوں سے مخمور صاحب پر کوئی تحریر نظر نہیں آئی ہے۔ تخلیقی اور تشکیلی جمالیات پر شاہد الرحمٰن نے بے حد جامع اور مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ ویسے اردو کو شدھ دیشی رومانس کر دینے کی خواہش تھوڑی وضاحت چاہتی ہے۔ بہت زمانے کے بعد حبیب جالب مرحوم پر محنت سے لکھا ہوا مضمون پڑھا۔ انقلابی آہنگ ان کا خاصہ ہے مگر یہ آہنگ جب بہت تیز رو ہو جاتا ہے تو شاعری کا دم پھولنے لگتا ہے۔ اس معاملے میں فیض اور مجروح اور جذبی اور تاباں بے حد کامیاب رہے ہیں۔

آخر میں تھوڑی باتیں شاعری اور افسانے پر بھی ہو جائیں۔

عرفان ستار غزل کے نمائندہ شعراء میں ہیں اور ان کے یہاں جو ندرت اظہار ہے وہ ان کا شعری اختصاص ہے۔

مجھ سے ممکن یہ نہیں ہے کہ میں کھل کہہ دوں    اس کے بس میں یہ نہیں ہے کہ اشارہ سمجھے

اس شعر میں شاعری کی رمزیہ جمالیات کی تاریخ پوشیدہ ہے اور ایک طرح سے یہ پوری غزل کا عنوان ہے۔ ارمان نجمی کا ایک شعر بھی اسی رمزیہ اسلوب کا اشاریہ ہے۔

سنا رہا ہوں میں ہوش و ہواس میں لیکن    یہ نیند اڑاتے ہوئے خواب کی حکایت ہے

دیگر شعراء کی غزلیں بھی پسند آئیں ......اور پھر اگلا قدم جزیرۂ خواب کی طرف تھا۔ بھائی یہ صدیق عالم کس عالم جذب میں نظمیں کہتے ہیں کہ ان کا قاری بھی ان کے جذب میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ اس عہد کا بڑا تخلیقی دماغ ہے۔ ان کے ساتھ آپ نے رضی شہاب کا نغمۂ اسلوب بھی شامل کر لیا ہے۔ بہت خوب۔ گویا آپ نے ہمیں جذب وسلوک کے درمیان چھوڑ رکھا ہے۔ بالآخر ہم کو خوبصورت افسانوں، ناول اور کلاسیکی فکشن و ''پیتل کا گھنٹہ'' کے ذریعہ ایک خصوصی کیف کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ تبصرے بھی خوب ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو۔

◀◀ ● ▶▶

| | |
|---|---|
| نام رسالہ : اسباق | نام رسالہ : زبان وادب |
| مدیر : نذیر فتح پوری | مدیر : مشتاق احمد نوری |
| قیمت : ۶۰روپے | قیمت : ۱۰روپے |
| صفحات : ۱۶۰ | صفحات : ۸۰ |
| مقام اشاعت: پونہ (مہارشٹر) | مقام اشاعت: پٹنہ (بہار) |



# مکتوبات

☆ I received the registered packet consisting of "Salis 5 & 6". Many thanks.I shall be in Toronto this coming weekend (March 12) to participate in a literary event honouring Rafiuddin Raz, that also includes a mushaira. Dr. Syed Taqi Abidi and I are the main speakers. As I mentioned over phone I have lost contact with Afzal Imam. I shall try to find out his new number and other details and let you know on my return. In the meantime, my warm regards.    Shaheen (Canada)

☆ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ ''ثالث'' کا اولین شمارہ مدتوں قبل موصول ہوا تھا۔ میں نے پسندیدگی اور رسید سے آپ کو مطلع بھی کیا تھا۔ اس کے بعد دو ایک شمارے برادرم حقانی القاسمی صاحب کے یہاں سرسری دیکھنے کو ملے۔ آپ کو اکثر پڑھتا بھی رہا۔ میں یوں تو گذشتہ چالیس برسوں سے شاعری کر رہا ہوں چھپ بھی مسلسل رہا ہوں لیکن آپ کو شاید حیرت ہو کہ میرا ذوق مطالعہ مجھے فکشن کے سحر میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ اسرار گاندھی صاحب کے افسانوی مجموعہ غبار پر بھی ایک مضمون مکمل کیا ہے جو شاید نیا ورق ممبئ میں شامل اشاعت ہوگا۔ صدف کے اولین شمارے میں مجھے آپ کی کہانی نے بری طرح متاثر کیا۔ آپ نے اس افسانے کے ذریعہ انسانیت Compasson اور اخلاق کا بلند درس دیا ہے۔ عبرت کا جھٹکا بھی ہر حساس قاری کو ضرور لگے گا۔ اخلاق کے محاذ پر یہ دنیا اپنی گراوٹ کے آخری پائدان پر پہنچ چکی ہے۔ ایسے میں آپ کے ایسے افسانے مثبت رول ادا کریں گے۔ افسانوں کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ وعظ و تبلیغ نہیں کرتے جو صرف کانوں تک پہنچتی ہے بلکہ راست دل کو متاثر کرتے ہیں دماغ کو منطقی سوچ عطا کرتے ہیں اور عمل کو تحریک بخشتے ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔    راشد جمال فاروقی (دہرادون)

☆ (۱) سہ ماہی ''ثالث'' کا شمارہ ۔۶ موصول ہوا تھا۔تنقیدی، تحقیقی مضامین حمد نعت غزلیات اور نظموں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مصطفیٰ کریم کا بھائی کی یاد میں درد کا اندازہ کیا اور آگے بڑھ کر غضنفر کے سیانے مجذوب کا مزہ لیتے ہوئے انکشاف ہوا کہ یہ تو اپنے صفدر امام قادری ہیں، جن کی شان میں غضنفر رطب اللسان تھے۔غضنفر نے فکشن کے انداز میں مجذوب کا خوب تعارف کرایا ہے مزہ آ گیا۔کہانیوں میں آدھا عشق ۔۲۲ صفحات کے مطالعہ کے بعد خاتون کا یہ بے باکانہ اور بے تکلف جملہ ''جسم کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں انہیں باتوں سے کب تک بہلایا جا سکتا ہے۔'' عورت کے جبلت کا غماز ہے وہیں یہ مرد کے منہ پر بھی طمانچہ ہے کہ وہ آئے دن الاؤ دہکاتے ہیں اور پھر اسے جوں کا توں چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔'' آلو قیمہ'' ایک نفسیاتی کہانی ہے۔''کیمیا'' لالچ سے دور رہ کر محنت کا سبق سکھاتی ہے۔ ''صرف چند کیلو میٹر دور'' کہانی ناخلف اولاد کا نقشہ کھینچتی ہے۔ بقیہ کہانیاں بھی مزے دار ہیں اور دعوت مطالعہ دیتی ہوئی آپ کے انتخاب کی داد چاہتی ہیں۔ ''اے دل آوارہ'' کا محترم صفدر امام صاحب نے جس خوبصورتی سے تجزیاتی محاکمہ کیا ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت کا نتیجہ ہے۔فاروقی صاحب کے تبصرے بھی خوب ہیں۔مضامین کی ابتدا اور اختتام فاروقی کے حوالے سے کر آپ نے ثالث کو ایک نیا حسن عطا کیا ہے۔امید ہے ''ثالث'' نمبر۔۷ جلد ہی ایک نئے کلیور میں بمعہ احقر کی ارسال کردہ غزلوں کے ساتھ منظر عام پر آ رہا ہوگا۔

(۲) خط لکھا اور پوسٹ کرنا بھول گیا۔اس درمیان شمارہ ۔۷ بھی موصول ہو گیا جس میں احقر کی غزل بھی آپ کی محبت اور عنایت کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔تازہ شمارہ کے مشمولات بھی خوب ہیں۔آپ کا اداریہ جاندار اور شاندار ہے جس کے مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔آپ کے اداریہ میں آپ کا یہ جملہ ''موجودہ دور میں بازار ادب کے سارے دبستان اور دکان بند ہیں۔'' بڑا لطیف اور معنی خیز ہے جس کا لطف اہل ادب نے یقیناً لیا ہوگا۔مضامین معلوماتی ہیں۔اعتراف میں صبیحہ صبا کی شاعری اور حامد سراج کی افسانہ نگاری کا تجزیہ رضا صاحب اور شہناز صاحبہ نے اچھی اور مدلل گفتگو کی ہے۔منیر احمد فردوس کا ''کرچی کرچی خواب'' نور احمد



مرحوم کو جاندار خراج تحسین ہے۔غزلیں اور نظمیں خوبصورت ہیں۔انتخاب آپ کی تنقیدی بصیرت کا غماز ہے۔افسانوں کا انتخاب بھی ظاہر ہے ایک منجھا ہوا افسانہ نگار کرے گا تو اچھا ہونا ہی ہے۔بہر کیف خط کی طوالت کے سبب اس قدر جامع مواد یکجا کرنے پھر اس کو شائع کر ہم تک پہنچانے کے لیے مبارک باد کے ساتھ ساتھ بارگاہ ایزدی میں ملتمس ہوں کہ ''ثالث'' کو نظر بد سے بچائے رکھے اور آپ حضرات کو حوصلہ عطا کرے تاکہ یہ چراغ اسی طرح روشن رہے۔( آمین )

ذکی طارق (غازی آباد)

☆ ''ثالث'' سے پہلی بار ملاقات ہوئی، دل خوش ہوا۔آپ نے بڑے سلیقہ سے رسالہ نکالا ہے۔کوشش کروں گا کہ پچھلے شمارے بھی حاصل کر کے پڑھ سکوں۔تمام رسالوں میں کچھ اچھی اور کچھ کمزور تخلیقات شامل رہتی ہیں۔کمزور تخلیقات شامل کرنا مدیر کی مجبوری بھی ہوتی ہے،لیکن ''ثالث'' میں یہ مجبوری کم ہی کم ہے۔

انتظار حسین مرحوم کے ساتھ کوئی بیس برس پہلے ایک گفتگو ریکارڈ کی گئی تھی، جو رسالہ ''شب خون'' میں شائع ہوئی تھی۔پچھلے دنوں جب میں نے اس گفتگو کو دوبارہ پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اسے دوبارہ شائع کرایا جائے کہ یہ گفتگو اب بھی خاصے کی چیز ثابت ہوگی، کم از کم نئی نسل کے لیے۔سو اسے آپ کو ''ثالث'' کے لیے بھیج رہا ہوں۔یقین ہے کہ آپ کو پسند آئے گی اور آپ اسے ''ثالث'' میں جگہ دیں گے۔

اسرار گاندھی (الہٰ آباد)

☆ ''ثالث'' شمارہ ۔۷ اپنی تمام تر ظاہری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ موصول ہوا۔سرورق اور بیک کور سے لے کر نثری وشعری تخلیقات اور متنوع موضوعات پر معیاری مضامین آپ کے حسن انتخاب کی دلیل ہیں۔

آپ کے اداریے میں دور حاضر میں نظریہ کے فقدان پر جو کچھ کہا گیا ہے، کیا اس سے کلیتاً اتفاق یا اختلاف کیا جا سکتا ہے، یہ غور طلب ہے۔اس پر تفصیل سے بحث ہونی چاہئے۔مثلاً آپ کا ارشاد کہ:

''اب اگر نظریات کو اصطلاحی اور تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں زوال ہی کی صورت نظر آئے گی......پھر بھی جو چیز موقوف یا زوال پذیر ہو چکی ہے، وہ ہے نظریہ......''شور تھم

چکا ہے، آواز گم ہو چکی ہے۔ یہ نظریات کے زوال کی کیفیت نہیں تو اور کیا ہے......اور یہ المیہ تخلیق اور تنقید دونوں کے ساتھ ہے۔''

میری ناچیز رائے میں کوئی بھی نظریہ حالات کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ اشد ضرورت ہی اس کی ایجاد کا سبب بنتی ہے۔ پھر اگر وہ نظریہ ٹھوس حقائق اور مضبوط دلائل کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے تو اس سے اتفاق یا اختلاف (کلی یا جزوی) دونوں ہی اس کے وجود اور اہمیت کے اعتراف میں معاون ہوتے ہیں۔ اب اگر ہم محض اختلاف یا نفی کو اس نظریے کی موت تسلیم کر لیں تو ہم حقیقت سے روگردانی کی مرتکب ہوں گے۔ کسی نئے نظریے کی آمد جس دھوم دھام سے ہوتی ہے اور جس طرح وہ نقادوں کے ساتھ ساتھ تخلیق کاروں کو بھی اپنے طلسم میں باندھ لیتی ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے قبل کے تمام نظریات مستقل طور سے کالعدم ہو جاتے ہیں۔ ماضی میں رونما ہونے والی تحریکات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم پائیں گے کہ ہر نئی تحریک اپنی ماقبل تحریک کی انتہاؤں (Extremes) کے خلاف مورچہ کھولتی ہے، لیکن نئی تحریک خود بھی چند ایسی انتہاؤں کی حامل ہوتی ہے جو آگے چل کر اسکے ,جزوی زوال، کا سبب بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر جدیدیت کو ہی لیجئے جو کہ ترقی پسندی کے اجتماعی شعور اور تخلیق کار کو قاری کی سطح پر آ کر اپنی بات رکھنے جیسی شرائط اور پابندیوں کے خلاف ردعمل کے طور پر سامنے آئی تھی۔ لیکن اس تحریک نے بھی فنکار کی مکمل آزادی اور قاری کی عدم شرکت جیسے انتہا پسندانہ رویے پر اس قدر اصرار کیا کہ وہاں تخلیق کار پھر پابند ہو گیا جس کے نتیجے میں عدم ترسیل کا سنگین مسئلہ پیدا ہوا۔ آج جسے ہم مابعد جدیدیت کہہ رہے ہیں میری ذاتی رائے میں وہ جدیدیت کی ہی چھنی ہوئی (Filtered) شکل ہے۔ اگر اس کو ''مابعد تجریدیت'' کہا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ علاوہ ازیں جدیدیت میں جس کو فنکار کی آزادی کا نام دیا گیا تھا اصل میں وہ آزادی تو تجریدیت کی شرط کے خاتمے پر حاصل ہوئی ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جدیدیت کا زوال نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح جدیدیت سے قبل کی تحریکات یا نظریات کو بھی پوری طرح سے کالعدم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ وقت، جو کہ سب سے بڑا منصف ہے، ہر



نظریہ اور ہر تحریک میں سے دودھ اور پانی کو الگ کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی تحریک یا نظریے کا مکمل طور پر زوال نہیں ہوتا ہے۔ اس کُل کے اچھے اور قابل قبول اجزاء تخلیقات میں ہمیشہ جاری و ساری رہتے ہیں۔

ہر دو تحریکوں کے درمیان جو ایک خاموشی کا وقفہ آتا ہے اسے ایک ایسے عبوری دور سے تعبیر کر سکتے ہیں جو بہت انہماک کے ساتھ ہم عصر تخلیقی رجحانات اور تنقیدی رویوں کی Monitering کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن اس عبوری دور میں بھی ابتدا سے لیکر اب تک کے تمام نظریات کے مثبت اور مقبول عام رجحانات تخلیقات کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو آج کی تخلیقات میں بھی گزشتہ ہر تحریک کے عناصر کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گے۔ جہاں تک کسی نئے نظریے کے سامنے نہ آنے کا معاملہ ہے تو ممکن ہے کہ فی الوقت اس کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ثالث کی روز افزوں ترقی کے لیے نیک خواہشات۔

صابر حسن رئیس (ٹونک)

☆ ''ثالث، شمارہ نمبر۔ ۷'' زیر نظر ہے۔ اب تک اس کے جتنے بھی شمارے منظر عام پر آئے ہیں وہ قابل تعریف و تحسین ہیں جس کے لیے اقبال حسن آزاد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کی محنت، لگن اور دیانت داری نے اس رسالے کو کامیابی کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ خدا کرے اس کی عمر دراز ہو اور یہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ (آمین)

یوں تو اس شمارے کے سارے مشمولات ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن چونکہ افسانوں سے میری دلچسپی کچھ زیادہ ہے اس لیے ان پر کچھ زیادہ ہی توجہ دیتی ہوں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مجھے ہر شمارے میں نئے نئے موضوعات پر تحریر کردہ بہترین افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ یہ افسانے عام لیک سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ بعض افسانے چونکاتے ہیں اور چند افسانے تو ایسے ہوتے ہیں جن کی تہہ تک پہنچنے کے لیے غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پانچویں شمارے میں ''برف کی عورت'' (شاہین کاظمی) اور ساتویں شمارے میں ''چھام چھاپ'' (سیمیں درانی)۔ اس شمارے میں ''انتخاب'' کے تحت مشہور افسانہ نگار قاضی عبدالستار کا شہرہ آفاق افسانہ ''پیتل کا گھنٹہ'' بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس افسانے نے مجھے بے حد متاثر کیا

۔ہندوستانی مسلمانوں کے بدلتے ہوئے حالات پر یہ ایک اثر انگیز افسانہ ہے ۔افسانے کے کردار کس طرح اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کس طرح اجداد کی کمائی ہوئی عزت غیروں کے ہاتھ بک رہی ہے۔اتنا اچھا افسانہ لکھنے کے لیے مصنف کو میری جانب سے دلی مبارکباد۔ (نوشابہ خاتون، پٹنہ)

☆ میں نے ''ثالث شمارہ نمبر۔۷'' کا تفصیلی مطالعہ کیا۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کس کس افسانے کی تعریف کروں اور کس مضمون کی مدح سرائی کروں۔ پورا ثالث ہی قابل تحسین ہے۔''پیتل کا گھنٹہ'' کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دل سے بے ساختہ واہ نکل گئی۔ مجھے تو ایسا لگا کہ پنہر والوں کی کہانی ہے۔اس میں حقیقت ہی حقیقت ہے۔اب ایسے لوگ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔اب وہ تہذیب ہے نہ خلوص۔ عشرت ناز (پٹنہ)

☆ 'ثالث'' کا تازہ شمارہ اور میرا اَفسانہ ''گڈی'' ......خوبصورت رنگین سرورق اور کومل کونپلیں امید کی اور تازگی کی علامت...... نہ وقت رکتا ہے نہ زندگی...... برہنہ شاخوں پر پھوٹتی کونپلیں بہار کی آمد کا اعلان کرتی ہیں۔''ثالث'' بھی اسی طرح اردو ادب میں ایک تازگی اور ندرت کا اعلان ہے۔ (شاہین کاظمی، سوئٹزرلینڈ)

☆ ثالث شمارہ ۵، ۶ اور ۷ میری نظر سے گزرے۔مزاج میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی لیکن چاہتے ہوئے بھی کسی شمارے پر اظہارِ خیال نہیں کر سکی وجہ حیران کن......شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہی ہوتا کہ اگلے شمارے کا اعلان ہو جاتا۔اس مرتبہ بھی یہی ہوا...... شمارہ۔۸ کا فیس بک پر اعلان دیکھا تو میں نے فوراً ہی قلم تھام لیا...... کسی رسالے کا مطالعہ کرنا اور اظہارِ رائے دینا دونوں مختلف باتیں ہیں ویسے بھی میں مثبت تنقید کی حامل ہوں اس لیے سب کچھ اچھا لگتا ہے۔موجودہ دور میں اردو کا رسالہ اور وہ بھی وقت پر نکالنا قابل ستائش کام ہے اور ادب کی بے مثال خدمت ہے۔اس سے بھی اہم اور دقت طلب بات رسالہ کا معیاری ہونا ہے۔ثالث شمارہ۔۷ اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے اور اپنی معیاری اور منفرد مشمولات کے سبب خاصا اہم ہے۔یقیناً مدیر اور مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لائے ہیں۔اداریہ میں تنقید اور تخلیق کی اہمیت افادیت، ممکنات مضمرات، صارفیت اور نظریہ کی زوال



پذیری جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ ان کی دانشورانہ صلاحیتوں کی دلیل ہے۔شمارے میں شامل مضامین، افسانے، نظمیں غزلیں تبصرے اور دیگر مشمولات نہ صرف ادبی بلکہ معیاری، معلوماتی، منفرد اور دلچسپ ہیں۔مضمون ''ادب لطیف کے افسانوں میں عورت'' ظاہر ہے دلچسپ اور اہم موضوع ہے لیکن موجودہ افسانوں کی عورت کے چند کرداروں سے اس کا موازنہ کرتے تو مضمون اور موضوع کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔''اعتراف'' کے تحت جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے وہ بہت پسند آیا۔اپنے بزرگوں کی خدمات کو یاد کرنا ذمہ داری بھی ہے اور نیکی بھی......صبیحہ صبا اور محمد حامد سراج کا انتخاب بھی اس سلسلے میں خوب رہا۔ رضاالحق صدیقی نے صبیحہ صبا کی شاعری کا مختصر لیکن بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔شہناز رحمان نے حامد سراج کے افسانوں پر بہت مدلل عالمانہ لیکن زمینی حقائق پر مبنی گفتگو کی ہے۔انہوں نے تحقیق تفہیم اور تنقید کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔افسانوی حصہ اہم اور خصوصیت کا حامل ہے۔نعیم بیگ، معظم شاہ، سلیم سرفراز، سیمیں درانی اور فرحین جمال کے افسانے اچھے لگے......لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ باقی افسانے اچھے نہیں۔مصاعد قدوائی کا ''پیتل کا گھنٹہ'' پر تجزیہ مختصر مگر جامع ہے۔شعری کاوشوں میں ڈاکٹر ارمان نجمی، سلیم محی الدین اور ذکی طارق زیادہ پسند آئے۔سرپٹ بھاگتی دوڑتی تیز رفتار زندگی اور وقت کی تنگی کے سبب افسانہ افسانچہ سے منی افسانہ اور اب مائیکرو فکشن میں داخل ہو رہا ہے تب ناول پڑھنا ایک مشکل ترین عمل ہو گیا ہے۔ایسی صورتحال میں ''راج سنگھ لاہوریا'' کا قسط وار شائع ہونا بہت بھلا لگا۔اقبال حسن خاں کا یہ ناول کردار زبان و بیاں اور موضوع کے سبب سے توجہ طلب ہے۔''ناسٹلجیا کا ایک باب'' نئی اور پرانی دونوں نسلوں کے لیے وقت کی اہم ضرورت ہے یہی زندگی کی اکائی ہے۔کتابوں پر تبصرے بھی اپنی نوعیت کے اہم ہیں۔اتنے خوبصورت علمی و ادبی رسالے کے لیے اقبال حسن آزاد کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔اللہ ان کو صحت مند سلامت اور تادیر تک قائم رکھے تاکہ وہ علم و ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں۔ (آمین) نگار عظیم (نئی دہلی)

☆ ''ثالث'' کا شمارہ نمبر۔۷ نظر نواز ہوا۔اس کا گیٹ اپ اور سرورق حسب معمول نہایت دیدہ ذیب اور جاذب نظر ہے۔افسانوں کے انتخاب کے لیے مدیر اعزازی جناب

اقبال حسن آزاد کو دلی مبارک پیش کرتا ہوں ۔ ہر افسانہ الگ نوعیت کا ہے جن میں تاریخی، سماجی اور اخلاقی قدروں کی پامالی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''ادار یہ'' کیا ہے۔ تنقید پر ایک اچھا خاصہ کار آمد مضمون ہے۔ اس میں اردو زبان کی ابتداء یعنی پیدائش کے متعلق محققین کے نظریات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے- مجھے یاد ہے کہ آج سے تقریباً ۶۵ سال قبل جب میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا تو ہمارے نصاب میں اردو پر ایک مضمون تھا جس میں ولی دکنی، نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اردو کی پیدائش دکن میں ہوئی ہے۔ اس زبان کی ابتداء اور ارتقا کے متعلق عظمی سیٹھ نے اس متنازع مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ہے جو قابل تعریف ہے۔

''یادرفتگاں'' کے تحت ''کرچی کرچی زندگی'' بہت پسند آیا۔ ایک ایسے باکمال غیور اور خوددار نوجوان ادیب کی نہایت سبق آموز اور بصیرت افروز کہانی ہے جس نے تمام آلام و مصائب اور بےبسی کے باوجود اخیر دم تک غیرت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس کا نام تھا نور احمد ناز۔ نعیم بیگ کا افسانہ ''بلیکی'' اچھا خاصا اور دلچسپ ہے۔ ''ہم صورت گر کچھ خوابوں کے'' فلم ساز ( ہدایت کار ) پرویز السلام فاضل اور قلم کار ادیب الحسن دونوں مل کر ایک بے مثال فلم تیار کرتے ہیں اور نیشنل ایوارڈ حاصل کرتے ہیں لیکن ایوارڈ کی تقریب میں وہ فلم ساز شامل نہیں ہے کیونکہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ افسانہ کا اختتام خوشی اور غم کے ملے جلے تاثر کی عکاسی کرتا ہے۔ ''گشتی'' یعنی گشت کرنے والی ایک ایسی جسم فروش عورت کی کہانی ہے جسے اپنے بیٹے کے مرنے کا کوئی ملال نہ تھا۔ یہ جان کر اس پولس آفیسر کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔ اس کی اپنی ماں کا ناجائز تعلق کزن سے تھا اور یہ راز کھلنے پر وہ اپنے بیٹے کو جان سے مروانے کے درپے ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔ ''بد دعا کرنے والے'' ایک نئے طرز کا افسانہ ہے۔ ظلم اور ظالم کے خلاف اجتماعی طور پر ان کے حق میں بددعا کرنے سے مظلوموں کو قلبی اطمینان اور سکون ملتا ہے۔ یہ ایک نیا فلسفہ ہے۔ ''چھام چھاپ'' ( سلام صاحب ) paedophelia یعنی جنسی خواہشات کے ساتھ بچوں کی طرف کشش پر مبنی ہے۔ یہ انفرادی نوعیت کا افسانہ ہے- مغربی ممالک (یورپ) میں یہ وبا بہت عام ہے- شان سکریٹ سوسائٹی آف پیڈوفائل کا ایک رکن تھا۔ اور اس کا یہ کام تھا بچے بچیوں کی عریاں جسم کے ساتھ بہیمانہ طریقہ سے پیش آنا اور ان کی ویڈیوگرافی کر کے لندن میں سکریٹ سوسائٹی کو سپلائی کرنا۔ سماج کا یہ فرض بنتا ہے کہ اس طرح کے ظالموں سے مفلس بھیک مانگنے والوں کی حفاظت کرے۔ افسانہ نگار نے جس خوش اسلوبی سے اس افسانہ کو لکھا ہے وہ قابل داد ہے۔ اقبال حسن خاں صاحب کے ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا دوسرا باب بہت دلچسپ ہے۔ یہ برٹش حکومت کے زمانے کی کہانی ہے جس کی سلطنت میں آفتاب کبھی غروب نہیں تھا۔...... جنگ عظیم پر تبصرہ......آزادی کے بعد مقامی حکمرانوں کی روش......ایک انگریز لیڈی سے گفتگو وغیرہ......اچھا لگا۔ طرز نگارش بہت عمدہ ہے اور ہر قسط کے ساتھ قاری کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔- اب آنے والے شمارہ کا انتظار ہے۔

ڈاکٹر سید سرفراز الہدیٰ قیصر، علیگ (پٹنہ)



قطرہ قطرہ احساس اور مردم گزیدہ کے بعد

**اقبال حسن آزاد**

کی

تنقیدی کتاب

نثری اصناف ادب اور طنز و مزاح کی روایت

شائع ہوچکی ہے

صفحات 152 قیمت -/300

ملنے کا پتہ

**ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ، مونگیر**